سفرنامۂ پاکستان

کیمی میرپوا



سفرنامۂ پاکستان

کیمی میرپوا

ترجمہ: محمد حسن

BOOK HOME

سفرنامۂ پاکستان

کیمی میر پوا

ترجمہ: محمد حسن

URDU TRVELOGUE

اہتمام رانا عبدالاحد
پروڈکشن ایم سرور
سرورق ریاظ
کمپوزنگ محمد انور
پرنٹرز حاجی حنیف پرسرر، لاہور
اشاعت 2005ء
ناشر بک ہوم لاہور

بک ہوم
بک سٹریٹ 46-مزنگ روڈ لاہور۔ فون: 7231518
E-mail: bookhome1@hotmail.com

فہرست

تمہید

میں بحیرۂ عرب کے کنارے کراچی میں کلفٹن کے ساحل پر اونٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے چاروں طرف سیاہ ریت اور چمکتا ہوا سورج تھا۔ پھیری والے عجب زبان میں چلا رہے تھے اور اپنا سامان، چپچپاتی مٹھائی، اور نمکین بسکٹ کھا رہے تھے۔ اپنے مالک کے اشارے پر اونٹ مجھے لے کر اُتھلے پانی میں اُتر گیا۔ یہ جولائی 1958ء میں کراچی کی گرمیوں کی شام تھی۔ ایک ایسے شخص کے لیے جو ایشیائی آمد و رفت کے ذرائع کا عادی نہ ہو یہ سواری خوفزدہ کرنے کے علاوہ مضحکہ خیز بھی ہے۔ میں یہ سوچ کر ہنس رہی تھی کہ میرے لیے ہزاروں میل دور اپنے گھر نیویارک سے علی بابا کی سرزمین میں آنا کتنا عجیب ہے۔

ایک ہفتہ بعد میں لاہور میں تھی۔ مغل فن تعمیر اور تاریخ کا خوبصورت شہر۔ لیکن یہ میرے لیے نہیں، میں یہاں کی رہنے والی نہیں۔ ایک ہفتے بعد میں امریکہ لوٹنے والی تھی۔ یہ میرے سفر کی آخری رات تھی۔ جمخانہ میں دوستوں سے ملنے کا وعدہ، ٹیکسیوں کی ہڑتال، بیکار پڑا ہوا ٹیلیفون، بے چین خیالات، یوں محسوس ہوتا تھا گویا میں کسی چیز کی کمی محسوس کر رہی ہوں۔ اسے وجدان کہہ لیجیے۔ میرے اندر عجیب بے چینی تھی۔ مجھے جمخانہ پہنچنا چاہیے۔ میرے ہوٹل کے دو مہمانوں نے میری مدد کی اور مجھے آدھی رات کو وہاں پہنچا دیا، لیکن میرے تمام دوست کب کے جا چکے تھے۔ میں تنہا اندھیرے میں بیٹھ گئی۔ محسوس ہوتا تھا کہ میں گھر واپس آ گئی ہوں۔ ایک کھلی ہوئی کھڑکی سے مدھم موسیقی کی آواز آئی۔ ایک عورت نے جسے میں جانتی تھی، میرا نام ہلکے سے پکارا۔ ''یہاں آیئے''۔ اس نے کہا، ''تھوڑی دیر ٹھہریئے اور میری سہیلیوں سے ملیے''۔ آرام دہ کرسی کو بادل

نخواستہ چھوڑ کر ہچکچاتے ہوئے میں وہاں پہنچ گئی۔

تقریباً اٹھارہ ماہ قبل اپنے آرٹسٹ ساتھی پیٹر کی موت کے بعد سے میں کسی جگہ کی بھی نہ تھی مرنے سے پہلے اس نے جو کہا تھا مجھے اب بھی یاد ہے۔ کیمیل، میں سفر کرنا چاہتا ہوں، میں تاج محل دیکھنا چاہتا ہوں اور شالا مار میں ٹہلنا چاہتا ہوں اور میرا یہ چھوٹا سا تھیلا جس میں میرے ہسپتال کے معائنے کی چیزیں ہیں رنگوں اور برشوں سے بھرا ہوا ہوگا۔''

میں نے اس تھیلے کے بارے میں پھر کبھی نہیں سوچا۔ نیویارک میں اپنی آخری رات میں نے یہ کسی اجنبی کو دے دیا۔ یہ پیٹر کے خون سے بھرے ہوئے ان کپڑوں کی تلخ یاد دلاتا تھا۔ جس روز اسے ہسپتال چھوڑنا تھا۔ ٹھوکر کھا کر گرنے سے اس کا سر پھٹ گیا تھا۔

رنگ اور برش تھے نہ سفر، صرف میری آوارہ گردی اور ہم آہنگی کی کوششیں باقی تھیں کسی کی سالگرہ کی تقریب تھی۔ تعارف کے بعد اچانک کسی نے مسکرا کر مجھ سے پوچھا، ''ہیلو مادام، آپ اتنی دور کیسے آ گئیں؟''

خوف سے ملتا جلتا جذبہ میرے اندر دوڑ گیا۔ یہ اجنبی کون تھا جو اس بے تکلفی سے مجھے مخاطب کر رہا تھا۔ اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں اتنی دور سے آئی ہوں۔ اس کا چہرہ پر شفقت اور آواز دوستانہ تھی لیکن پھر بھی میری بے چینی بڑھتی گئی۔ مدھم یادیں ابھر آتیں، مجھے یاد نہ آ سکا کہ اس سے پہلے میں نے اسے دیکھا ہے۔ گویا میرے خیالات کو پڑھتے ہوئے اس نے دوبارہ بات کی۔ ''اچھا تو آپ کو یاد نہیں جب میں آپ کے افریقہ جانے سے پہلے، آپ کے پڑوسیوں کے ساتھ نیویارک میں آپ کے گھر آیا تھا؟، آپ کو آخری وقت چیزیں بیچنا یاد نہیں؟ جب میں اقوام متحدہ میں پاکستان کا نمائندہ تھا میں نے اپنے مکان کے لیے آپ سے کچھ چیزیں خریدی تھیں۔ واپس آنے سے پہلے میں نے ساری چیزیں بانٹ دیں لیکن چھوٹا تھیلا اپنے پاس رکھ لیا۔ سامان میں یہ نہایت ضروری چیز ہے۔ سفر کے دوران میں ہمیشہ اسے ساتھ رکھتا ہوں۔''

میں دنگ رہ گئی اور بمشکل بول سکی۔ ''آپ'' میں بڑبڑائی ''آپ ہی وہ آدمی ہیں، وہ تھیلا ابھی تک آپ کے پاس ہے؟'' درد سے چپ چاپ میں کرسی میں اور بھی دھنس گئی اور وہ آدمی اپنے سفر کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ اس نے تاج محل دیکھا تھا اور شالا مار میں ٹہلا تھا۔ پھر اچانک میری تکلیف کو بھانپتے ہوئے وہ خاموش ہو گیا اور میرے آنسوؤں میں بھیگے ہوئے چہرے کو دیکھنے

لگا۔ ''کیا وہ تھیلا آپ کو بے حد عزیز ہے؟'' اس نے کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میں اسے واپس کر دوں گا......'' میں جواب نہ دے سکی کیونکہ میرا درد خوشی میں بدل گیا تھا...... پیٹر کے تھیلے نے ان تمام جگہوں کا سفر کیا تھا جہاں وہ جانا چاہتا تھا۔ ''نہیں، نہیں'' میں نے آگے جھک کر اجنبی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ آپ کو وہ ہمیشہ اپنے پاس رکھنا چاہیے۔ آپ سے ملاقات ایک ایسے شخص کو بہت نزدیک لے آئی ہے جو بہت دور چلا گیا ہے۔ آپ نے مجھے خوش کر دیا ہے......''

بہت عرصہ بعد جب اس بات کا اثر زائل ہو گیا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ تو ضرور ہونا تھا ورنہ جولائی کے مہینہ میں میرے دل میں لاہور آنے کی خواہش کیوں پیدا ہوتی جب کہ اس زمانہ میں یہاں کی گرمی نقطۂ عروج پر ہوتی ہے اور سڑکوں پر چلتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے گویا شعلوں میں چل رہے ہیں؟ میں جس سے بھی ملی اس نے کہا ''اس زمانہ میں لاہور نہ جایئے۔ وہاں بے حد گرمی ہوتی ہے۔ یہ وہاں جانے کا موسم نہیں۔'' لیکن میں ضد میں وہاں گئی۔ اپنے سفر کے دوران میں بے شمار شہروں میں گئی۔ لزبن، روم، ممباسہ، کلیما نجارو، نیروبی اور پھر کراچی کے راستے گوا ایک پلان کی طرح میرا بے ترتیب پروگرام نقطۂ عروج کی طرف سیدھا راستہ بن گیا۔ یہ میرے لیے ابتدا اور نیا آغاز تھا۔ میرے درد کی شدت کم ہو گئی۔ میرا غم دور ہو گیا۔ یہ تو ضرور ہونا تھا۔ یہاں میں گویا پلان کے مطابق آئی۔ زندگی کے بے کراں نقشہ پر ایک معمولی انسان کسی انجانی قوت کے ذریعے کھنچا چلا آیا جو ایک معجزہ معلوم ہوتا تھا...... آخر کیوں؟ ایک اجنبی وہ تھیلا لے کر، جو پیٹر استعمال کرتا تھا، اپنے ملک کس طرح چلا آیا؟۔ اس رات میں نے ایک عام سی تقریب میں پہنچنے کے لیے اتنی سر توڑ کوشش کیوں کی؟ اس اجنبی نے مجھے اتفاق سے کیسے پا لیا اور ماضی کی ایک یادگار سامنے لا کر مجھے قوت بخش دی جب کہ میری ہمت جواب دے چکی تھی؟

نئے عزم اور ولولہ کے ساتھ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ پیٹر کہیں آس پاس مجھے باہمت بننے اور کام کرنے کی تلقین کر رہا تھا، میں نے نئے جوش سے کام شروع کر دیا۔ میں نے جو کچھ لکھا فروخت ہو گیا اور دور بیٹھے ہوئے ایڈیٹر میرے اوپر مسکراتے ہوئے اور چیزیں طلب کرتے رہے۔ اب میرے سفر کا ایک مطلب تھا۔ ''مجھے یہاں آنا ہی تھا۔'' میں نے ان مقامات کے بارے میں لکھنا شروع کر دیا جو میں نے دیکھے تھے۔ 1959ء کے شروع میں میں ''ڈان'' کے الطاف حسین سے ملی جنھوں نے مشورہ دیا کہ میں اتوار کے میگزین کے لیے پاکستان کی زندگی پر

اپنے سفر کا کالم لکھنا شروع کر دوں۔ انہوں نے تمام انتظام مجھ پر چھوڑ دیا۔ میرے ذہن میں کا کسس بازار کا وسیع سمندر اور اس کا ستر میل لمبا ساحل آیا۔ مجھے قبائلی لوگوں کا حسن اور درۂ خیبر کے اندرونی گاؤں میں گزارے ہوئے دن یاد آئے اور میں ہمالیہ کے اوپر سلسلہ قراقرم میں گلگت کا دم بخود کرنے والا ہوائی سفر جو دور دراز پنیال میں پہاڑی گاؤں شرکیلا کو جاتا تھا، گوپی کے آب حیات اور اپنے میزبان راجاؤں کو کس طرح بھول سکتی تھی۔ میں تاریخ اور وقت کے اوراق پر چلی تھی اور مغل عمارتوں کی خوبصورتی میں رہی تھی۔ میں سوچتی کتنے پاکستانیوں نے وہ کچھ دیکھا ہوگا جو میں نے دیکھا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ میرے سفر میں شرکت کریں اور میں نے اپنے کالم کا نام ''پہلے پاکستان دیکھئے'' رکھا۔

یہ بے حد مقبول ہوا اور دور سے لوگوں نے ان مقامات کو دیکھ کر جن کے بارے میں میں نے لکھا تھا مجھے خوشی بھرے خط لکھے اور اس طرح ''پہلے پاکستان دیکھئے'' کا پہلا ایڈیشن وجود میں آیا اور فوراً بعد ہی دوسرا چھاپنا پڑا۔ بہت تھوڑے عرصہ میں دونوں ایڈیشن ختم ہو گئے اور لوگوں کی مانگ باقی تھی۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ 1960ء کے دونوں ایڈیشنوں کے بعد پاکستان میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں۔ پانچ سال اسلامی جمہوریہ پاکستان میں رہنے کے بعد میں نے اس کے نئے دور کے بارے میں لکھنا شروع کیا جس میں سیاحوں اور تاجروں کے لیے مزید کارآمد باتیں اور مزاح کا عنصر بھی شامل ہے۔

سیّاح پاکستان میں

29 اگست 1964ء کو خوشی کے نعروں اور رنگ برنگ تقریبات کے ساتھ پاکستان کی پہلی آبدوز کشتی کراچی کی بندرگاہ میں داخل ہوئی، یہ خوشی کس بات کا اظہار تھی؟ پاکستان ترقی کی شاہراہ پر آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ پاکستان کی شاندار بحریہ میں قابلِ قدر اضافہ ہے...... ہر لحظہ ترقی ہو رہی ہے اور سمندری راستہ سب کے لیے کھلا ہے۔

یہ اوراق الٹتے ہوئے آپ سیاحی پر پہلی کتاب پڑھ رہے ہیں جو اس ملک میں پہلی مرتبہ اس کی رومانی زبان ــــ شاعروں اور عظیم لوگوں کی زبان ــــ اردو میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب ایک غیر ملکی خاتون کی تصنیف ہے جو خود بھی ایک سیّاح تھی ــــ جو گو اسے صرف دو چار روز کے لیے آئی تھی لیکن اس ملک کے پُرخلوص لوگوں کی سادگی، خوش گوار دھوپ، خوش باش رکشے والوں، لاابالی اخبار فروشوں اور دوست نواز پاکستانیوں سے مسحور ہو کر اس نے یہاں سات سال گزار دیئے کراچی ــــ دنیا کے کونے کونے سے سڑک، سمندر اور ہوائی جہاز سے لوگ چلے آتے ہیں۔ سیونی، ترک، لبنان، مشرق وسطیٰ کے دوسرے لوگوں کے ہمراہ تیل سے کمائی ہوئی دولت کو خرچ کرنے کے لیے کویتی، امریکی، انگریز اور یورپی جو مشرقِ قریب کا سحر محسوس کرنے اور یہاں کی مصنوعات استعمال کرنے کے مشتاق ہیں۔ ہوائی جہاز سے سفر کرنے والے بڑی امیدوں کے ساتھ کراچی کے بین الاقوامی ہوائی مستقر پر اترتے ہیں اور خواہ وہ اکیلے ہوں یا کسی گروپ کے ساتھ، جیٹ طیارہ ہر ایک کے لیے طلسماتی قالین کی حیثیت رکھتا ہے...... ایشیا الف لیلیٰ کی سرزمین ــــ جہاں خواب سچ ثابت ہوتے ہیں۔

بعض اوقات سیاحی ایجنٹ سفید تیز بو والے پھول لیے ان کا استقبال کرتا ہے اور وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ مہم شروع ہو رہی ہے۔ ان کے دل میں کیا ہے؟ عورتیں گھوڑوں پر سوار صحراؤں کے شیخوں کے بارے میں سوچتی ہیں جن کی کاٹھیاں سرخ مخمل اور نقرئی کشیدہ کاری کا نمونہ ہیں۔ وہ دلکش ساڑھیوں، مہین ریشم اور شاید ایک لمبے، سیاہ اور خوبصورت مرد سے رومان کے بارے میں سوچتی ہیں جو مغل بادشاہوں کی پشت میں سے ہو جسے ان کی خوبصورتی متاثر کر سکے۔ وہ عظیم سفر شروع کر رہی ہیں۔ کون جانتا ہے کیا درپیش آئے۔؟

مرد کیا سوچتے ہیں؟ وہ، برقعوں میں چھپی ہوئی عورتیں، حیران کن چیزیں، پولو کے مقابلے، مہاراجوں کے کھیل، یہ نہ جانتے ہوئے کہ یہاں اس قسم کے خطابات نہیں۔ صرف حکمران ہیں جو پہاڑی ریاستوں پر حکومت کرتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ کیا انہیں کوئی ایسی خوبصورت لڑکی ملے گی جو ان کی بات سمجھ سکے۔ کسی بڑے ہوٹل میں پہنچنے کے بعد، جو بیچ لگژری، میٹروپول، پیلس، سینٹرل یا نسبتاً کم مہنگا برسٹل، ڈی لکس یا تاج ہو سکتا ہے، ان کا پہلا کھانا چاول اور سالن اور مشرق کے تمام دوسرے مصالحہ دار کھانوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ انہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بعد کے اثرات سے بچنے کے لیے ان کھانوں کو رفتہ رفتہ کھانا چاہیے۔ ان میں یک لخت دوستی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ بیروں سے گپ لڑاتے ہیں اور انہیں بتاتے ہیں وہ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ بیرے چست و چالاک ہیں۔ وہ ان کی طرف توجہ دیتے ہیں اور اس طرح کافی بخشش کما لیتے ہیں۔ ایک عام سیّاح ایشیاء میں ملازموں کی تعداد دیکھ کر بہت متاثر ہوتا ہے اور یہ ہمدردی اس بیرے پر مرکوز ہو جاتی ہے جو گو صرف چند گھنٹوں کے لیے اس کی ضروریات پورا کرنے کے لیے مقرر ہے لیکن عموماً اس وقت سوتا ہے جب اس کے ذمے کا آخری مہمان بھی آ جائے۔ بعض اوقات بالکل اس کے برعکس ہوتا ہے اور مہمان خوف محسوس کرتا ہے جب وہ اپنے اچھے بیرے کو آدھی رات کے وقت اپنے دروازے کے آگے فرش پر ہلکا سا کمبل بچھائے سویا دیکھتا ہے۔ بہت سوں نے زمین کی سختی کو کم کرنے کے لیے انہیں تکیے دیئے ہیں، بغیر یہ جانتے ہوئے کہ بیرا دل میں سیّاح کو کوستے ہوئے دھیمی مسکراہٹ سے تکیہ قبول کرے گا۔ اور کیا اسے نہیں معلوم کہ تمام عمر وہ پکے فرش پر سوتے آئے ہیں اور اسے پسند کرتے ہیں۔

کراچی میں پہلی صبح کو وہ اپنے متعلقہ ملک کے سفارت خانے میں اپنی ڈاک لینے اور

مہمانوں کے رجسٹر پر دستخط کرنے جاتے ہیں۔ گھر سے آیا ہوا خط۔ وہ خود کو کتنا اہم محسوس کرتے ہیں کیونکہ یہ خط ان کے کراچی کے پتے پر آیا ہے۔ امریکی سیّاح اپنے سفارت خانہ کی خوبصورتی سے مسحور ہو جاتے ہیں اور فخر محسوس کرتے ہیں۔ وہ بلند آواز سے چلّانا چاہتے ہیں۔ ”یہ میرے ملک کی نمائندگی کرتی ہے۔ میں اس کو برقرار رکھنے کے لیے ٹیکس ادا کرتا ہوں۔“ وہ عملی طور پر اندر جا کر سفیر سے کہنا چاہتے ہیں — ”ہیلو، میں کیلیفورنیا سے آیا ہوں، دوست تم کیسے ہو۔“ لیکن اس کے بجائے وہ امریکی استقبال کرنے والے سے بات کرنے بیٹھ جاتے ہیں کیونکہ جب تک کہ وہ کوئی اہم ترین شخصیت (VIP) نہ ہوں وہ مدارالمہام وزیر — چچا سام کے ارکان سفارت کے پاس نہیں جا سکتے کیونکہ ان کے ذمہ اس سے کہیں زیادہ اہم کام ہیں۔ بہرحال، عام طور پر وہ ڈاک کے عملہ سے دوستی کر لیتے ہیں جو آنے والے بیشمار سیاحوں کو مستعدی اور خوشدلی سے جواب دیتے ہیں۔ پاکستانی ان میں دلچسپی لیتے ہیں اور آنے والے امریکی اس دلچسپی سے لطف اٹھاتے ہیں۔ وہ متعجب ہوتے ہیں اور ایسی گرمجوشی کا مظاہرہ کرتے ہیں جو وہ اپنے ملک میں اجنبیوں کے ساتھ نہیں کرتے۔

یورپی اور برطانوی لوگ نسبتاً بہتر رہتے ہیں۔ ان کے سفارتی عملہ کو دوستی کرنے کا زیادہ وقت ہوتا ہے اور عرب سیاح تو اپنے سفارت خانے پہنچتے ہی چائے پینے لگتے ہیں۔ اس کے بعد مقامات کی سیر آتی ہے۔ فریئر ہال سے شروع ہو جایئے اور اشتیاق ایک دم بڑھ جاتا ہے۔ اس عظیم الشان عجائب گھر میں بدھ زمانہ اپنی تمام تر عظمت کے ساتھ ان کی آنکھوں کے سامنے پھیلا ہوا ہے۔ وہ یہاں نوٹس لیتے ہیں اور تصویریں کھینچتے ہیں اور فریئر ہال گارڈن میں سیر کو نکل جاتے ہیں۔ پاکستانیوں کو شلوار اور قمیض میں دیکھ کر انہیں تعجب ہوتا ہے اور عورتوں اور بچوں کے بھڑکیلے کپڑے دیکھ کر وہ مچل جاتے ہیں۔ وہ ان سے باتیں کرتے ہیں جن کا جواب کبھی انگریزی میں ہوتا ہے اور کبھی ملتا ہی نہیں۔ بہرحال باہمی سمجھ ضرور ہوتی ہے اور ایک غریب، کام سے فراغت پا کر آئے ہوئے چپڑاسی اور امیر کبیر امریکی سیّاح کے درمیان خیر سگالی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پاکستانیوں کی نگاہ میں ہر سیّاح امیر ہے اس کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے؟ وہ ان ممالک سے آئے ہیں جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں۔ سیّاح بچوں کو چوسنے والی مٹھائی اور اگر ان کا باپ آس پاس موجود ہو تو اسے سگرٹ دیتا ہے۔ اس سے بہتر دوستی اور کیا ہو سکتی ہے؟

تعریف پھوٹ پڑتی ہے اور یقین کیجیے کہ پاکستانی زندگی کے ہر شعبہ میں اس دوستانہ قدم کے بعد اکثر بیحد غریب گھر پر آنے، چائے پینے اور خاندان کے افراد سے ملنے کی دعوت ملتی ہے۔

سیاح کو سب سے زیادہ کیا چیز حیران کرتی ہے؟ یقیناً برقعہ میں چھپی ہوئی عورت اس میں بالکل چھپ کر وہ اسے کیسے برداشت کرتی ہیں؟ انہیں گرمی نہیں لگتی؟ انہیں بتایا جاتا ہے کہ بہت سی عورتیں چھوٹی لڑکیوں کی طرح بے پردہ پھر سکتی ہیں لیکن رسم ورواج اتنے کڑے ہیں کہ وہ اپنے شوہروں کو خوش کرنے کی خاطر بھی ایسا نہیں کرسکتیں۔ وہ سوچتی ہیں کہ ان کے والدین کیا کہیں گے اور اس تکلف کو چھوڑتیں نہیں۔

بازاروں اور دکانوں میں گھومتے ہوئے لوگوں کی بھیڑ امریکنوں اور یورپینوں کا پیچھا کرتی ہے انہیں اس پر تعجب ہوتا ہے۔ وہ سنجیدگی سے چل رہے ہیں اور اپنے کام میں مصروف ہیں لیکن پھر بھی لوگ ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ آخر کیوں؟ یہ بات انہیں بتانی پڑتی ہے ان کے کپڑے مختلف ہیں اور ان کا مغربی انداز نمایاں ہے۔ ان کی آنکھوں میں استعجاب کی جھلک ہے گویا وہ ہر لحہ کوئی حیران کن چیز دیکھنے کے منتظر ہیں اور پھر ہر ایک کے کندھے پر کیمرہ جھول رہا ہے وہ ہر جگہ جانے کے لیے ٹیکسی لیتے ہیں (جو اس ملک میں بے حد سستی ہیں) اور ان کا غیر ملکی پن واضح ہو جاتا ہے۔

'مس گے پیرس' اور 'مس امریکہ'' کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور جوانی اور خوبصورتی کو دیکھ کر، خواہ وہ کسی قومیت کی ہو، پاکستانی مردوں میں سیٹیاں بجنی شروع ہو جاتی ہیں۔ سکنڈی نیویا کی سرخ عورتیں خاص توجہ کا مرکز بنتی ہیں اور لوگ انہیں پسند کرتے ہیں۔ ہجوم بڑھتا جاتا ہے اور وہ خوش ہوتی ہیں۔ وہ کلفٹن کے ساحل پر اونٹ کی سواری کرتی ہیں اور بوہری بازار سے سنہری چپلیں خریدتی ہیں۔ وہ بے شمار ساڑھیاں، تانبے کے برتن اور تحائف خریدتی ہیں اور ٹیکسی ڈرائیور عموماً ان کے ہوٹل سے باہر آنے اور داخل ہونے کی تاک میں رہتے ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور کا ہمیشہ کوئی بھائی یا رشتہ دار ہوتا ہے جو دوسروں کی نسبت اچھی دستکاری کی چیزیں بیچتا ہے وہ انو ریٹی روڈ پر ہو سکتا ہے یادورویسٹ وہارف پر۔ سارے دوکاندار اس کے رشتہ دار ہوتے ہیں۔ آخر، سیاح کو سانپ کی ٹانگوں والی ہاتھی دانت سے منقش چھوٹی سی میز تو ضرور لینی چاہیے۔ ٹیکسی ڈرائیور کو معلوم ہوتا ہے کہ بہترین چیز کہاں سے مل سکتی ہے۔ اس طرح اسے جو کچھ مل جائے یہ اس کی بزنس ہے عموماً اس کی کوشش ہوتی ہے کہ سیاح کو اچھی چیز ملے۔ یہ کام بہت کامیاب رہتا ہے اور ہر شخص

خوش ہو جاتا ہے۔ سیاح فخر محسوس کرتا ہے کہ اس کے ساتھی کو ہر چیز معلوم ہے۔

دلچسپی کی ایک خاص چیز سپیرے ہیں۔ کار میں بیٹھا ہوا سیاح اچانک چیخ اٹھے گا کیونکہ میٹروپول کی وکٹوریہ روڈ کی طرف فٹ پاتھ پر پلوتھی مارے داڑھیوں والے سندھی بین بجاتے رہتے ہیں۔ ان کے پاؤں کے نزدیک پڑی ٹوکری سے ایک سانپ نکلے گا اور آہستہ آہستہ اونچا ہوتا جائے گا۔ ٹیکسی رُک جائے گی۔ مس ٹورسٹ، دروازے کو مضبوطی سے تھام لے گی اور کہے گی ''کیا سانپ کود کر نکل آئے گا؟ یہ کاٹ لے گا؟ یہ خطرناک ہے؟ وہ اس کی تصویریں لے گی تا کہ گھر جا کر لوگوں کو دکھا سکے۔ خواہ وہ خوف سے کانپ رہی ہو لیکن کیمرہ بین کی دھن پر ناچتے ہوئے سانپ کی تصویریں لیتا رہے گا۔ جب اسے بتایا جاتا ہے کہ سانپ اپنے مالک کے قابو میں ہے تو اس کی جان میں جان آتی ہے۔ موسیقی کے بند ہونے پر وہ بیٹھ جاتا ہے اور سو جاتا ہے۔

سفر اب شروع ہو گیا ہے۔ سیاح ٹھٹھہ اور عظیم الشان مغل مقبرے اور منگھو پیر پر مگرمچھ دیکھتے ہیں اور علاقائی رقص دیکھتے ہیں اور ہوٹل کے برآمدے میں کسی سے اتفاقیہ ملاقات کے بعد اس کے گھر جا کر چائے پیتے اور سموسے کھاتے ہیں۔ وہ اپنے میزبانوں کو، اگر انہیں لندن، نیویارک پیرس، ڈنمارک یا ٹمبکٹو جانے کا اتفاق ہو، اپنے ہاں آنے کی دعوت دیتے ہیں اور بین الاقوامی رشتے مضبوط سے مضبوط تر ہوتے جاتے ہیں۔

آہ! لاہور کے عجائبات۔ شالا مار باغ، عظیم قلعے اور پرانی مسجدیں، ہر سیاح یہاں تصویریں لیتا ہے۔ کچھ باہمت لوگ دریائے راوی پر چلے جاتے ہیں اور پاکستان کے ڈرائنگ روم، ہر سورج ڈھلنے کے نظارے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کچھ فلم اسٹوڈیو چلے جاتے ہیں اور اردو اور انگریزی میں بنتی ہوئی فلمیں دیکھتے ہیں کیونکہ اپنے ملک میں تو عموماً انہیں یہ موقعہ ملتا نہیں۔ لاہور میں انہیں بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے وہ فلیٹیز یا پارک لگژری میں ٹھہرتے ہیں مشرقی مصنوعات کی دکانوں پر جاتے ہیں اور وہ چیزیں دیکھتے ہیں جو انہیں کراچی میں نظر نہیں آتیں۔ وہ خوش قسمت لوگ جو فروری میں یہاں آتے ہیں مشہور گھوڑوں کی نمائش دیکھتے ہیں جہاں بڑے بڑے

لوگ موجود ہوتے ہیں ''گھر کے لوگ یہ تمام باتیں سن کر کتنے متعجب ہوں گے۔'' پھر پنڈی بس کے ذریعے راولپنڈی اور ٹیکسلا کی طرف جہاں آثار قدیمہ کے خزانے موجود ہیں۔ راستہ میں وہ نئے دوست بناتے ہیں اور ایک بار پھر ان کے دل میں مختلف سوال اٹھتے ہیں۔ ''عورتیں کام کرتی ہیں یا گھروں میں رہتی ہیں؟ کیا یہاں ہر کام بجلی اور بٹن دبانے کے ذریعے ہوتا ہے؟ کیا یہ سچ ہے کہ یہاں کچھ ایسی ہیں جو امیر نہیں ہیں؟ اور ایسے ہی بیشمار سوالات، چائے خانوں پر، جو بیشمار ہیں، سیاحوں کو چائے کے پیسے دینے کی اجازت بھی نہیں دی جاتی۔ بہت سے پاکستانی اصرار کرتے ہیں ''آپ ہمارے معزز مہمان ہیں آپ کو ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا پینا چاہیے۔'' پھر سوالات ہوتے ہیں جو اکثر سیاسی نوعیت کے ہوتے ہیں اور پھر موضوع بدل جاتا ہے۔ سیاح انہیں بتاتے ہیں کہ وہ کتنے عرصہ سے خیبر پاس دیکھنے کا خواب دیکھ رہے تھے جہاں تاریخ بنی اور سوات جو سوئٹزرلینڈ کی طرح ہے۔ ہم سفر انہیں ان جگہوں کے بارے میں بتاتے ہیں اور ان کا اشتیاق بڑھتا جاتا ہے۔

پشاور میں ٹورسٹ بیورو سے انہیں تمام معلومات حاصل ہو جاتی ہیں آخر کار وہ خیبر پاس پہنچ جاتے ہیں۔ جن راستوں پر سکندر اعظم نے سفر کیا اب وہ ان پر چل رہے ہیں وہ قبائلی پٹھانوں سے ملنے کے لیے رکتے ہیں، ان کی بندوقوں اور بچوں کی تعریف کرتے ہیں اور انہیں بتاتے ہیں کہ عظیم خیبر آ کر وہ کتنے خوش ہیں۔

آخری مقام سوات، ہمالیہ کے علاقہ یا مشرقی پاکستان ہو سکتا ہے پھر انہیں پڑھی ہوئی باتیں یاد آتی ہیں کہ والیٔ سوات روز اپنے دفتر میں دربار عام منعقد کرتا ہے۔ ملاقات کا وقت لیے بغیر وہ اندر داخل ہو جاتے ہیں۔ والی اپنی میزبانی کے لیے مشہور ہے اور وہ اس بات کا ذرا برا نہیں مناتا۔ والی چائے منگاتا ہے اور اپنے لڑکے ولی عہد اورنگ زیب کو بلاتا ہے اور سیاحوں سے پوچھتا ہے کہ پاکستان انہیں کیسا لگا وہ دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہتے ہیں۔ مہمان یہ سوچ کر خوش ہو جاتے ہیں کہ اپنے ملک میں وہ مسٹر اور مسز شلٹز، اسمتھ، جونز یا ہینکینز، دوستانہ ممالک کے عام شہری ہو سکتے ہیں لیکن اس وقت وہ ایسے آدمی سے باتیں کر رہے ہیں جو شاہی خاندان سے ہے۔ گو مسٹر اور مسز 'ٹورسٹ' کو عموماً پاکستان کے صدر سے ملنے کا موقعہ نہیں ملتا لیکن سفر کے دوران وہ بیشمار لوگوں سے ملتے ہیں اور انہیں بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔

اپنے ملک جاتے ہوئے بادلِ نخواستہ وہ کراچی لوٹتے ہیں۔ ہر شخص ایک ہی بات سوچ رہا ہے...... ''اگر زیادہ سے زیادہ لوگ سفر کرنے لگیں اور غیر ضروری تنقید کے بغیر لوگوں کو ایسے ہی رہنے دیں جیسے یہ رہتے آئے ہیں تو دنیا میں کتنا امن ہو۔'' عزیز سیاحو، یہی اصل چیز ہے۔ پاکستانی آپ سے محبت کرتے ہیں، آپ کی آمد کے خواہشمند ہیں اور ترقی کے لیے آپ کی کوششوں کو سراہتے ہیں۔ وہ آپ کو باہمت اور ذہین سمجھتے ہیں۔ وہ محبت سے آپ کا پیچھا کرتے ہیں اور اپنی معلومات، دکھ، درد اور خوشیوں میں آپ کو شریک کرنے کو تیار ہیں۔

کراچی ہر ایک کے لیے

کراچی: پاکستان کا سب سے بڑا شہر۔ سرکنڈوں کی طرح دن بدن گنجان ہوتا اور پھیلتا جا رہا ہے۔ صنعتی، تجارتی اور ثقافتی ہر پہلو سے ترقی پذیر ہے۔ لیکن اس تیز رفتاری میں بھی کراچی کی فضا نرم دلی اور ہمدردی ظاہر کرتی ہے۔ مثلاً دوسرے اضلاع کے لیے گشتی کتب خانے یہاں سے جاتے ہیں۔ دفتروں کے وہ ملازم جو سائیکلوں پر بے شمار ٹفن کیریر اٹھائے دوپہر کا کھانا پہنچاتے ہیں۔ گرم گرم اور لذیذ کھانا کوٹھیوں سے اور جھونپڑیوں سے بھی ___ یہیں یہ نظارہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی بارات کو راستہ دینے کے لیے ٹریفک خود بخود رک جاتی ہے اور کراچی کا جدید ترین ہوائی مستقر ___ جو ایشیا میں سب سے اہم ہے وسعت اور بوقلمونی کا حامل ___ ایک جیٹ طیارہ سے کچھ دور گدھا گاڑیاں آرام کر رہی ہوتی ہیں اور ان کے مالک ہوا میں اڑتی سفید قمیض اور کھلی سفید شلوار کے ساتھ ان پر سوار۔ کسی خاص سامان کے منتظر ہوتے ہیں۔ کیونکہ مسافر زیادہ تر لندن، پیرس اور نیویارک کے کپڑوں میں سوار نہایت ہلکے پھلکے نکلتے ہیں۔ یہ ہے کراچی ___ ہر جگہ ایک تضاد ___ انبساط و فرحت کی کیفیت ___ ساری سردیاں دھوپ چمکتی ہے اور گرمیوں میں خنک سمندری ہوا چلتی ہے ___ یہ ہے کراچی درخشندہ سے بھی کہیں زیادہ۔ کیونکہ اس کے باشندے اسے یہی بنانا چاہتے ہیں۔ دوسرے ملکوں سے آنے والوں کے لیے پاکستانیوں میں بڑی محبت پائی جاتی ہے۔ عموماً اس محبت کا اظہار اگرچہ نہیں ملتا۔ لیکن کراچی کے شہر اس جذبے کا اظہار خوب کرتے ہیں۔ غیر ملکی کسی بھی قوم سے ہو، اس جذبے کی شدت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے وطن میں ہی محسوس کرتا ہے ___ چند برس گزرے مجھے ہونولولو، اور ہوائی جانے کا اتفاق ہوا، وہاں جولائی میں کسی ہوٹل میں پہلے سے کمرہ محفوظ کروائے بغیر رہنا اتنا ہی مشکل تھا، جس طرح لاہور میں مارچ کے سالانہ ہارس شو کے وقت سخت دشواری ہوتی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ میں ایک خاتون منیجر سے کہہ رہی تھی کہ چونکہ ہمارا جہاز (بحری) تاخیر سے آیا، اس لیے میں اسے اپنی آمد کی بروقت اطلاع نہ دے سکی۔ نہایت ہی مدھم آواز میں میں بڑبڑائی (جیسے مجھے کچھ کہتے ڈر لگتا تھا ___ اور مجھے اس پر سخت شرم آ رہی ہو) کہ میں دور کراچی سے آسٹریلیا کے راستے آئی ہوں۔ اس لیے مجھے اپنی آمد کی صحیح اطلاع دینا مشکل تھی ___ میرے الفاظ کا اثر بڑا تعجب انگیز ہوا۔ اگر میں نے یہ کہا ہوتا کہ میں وینس سیارے کی رہنے والی ہوں تو بھی تعجب اس سے زیادہ نہ ہوتا ___ ''کراچی'' ___ اس نے تعجب سے کہا۔ ''آپ کراچی سے آ رہی ہیں، پاکستان کا کراچی ___! یہ واقعی خاص بات ہے، ہم آپ کے لیے کمرہ ابھی تلاش کرتے ہیں۔'' اور اس نے واقعی ایک کمرہ ___ خوبصورت اور معقول نرخوں پر ___ تلاش کر دیا مجھے یقین ہے کہ اگر میں نے دہلی' بمبئی یا ٹوکیو کہا ہوتا تو وہ اثر نہ ہوتا جو کراچی کے نام سے ہوا۔ پھر الاسکا میں بھی یہی بات ہوئی۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میرے کراچی میں رہنے سے ہی یہ حیران کن واقعات رونما ہوئے۔

کراچی میں تو ایسے عجیب واقعات قریباً روزانہ ہوتے رہتے ہیں اور یہ ایک مسلمہ امر ہے۔ بعض اوقات یہ علی بابا کی کہانیوں کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ موٹر گاڑیوں کے بہتے دریاؤں کے ساتھ ساتھ اونٹ بھی غلے سے لدے چھکڑے بڑے ناز سے کھینچ رہے ہوتے ہیں۔ انہی جانوروں میں سے ایک اپنے مالک بشیر کے لیے خوش بختی اور شہرت کا باعث بن گیا...... ایک آدمی کی مرضی ہے کہ وہ کسی شیشوں سے لپٹی بار بر شاپ سے شیو کرائے یا سڑک کے کنارے کھلی ہوا میں بیٹھ جائے...... میکلوڈ روڈ یا پریڈی سٹریٹ کے اردگرد کہیں بیٹھ جائے، خطوط نویس آپ کے مکمل خط لکھ دیتے ہیں (ان میں محبت کے خطوط بھی شامل ہیں)...... سڑک کنارے بیٹھے درزی اور موچی آپ کو اسی وقت سی بھی دیتے ہیں اور مرمت بھی کر دیتے ہیں ___ کہیں سانپ سپیرے کی بین سے مست ہو کر جھوم رہے ہوتے ہیں ___ اور نیچے کلفٹن کے ساحل پر آپ ایک اونٹ پر بیٹھ کر بحیرۂ عرب کے کنارے خوب لطف اٹھا سکتے ہیں۔

سر سے پاؤں تک برقع میں لپٹی ہوئی باپردہ خواتین آپ کے پاس سے گزرتی ہیں۔ ساڑھی میں یا شلوار قمیض میں ملبوس عورتیں اس خطۂ ارض پر لباس کے مشرقی طرز کی تصویر پیش کرتی ہیں۔

یہ ان بے شمار امتیازات میں سے چند ہیں، جنہیں مغربی آنکھیں دیکھتی ہیں۔ اس سے پیشتر کہ آپ سب کچھ دیکھ سکیں اور لطف اٹھا سکیں۔۔۔ عربی النسل گھوڑے پر سوار صدر کے باڈی گارڈ گھوڑے کو دوڑاتے آ جائیں گے۔ ان کی سرخ اور سنہری یونیفارم دھوپ میں خوب چمکتی ہے۔

جب یہ دستہ گزر جائے، تو آپ کے پاس کوئی سندھی نجومی پہنچ جائے گا۔ جو آپ کو روشن مستقبل کی نوید دے گا۔ اس کی ہتھیلی پر کوئی سکہ رکھ دیں۔ نہیں! معاف کیجیے ایک یا دو روپیہ۔ اور سارا دن یہ مناظر، یہ لطف اور یہ دوستی کے تماشے ہی دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ کراچی کے لوگ دنیا کے سب سے پیارے لوگوں میں سے ہیں۔ کراچی کے اصل مکیں چست، جسیم اور طویل القامت ہیں۔ وہ اب بھی شہر کے پرانے حصوں پر رنچھوڑ لائن، کھارا در، میٹھا در، لیاری، صدر میں رہتے ہیں۔ ان کی طرز زندگی قدیم ہے۔۔ جدید شہر میں ہونے والے بیسویں صدی کے تیز رفتار تغیرات نے ان میں کوئی فرق نہیں ڈالا۔ کراچی پاکستان کا صنعتی اور تجارتی حصہ ہے۔ اہم ترین غیر ملکی اور مقامی تاجروں کے دفاتر شہر کے عین درمیان میں ہیں، جن کے ملازمین مختلف طبقوں اور نسلوں سے متعلق ہیں۔ چند برس پہلے تک کراچی ملک کا دارالحکومت تھا۔۔۔ اس لیے یہاں بیشمار ڈپلومیٹ رہائش پذیر تھے۔ نئے دارالحکومت اسلام آباد کے مکمل ہونے تک ان میں سے اکثر یہیں مقیم ہیں۔ تقسیم کے بعد بھارت سے آنے والے ہزاروں مہاجرین کو کراچی میں روشن مستقبل نظر آیا اس لیے انہوں نے یہاں پناہ لے لی۔ اس طرح ملک کے دوسرے کئی علاقوں کے باشندے یہاں تجارت کی ریل پیل دیکھ کر کھنچے چلے آئے اور یوں کراچی کی آبادی 20 لاکھ سے بھی تجاوز کر گئی۔ باہر سے آنے والے اتنے زیادہ ہیں کہ یہاں کے اصل مکیں اب اقلیت بن گئے ہیں۔

ان باتوں نے کراچی کو ایک بین الاقوامی فضا بخش دی ہے جو پاکستان میں اور کہیں نہیں پائی جاتی۔ اس مسلم آبادی میں خوبصورت کھلتے قد والے پٹھان اور شمال مغربی سرحد کے بلوچی، مشرقی بازو کے سانولے بنگالی، قابل فخر پنجابی، سندھی، میمن، آغا خان کے پیرو بوہرے اور خوجے جو سب کے سب مسلم ہیں، وہ بدھ مت، جین مت کے پیروکاروں، پارسیوں ہندوؤں، گوا، یورپ اور امریکہ کے مسیحیوں کے ساتھ شانہ بشانہ چلتے ہیں۔ ہر ایک نے زندگی کا ایک ایسا اسلوب اختیار کر لیا ہے جہاں کسی امتیاز کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہر شخص اس خطۂ ارضی کی نعمتوں کے ساتھ اپنے اپنے عقائد پر عمل کرتا ہے۔

کراچی کا ایک اور منفرد اور کثیر التعداد طبقہ وہ مچھیرے ہیں جو کیماڑی بندرگاہ، بابا بھٹ اور منوڑہ جزیروں کے قریب رہتے ہیں۔

مچھلی بندرگاہ کے ذریعے انہیں مزید خوشحالی نصیب ہو گئی ہے۔ اس بندرگاہ کی جدید سہولتوں نے مچھلی کی فراہمی میں اضافے کے ساتھ ساتھ ان کی آمدنی میں بھی اضافہ کیا ہے۔ 5400 فٹ چوڑے بحری راستے کے عین سامنے خاصی طویل خشک زمین ہے جہاں مچھلیوں کو دھونے، تولنے اور نیلام کرنے کے لیے لایا جاتا ہے۔ بہت بڑے شکاروں کو محفوظ رکھنے کے لیے سردخانوں کے پلانٹ بھی موجود ہیں۔ خشک مچھلیوں اور جھینگوں کے لیے لیبارٹریاں بھی بنائی گئی ہیں کیونکہ خشک مچھلی اور جھینگے بکثرت برآمد کیے جاتے ہیں۔ بحری سائنسدان بندرگاہ کے جدید میرین فشریز ریسرچ سٹیشن میں روزانہ کام کرتے ہیں۔ اس تحقیقاتی مرکز کا اپنا عجائب گھر اور لائبریری ہے۔ جہاں آنے والے ایک ایسی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں، جو گہرائیوں کے مکینوں کے لیے وقف ہے۔

کراچی کے ماہی گیروں کو پہلے اتنا اچھا زمانہ نصیب نہیں ہوا تھا۔ وہ وہ نہیں ہیں جو ان کے آباؤ اجداد ہوا کرتے تھے۔ اب وہ سمندر میں اپنا پرانا کانٹا ڈال کر جانوروں کے رحم و کرم پر نہیں بیٹھے رہتے۔ ان کے آلات بھی مشینی دور میں داخل ہو گئے ہیں۔ اب وہ مکران کے ساحل سے دور دور تک چلے جاتے ہیں۔ گہرے سمندر میں ماہی گیری بازار میں ان کی فروخت میں بے پناہ اضافہ کرتی ہے۔ اس نئی بندرگاہ نے ان کی زندگی پر بڑا نمایاں اثر ڈالا ہے۔

سویز سے سنگاپور تک کوئی جگہ بھی یہاں کے حسن اور فائدے کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ معاون ہاتھ سمندر پر، کا نشان امریکی امداد کا صحیح مفہوم ادا کرتا ہے۔ پاکستانی تعاون کے ساتھ جس سے زرمبادلہ کی کثیر تعداد حاصل ہوئی ہے اور ایسی صنعت کو فروغ دیا ہے جس نے ایشیا میں مچھلی کی سب سے ترقی بخش تجارت کو سائنسی استحصال بخشا ہے۔

یہ تمام کارخانے پاکستان کی ملکیت ہیں۔ پاکستان پہلا اور واحد ملک ہے جس میں مچھلیوں اور جھینگوں کو برآمد کرنے کے لیے پیکنگ اور پروسیسنگ کے لیے جدید ترین مشینری کے کارخانے قائم ہیں۔ اسے ایس۔ ایس۔ ماہیا کہتے ہیں۔ اس کا آغاز تین چار برس پہلے ہی ہوا ہے۔ ماہیا مچھلی کو صنعت بنانے کا ایک پیرایۂ آغاز ہے۔ یہاں ہر چیز خودکار ہے۔ لندن کی لائڈز نے اس کا بیمہ کیا ہے۔ نیو اورلینز کے اور امریکی ٹیکنیکل ماہرین کافی عرصہ یہاں ٹھہرے رہے۔ پھر انہوں

نے یہ کارخانہ تربیت یافتہ پاکستانی ماہرین کی پوری تحویل میں دے دیا۔

پاکستان کے سب سے بڑے شہر کے لیے یہ بڑی تعجب انگیز مہم ہے۔ سیاح جب یہاں دھوپ میں چمکتے پانیوں کے ساتھ بندرگاہ کے گرد گھومتا ہے اور وہ ان مچھیروں کو اپنے مخصوص انداز میں دیکھتا ہے تو اسے بہت لطف آتا ہے۔ کراچی کے ماہی گیر اپنے مخصوص دلکش لباس شلوار قمیص میں ملبوس ہوتے ہیں۔ ایک نفع بخش صبح کی دکانداری سے فارغ ہو کر دوپہر سے پہلے گھر جاتے ہوئے ان کے چہرے تمتما رہے ہوتے ہیں، جیبوں میں سکے کھنکھتے ہیں۔ دل میں یہ خیال ہوتا ہے۔ بال بچوں کے لیے آج کا کھانا بھی مل گیا اور انشاءاللہ کل بھی اور منتخب ذریعہ معاش کے طفیل ہر روز ہی کھانے کو مل جائے گا۔ اسی ذریعۂ معاش سے جو ان کے آباؤ اجداد سے وابستہ ہے لیکن اب اس قدیم زمانے کی بے شمار دقتوں سے بھی نجات مل گئی ہے۔ ان میں سے کئی ایک سہ پہر کو کشتی رانی کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو قریبی جزیروں اور ساحلوں پر لے جاتے ہیں اور چند ایک روپے مزید کما لیتے ہیں۔ مناظر کے دلدادہ لوگوں کو وہ نظارے دیکھنے کا موقع دیتے ہیں جو ان کے محبوب شہر نے اس گرم اور نیلگوں سمندر کے ساحلوں پر ان کے لیے سجا رکھے ہیں۔

کراچی کی تاریخ اس کے لوگوں کی طرح رنگین ہے۔ قدیم مؤرخین اس بات کے قائل تھے کہ کراچی وہ بندرگاہ ہے جسے ایک سیاح نیرسش نے 325 ق م میں سندھ سے زیریں علاقے کی طرف جاتے ہوئے ''جنت سکندرا'' کا نام دیا تھا۔ سمندری جہازوں کے لیے ناموزوں پاٹ جانے کے باعث یہ مچھیروں کا گاؤں...... کراچی بن گیا۔ یہ اس قدر خوبصورت تھا کہ مسافر اسے ریگستان سندھ میں OASIS کے نام سے پکارتے تھے۔ کلہوڑوں نے بھی اس پر حکومت کی۔ اگرچہ پہلی مرتبہ تالپور فتح علی خان نے کراچی فتح کرنے کو جو چند ایک مہمات بھیجی تھیں وہ ناکام رہی تھیں۔ ایک اور حملہ خان آف قلات نے کیا تھا۔ جس نے بعد میں تالپوروں سے شکست کھائی۔ سندھ کے سر چارلس نیپئر نے اپنے 300 سپاہیوں کے ساتھ اور بغیر کسی کشت وخون کے کراچی کو فتح کر لیا اور یوں 17 فروری 1843ء کو کراچی برطانیہ کے زیر اثر چلا گیا۔

اس کے بعد نیپئر کو حیدر آباد سندھ کا گورنر اور افواج کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔ نیپئر نے صدر مقام حیدر آباد کی بجائے کراچی میں منتقل کر لیا۔ اس نے اپنی ذہانت اور پیش بینی سے یہ دیکھ لیا کہ کراچی ایک دن عظیم شہر بن جائے گا۔ اس نے کراچی کی عظمت کو اپنے ان مشہور الفاظ میں قلمبند کیا۔ تو

ایک روز مشرق کی شوکت وعظمت ہو جائے گا۔

کاش میں تجھے دوبارہ دیکھ سکوں۔

اے کراچی...... تیری عظمت وشکوہ کے دنوں میں،

اس انگریز گورنر نے یہاں بڑی تیزی سے تعمیر وترقی کے منصوبوں کو عملی جامعہ پہنایا اور کراچی کو ایک بہت بڑا فوجی مرکز بنا دیا۔ اس نے سپاہیوں کے رہنے کے لیے نیپئر بیرکس بنوائیں۔ ہسپتال اور سینی ٹوریم تعمیر کروائے...... منوڑا کی بندرگاہ اور روشنی گھر اس نے بنوائے تھے۔ پولیس کا نظام بھی اس نے رائج کیا۔ مارسٹن ہاؤس اور مارسٹن روڈ کراچی میں اب بھی لیفٹیننٹ مارسٹن کی یاد دلاتی ہیں جو نیپئر کی فوج میں پہلا کپتان تھا۔ پھر اس نے دوپہر کے بارہ بجے توپوں سے گولے چلانے کا ایک دانشمندانہ اہتمام کیا۔ جس سے شہر کے ہر شخص کو صحیح وقت کا علم ہو جاتا اور لوگ اپنے اپنے کلاک بارہ پر کر لیتے۔ موجودہ گاندھی گارڈن کا منصوبہ بھی اسی نے بنایا تھا۔ سر چارلس نے 10 اگست 1847ء کو استعفیٰ دیا اور دو مہینے بعد کراچی سے چلے گئے۔ کراچی پھر صوبہ بمبئی کا حصہ بن گیا اور سیکنڈ کمشنر سر بارٹل فریئر نے نیپئر کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنا چاہا۔ کراچی اور کوٹری کے درمیان اس نے پہلی ریلوے لائن شروع کروائی۔ ڈاک کا نظام، پکی سڑکیں، پل، ڈاک بنگلے اور کچہریاں فریئر نے ہی بنوائی تھیں۔ اپنے وقت میں اس نے ''شہری تنظیم'' قائم کی، میونسپل کارپوریشن اس کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ دلکش فریئر ہال (کراچی کا مشہور عجائب گھر) اور خوبصورت فریئر ہال گارڈن کی بنیادیں بھی اسی نے رکھی تھیں اور یہ آج بھی اس کے نام پر ہی قائم ہیں۔

ان دنوں برطانوی لوگوں کا پسندیدہ مشروب ''چائے'' تھا اور مسلمان لسی پیتے تھے۔ جلد ہی چائے پینے کی عادت سارے ملک میں پھیل گئی۔ مسلمان بھی اس سے خوب لطف اندوز ہوتے تھے اور اب اگرچہ انگریز مدت ہوئی جا چکے ہیں لیکن چائے پینے کی عادت انگریز کی دوسرے طور طریقوں کی یاد بھی دلاتی رہتی ہے۔ کراچی کے لوگ اسے دل سے پیتے ہیں...... اور لسی فراموش ہو چکی ہے۔

تقسیم کا زمانہ کسے یاد نہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں (جو اس وقت سب ہندوستانی سمجھے جاتے تھے) میں اختلافات کے باعث یہ مرحلہ درپیش آیا۔ دونوں کے تمدن اور معاشرتی نظام

مختلف اور باہم متصادم تھے۔ برصغیر میں ایک الگ مسلم مملکت کی تجویز معروف شاعر اقبال نے پیش کی تھی اور قائداعظم محمد علی جناح اسے معرض وجود میں لائے تھے۔ پاکستان کے حصول کے لیے اس عظیم قائد کو بے شمار مراحل اور دقتوں سے گزرنا پڑا اور آخر کار انہوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے آزادی حاصل کر ہی لی۔

14 اگست 1947ء کو قائداعظم کا خواب ایک حقیقت بن گیا اور ان کی قیادت میں پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ پندرہ اگست کو قائداعظم نے دارالحکومت کے لیے کراچی کو منتخب کیا اور یوں یہ مرکزی حکومت کا صدر مقام بن گیا۔ پیرایۂ آغاز کے طور پر پاکستان کا نام منتخب کیا گیا، جس کا مطلب ہے ''پاک لوگوں کی زمین'' ...... یہ آغاز سرتاسر ایک نومولود بچے کی زندگی کا آغاز تھا......

اگرچہ مسرت بے انداز تھی لیکن بھارت سے ہزاروں مہاجرین اس حقیقی مسلم مملکت میں نئی زندگی اختیار کرنے کے لیے آ رہے تھے۔ یہ مناظر جہاں دلدوز تھے وہاں یہ مفلسی اور غربت میں اضافے کا سبب بھی تھے۔ بے شمار لوگ گلیوں میں رات بسر کرتے اور سرکاری دفاتر برائے نام تھے۔ عارضی طور پر سرکاری ملازمین کے لیے بعض مکانات لے لیے گئے تھے اور دفتری سہولتوں کی قلت اس قدر تھی کہ ایک دفتر میں ایک کاغذ اور لفافہ بھی قیمتی چیز بن گیا تھا۔ لیکن ایک نوخیز پاکستانی کے لیے خودمختار آزادی کا حصول ہی ان سب سے بڑھ کر تھا۔

کراچی کو قائداعظم کی جائے پیدائش ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ انہوں نے 25 دسمبر 1876ء کو وزیر مینشن میں آنکھ کھولی۔ جو اب ایک قومی یادگار کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ کراچی نے آزادی کے ایک برس بعد ہی قائد کی اچانک اور جلد موت کے غم واندوہ کو برداشت کیا، اور اپنی زندگی کو رواں دواں رکھا۔

کراچی نے مشقتوں، سیاسی سازشوں، ناانصافیوں اور دفتری بد دیانتوں کو بھی برداشت کیا اور اپنی زندگی کو رواں دواں رکھا۔

کراچی اس وقت اور چمکا جب 1958ء میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کا دور شروع ہوا اور اپنے آپ کو سربلند رکھا۔

کراچی نے اس وقت بھی کوئی شور وغوغا نہ کیا جب 1959ء میں اس سے دارالحکومت کا شرف ایک ہزار میل دور راولپنڈی میں منتقل کر دیا گیا جو عبوری دارالحکومت بنا۔

کراچی اس آزمائش میں بھی زندہ رہا اور پہلے سے زیادہ فراخ دل اور وسیع بن گیا۔

کراچی کے لیے اور بھی بہت چیزیں سوچنے کی تھیں۔ کورنگی کی نئی آبادی میں تیس ہزار نئے گھر تعمیر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جہاں بے شمار مہاجرین منتقل ہو گئے۔ اس بستی کی تعمیر کے لیے معروف یونانی ماہرین تعمیر ڈوکسیاڈز ایسوسی ایٹس دنیا بھر کے ماہرین میں سے منتخب کیے گئے اور انہوں نے 1959ء میں چھ ماہ کے مختصر عرصے میں زمین کے سینے پر تیس ہزار گھر بلند کر دیئے۔ کم آمدنی کے طبقے کی رہائشی سہولتوں کے لیے 1962ء میں نئے کراچی کا سنگِ بنیاد رکھا گیا اور اسی سال اسے مکمل بھی کر لیا گیا۔ مجھے اسی بستی کی تاثر انگیز افتتاحی تقریب کبھی نہیں بھولے گی۔ یہ رسم صدر پاکستان نے ادا کی تھی...... مجھے یاد ہے کہ سب سے پہلے ایک چھوٹے سے بڑھئی نے سنہری چابی حاصل کی اور وہ اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ زندگی میں پہلی بار اپنے حقیقی گھر میں داخل ہو رہا تھا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور اس کے اپنے دروازے کا تالا کھولنے میں دوسرے لوگوں کو اس کی مدد کرنا پڑی۔ ایسی باتیں اور کہاں ہو سکتی ہیں کہ نو کروڑ پچاس لاکھ لوگوں کے ملک کا صدر اپنی مصروف زندگی میں سے اس قدر وقت نکالے تا کہ وہ اپنے سب سے چھوٹے طبقے کے شہریوں کی مسرت اور خوش بختی میں شریک ہو سکے...... یہ صرف کراچی میں ہی ممکن ہے۔ جھونپڑیوں، فٹ پاتھوں پر گزر اوقات کرتے ہزاروں کنبے حکومت کے زیر اہتمام اسی ہفتے ان نئی رہائش گاہوں میں منتقل ہو گئے جہاں ہر ایک کا اپنا ایک صحن تھا۔

اس روز مسرت اور خوشی کا جو عالم تھا اس کا مقابلہ کسی قومی دن کی رنگینیاں بھی نہیں کر سکتیں۔

حکومت کراچی میں ابھی مزید بستیوں کی تعمیر کا ارادہ رکھتی ہے۔

کراچی نے اپنے سیاحوں کو نہیں بھلایا ہے۔ مسافروں کی کثیر تعداد کو سمانے کے لیے جدید اور نفیس ہوٹلوں کی تعمیر جاری ہے۔

یہ کراچی ہی ہے جہاں مسافروں اور سامان کی نقل وحمل کے لیے پہلی سرکلر ریلوے شروع کی گئی......

یہ کراچی ہی ہے جہاں بادشاہ، ملکائیں اور دوسری بہت سی اہم شخصیات سب سے پہلے آتی ہیں......

یہ کراچی ہی ہے جہاں وہ سخت جاں سیاح سب سے پہلے پہنچتے ہیں (جن کی تواضع بھی اہم

شخصیات کی طرح ہی کی جاتی ہے)

اور یہ بھی کراچی ہی ہے جہاں سیاحوں کو وہ تفریح اور سرخوشی ملتی ہے جس میں بیسویں صدی کی آسائشیں بھی شامل ہیں اور الف لیلوی دور کا سحر بھی......

پہلے ہوٹلوں کو لے لیجئے۔ مختلف گاہکوں کے لیے مختلف سامان خوردونوش موجود ہے۔ میٹروپول کراچی کا سب سے بڑا ہوٹل ہے اس میں پانچ سو مہمانوں کے لیے خوبصورت اور ایئر کنڈیشنڈ کمرے ہیں۔ میٹروپول کی اپنی ایک دنیا ہے جہاں باغات میں ڈاکخانہ ہے اور بے شمار دکانیں اور دفاتر ہیں...... ایک ایسی دنیا۔ ہے جہاں لندن اور نیویارک کے مہمان سڈنی اور پانامہ سے آنے والوں سے ملتے ہیں...... اطمینان، شان وشوکت، آرام اور سرخوشی کی دنیا۔ میٹروپول کے بیرے، گھنٹی سننے والے لڑکے...... اور دربان سب خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

اگر تفریح کی تلاش ہو تو یہاں بینکوئٹ ہال ہیں، رقص گاہیں ہیں جہاں ایسے ایسے فنکار ہیں جن کے جذبات انگیز مظاہروں سے گرمیوں کی شامیں اور چمک رکھتی ہیں۔ کھلے Grillron اور بھری پری بار میں خدمت کے علیحدہ اخراجات نہیں لیے جاتے۔ دوسری منزل پر یہ ایسی دنیا ہے جہاں ہر قدم سکون چھایا ہوا ہے۔ کمروں میں بستر بچھے ہیں، سفید رنگ کی چادریں چمکتی ہیں اور ہر وقت خدمت گار تیار ملتے ہیں۔

میٹروپول کے مہمان خوش قسمت ہیں۔ اب یہاں باغیچوں کے اوپر ایک نیا (Tavern) ہے۔ جسے 'چکن ان' (چوزوں کی سرائے) کہا جاتا ہے۔ ذرا تصور کیجئے کہ کراچی میں ایک ایسی جگہ، جہاں آپ چوزے ایسی لذیذ چیز کھا سکتے ہیں۔ یہاں نہ صرف ہر قسم کے چوزے میسر ہوتے ہیں بلکہ چوزوں کے تکے بھی۔ ان چوزوں کو ہم انسانوں سے زیادہ عمدہ اور خالص غذا ملتی رہی ہے۔ ان کی پرورش اور دیکھ بھال بڑے آرام دہ ماحول میں ہوئی اپنے چھوٹے چھوٹے دلوں میں یہ احساس انہیں بھی ہوتا ہوگا کہ وہ کوئی خاص چیز ہیں کیونکہ انہیں رہنے کو مخصوص شاہانہ ماحول ملتا رہا ہے۔

بڑی بڑی تمام ہوائی کمپنیوں کے دفاتر میٹروپول میں ہیں پین امریکن ائرویز کو باغ کا ایک نمایاں گوشہ میسر ہے اس دفتر سے اگلے کمرے میں ایک چھوٹا سا لیکن صاف ستھرا دارالمطالعہ ہے۔ مہمان ہر وقت آ سکتے ہیں۔ سکنڈے نیوین ائر لائنز کا خوبصورت دفتر بھی باغ میں ہی ہے۔ بی۔او۔اے۔سی کی ایک شاخ بھی یہاں موجود ہے۔ ایریانا افغان ائر لائنز، ٹی، ڈبلیو، اے اور ائر انڈیا کے دفاتر بھی ساتھ ساتھ واقع ہیں۔

جرمنی کی ہوائی کمپنی لفتانسا کا دفتر تو میٹروپول کے بڑے باغ کے دروازے کے ساتھ پر ہے۔ انہیں اتنی کامیابی نصیب ہوئی ہے کہ اب ان کے خاصے دفاتر ایک قطار میں واقع ہیں۔ کسی دروازے سے اندر چلے جائیے، وہ زمین کے کسی بھی کونے کے لیے آپ کی بکنگ کر دیں گے۔

کتابستان کی کتابوں کی ایک دکان بھی ہے۔ اس کے مہتمم ایک نہایت شریف دل انسان عباسی صاحب ہیں جو ادب، دانش اور سامان تصویر کشی فروخت کرتے ہیں۔ اس طلسماتی باغ میں ایک سیلون بھی ہے۔ سنیک بار بھی ہے اور مرفی کی ادویات کی واحد دکان بھی ہے (معاف کیجیے یہ کیمسٹ کی دکان ہے) اس کے مالک ایک وجیہہ شکل پارسی ہیں اور انہوں نے آئر لینڈ کا یہ خوبصورت اور پرانا نام رکھا ہے اگلے دروازے سے آپ ڈاکٹر کے دفتر میں ڈاکٹری معائنہ کے لیے چلے جائیے یا ''شیر نیز گفت'' میں داخل ہو جائیے جہاں پاکستان کی خاص چیزیں دستیاب ہیں اور چیونگ گم بھی ہے۔ پاکستان ویسٹرن ریلوے کے دفتر میں سفر کے متعلق معلومات مسکراہٹوں کے ساتھ بتائی جاتی ہیں۔ میٹروپول کے باغات میں ایک ایسی جگہ بھی ہے جو دن رات چمکتی ہے یہ چمک وہ ہے جس سے پاکستانی محبت کرتے ہیں اور یہ وہ چمک ہے جس سے سیّاح بھی محبت کرتے ہیں۔ یہ کولمبو جیولرز ہیں جو رات گئے تک دکان کھولے رہتے ہیں تاکہ رات کے کھانے کے بعد خریداری کو آنے والے مایوس نہ ہوں۔ وہ صرف چمکتے موتی نہیں فروخت کرتے ہیں، بلکہ حسن، سلطان اور پاپا آفریدی مفکر دوست ہیں۔ اپنی مرضی کے مطابق خوب دیکھیے، وہ کہتے ہیں...... جو چاہیے چن لیجیے، یہ آپ کا اپنا ہے...... چند سکّوں کے عوض۔

نوویکس، اس ہوٹل کے اپنے ڈرائی کلینرز ہیں۔ یہاں بڑی رونق رہتی ہے۔ اگر آپ صرف ایک رات ٹھہرنا چاہتے ہیں تو خوش باش پروپرائٹر مسٹر آغا آپ کے سفر کی گرد سے بھرے کپڑوں کو آپ کے جانے سے پہلے ہی دھلوا دیں گے۔ پیاری پیاری گفتگو بھی ہوگی اور چائے کی ایک پیالی بھی ہو جائے گی۔ یونس ان کا ذاتی رفوگر ہے جو اس مہارت سے کپڑے رفو کرتا ہے کہ بالکل معلوم ہی نہیں ہوتا اور آپ کا دل چاہتا ہے کہ کاش آپ کے کپڑوں میں بھی کوئی سوراخ ہوتا۔

فوٹوگرافر، گیری اور اس کی سفری ایجنسی نیشنل اینڈ گرینڈ لیز بنک سے بالکل ساتھ والے

کمرے میں ہے۔ گیری سفری انتظامات کے ماہر ہیں اور آپ کے لیے پاسپورٹ سائز کی تصویریں مفت تیار کر دیتے ہیں یہ بڑا بارونق گوشہ ہے۔ پاسپورٹ تصویروں والا ٹریول ایجنٹ، بنک اور ال اٹیلیا ائیر لائن سب ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ یہاں باغ میں ال اٹیلیا کا کراچی آفس اتنا بڑا نہیں ہے لیکن پارسی، مسلمان اور یورپی عملے کی دوست داری بڑی دلکش ہے، خواہ آپ آسٹریلیا جا رہے ہوں خواہ کاراما کی زمین نیول میں...... وہ آپ کے لیے پوری توجہ وقف کر دیں گے۔

سوس ایر کے میٹروپول میں سب سے بڑے دفاتر ہیں۔ سوئٹزر لینڈ کا ماحول آپ کے گرد و پیش رہتا ہے...... جو یقیناً موثر بھی ہے۔

پاکستان کے بہترین جفت ساز کنکسن کی بھی میٹروپول کے باغات میں ایک دوکان ہے جہاں جوتوں کی ہاتھوں سے آرائش کی جاتی ہے۔ کراچی کے اہل ذوق اس چھوٹی سی کارگاہ اور شوروم میں جمع رہتے ہیں۔ کنکسن کا انتظام تین زندہ دل رشتہ داروں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر آپ صرف ایک ہفتے کے لیے بھی آئے ہیں۔ تب بھی وہ بالکل نیا فیشن، اطالوی یا آپ کا پسندیدہ کوئی بھی ڈیزائن آپ کے جانے سے پہلے پہلے تیار کریں گے اور اس کی قیمت 75 روپے سے زیادہ نہ ہوگی۔

کنکسن سے صرف چند قدم کے فاصلے پر جدید ہائیڈرالک لفٹیں لگی ہوتی ہیں جو باغیچوں کے پیچھے سے سب مہمانوں کو ہر منزل تک لے جاتی ہیں۔ پہلی منزل پر کیتا بوتا کا سیلون ہے جو صنف لطیف کے آرائش حسن کے لیے وقف ہے۔ اس آرام گاہ میں خوبصورت اور دلکش ائیر ہوسٹسوں سمیت، تمام مہمان میٹروپول کی کھلی تیسری منزل پر دھوپ کا لطف اٹھاتے ہیں۔ سب سے اوپر اور پانچویں منزل پر ایک چھوٹا سا جدید جمنازیم ہے، جہاں ورزش کے عادی مہمان کسی خرچہ کے بغیر ہی آسکتے ہیں۔ میٹروپول کے پروپرائٹر مسٹر منوالا زیادہ وقت میٹروپول میں گزارتے ہیں۔ ہر شخص کو ان کے گھر سے زیادہ آرام پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ بیرے اپنی مذہبی عبادت کے ساتھ ساتھ مہمانوں کی پوری طرح خاطر مدارت کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک پرائیویٹ پارٹی پر ایک بیرے کو باقی ماندہ دو مرغ پیش کیے گئے۔

اس نے انہیں تحسین بھری نگاہوں سے دیکھا لیکن یہ کہتے ہوئے لینے سے انکار کر دیا کہ اسلامی طریقے سے ان کی گردنیں ذبح نہیں کی گئیں اس لیے یہ ہمارے لیے ممنوعہ خوراک ہے......

لیکن یہ یقین ہو جانے پر انہیں ایک پکے مسلمان قصاب نے ذبح کیا تھا، اس نے چوزے اٹھا لیے۔

میٹروپول کے اخراجات یورپی ہوٹلوں اتنے ہی ہیں۔ یہ 48 روپے فی بستر، صبح کی چائے اور ایک اچھے خاصے ناشتے سے شروع ہوتے ہیں۔ ائرکنڈیشننگ کے بغیر کمروں کے دس روپے روزانہ کم ہیں۔ انتظامات بڑے معقول ہیں۔

میٹروپول سے باہر ٹیکسیاں قطاروں میں کھڑی آپ کی منتظر رہتی ہیں۔ اس سٹینڈ کا غیر سرکاری سربراہ ''بادشاہ'' ہے جو کراچی کے نئے پرانے حصے میں کسی بھی جگہ جانے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اگر سفر لمبا ہو تو تمام اچھے مسلمانوں کی طرح وہ نماز کے وقت گاڑی روک کر نماز ادا کرتا ہے۔

میٹروپول کے بالکل ساتھ ہی پیلس سینما ہے جہاں تازہ ترین فلمیں دکھائی جاتی ہیں اور اس سے آگے مڈل ایسٹ ایرلائنز کے دفاتر ہیں۔ ان کی کتنی خوش قسمتی ہے کہ وہ شہر کے عین درمیان میں ہوتے ہوئے ان کے سامنے ایک چھوٹا سا باغ اور دو رویہ دلکش درختوں سے آراستہ گلی ہے۔ ایم۔ ای۔اے لبنان کی ایک محبوب کمپنی ہے جس کے طیارے بمبئی سے کراچی ہوتے ہوئے بیروت جاتے ہیں اور پھر لندن کے شہر کی طرف۔ راستے میں وہ ہر شخص کی مرضی کے مطابق قیام کرتے ہیں۔ ان کے طیارے میں سفر سے عالم عرب کی مسرتوں کا صحیح لطف ملتا ہے۔

ایک اور جدید ہوٹل بیچ لگژری...... بحیرہ عرب کے ساحل پر ایک مرکز تسکین کی طرح موجود ہے۔ جہاں تازہ ہوائیں چلتی ہیں اور مہمان پرہجوم شہر سے بہت دور سکون کے لمحے بسر کر سکتے ہیں۔ کشتی رانی کر سکتے ہیں۔ تیر سکتے ہیں۔ دھوپ سینک سکتے ہیں۔ کمروں میں جدید تر فرنیچر اور سامان آرائش موجود ہے۔ بار اور ڈائننگ روم کی طرح یہ بھی انتہائی ایرکنڈیشنڈ ہیں...... مشرقی بھی ہے، بین البراعظمی بھی اور لذیذ بھی، عظیم بینکویٹ ہال نہایت دلکش اور سحر انگیز جگہ ہے جس کے ہر دریچے سے سمندر کا پُر لطف نظارہ ہو سکتا ہے۔ یہاں کی خاص بات اتوار کی صبح کا کنسرٹ ہے جو ساڑھے گیارہ سے ڈیڑھ بجے تک ہوتا ہے۔

بیچ لگژری کے ساتھ ساحل پر ''چائنا کریک'' میں کراچی کے پہلے جدید اور تیرتے ریسٹورنٹ کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ مہمان ناچتے یا کھاتے وقت اپنے آپ کو بحری جہاز پر محسوس کریں گے۔ حال ہی میں تعمیر شدہ تیرنے کا تالاب مہمانوں کی مزید طمانیت اور انبساط کے لیے کھول دیا

گیا ہے۔اس تالاب کے کنارے ہوٹل کا آرکسٹرا لنچ اور چائے کے مہمانوں کے لیے اپنا مظاہرہ کرے گا۔ بیچ (اسے سہارے بھی کہتے ہیں) تجارت یا تفریح کے لیے آنے والوں کے لیے بڑا سحرانگیز گوشہ ہے۔وہی میٹروپول والے اخراجات ہی ہیں۔

پیلس ہوٹل ایک باوقار جگہ ہے۔یہ بھی شہر کے عین وسط میں واقع ہے۔ پہلے یہ ایک پروقار شخصیت خان بہادر کا پرآسائش گھر تھا جس نے یہاں جدید تر فرنیچر اور تمام جدید آسائشوں کے لیے اپنی بے پناہ دولت صرف کردی تھی۔ یہاں آرام کرنے کے لیے رنگا رنگ پھولوں کے دلکش باغیچے ہیں۔ جہاں مہمان چائے پی سکتے ہیں۔پھل کھا سکتے ہیں یا صرف دھوپ چھاؤں میں بیٹھ سکتے ہیں ساتھ ہی ایک جدید تر بار ہے جہاں دوست محفل شراب کے لیے ملتے ہیں۔ہوٹل کے اندر ایک ریستوران اور نائٹ کلب گورمٹ کے نام سے موجود ہے جہاں پرلطف کھانے بھی ملتے ہیں اور ساتھ ساتھ بڑے اچھے فنکار نئے نئے کھیل پیش کرتے ہیں۔مزید تفریح کے لیے جدید فرنیچر سے آراستہ اور ایرکنڈیشنڈ لاؤنج اور ریڈنگ روم ہے جہاں ملکی اور غیر ملکی رسائل اور اخبارات پڑے رہتے ہیں۔پیلس میں ایک ائیر بکنگ آفس بھی ہے۔کرنسی ایکسچینج کی سہولتیں بھی میسر ہیں اور ایک تیز رفتار لانڈری سروس بھی۔ایک غیر ایرکنڈیشنڈ کمرے کا کرایہ 30 روپے سے شروع ہوتا ہے اور ایرکنڈیشنڈ کمروں کا 48روپے سے شروع ہوتا ہے۔

ہوٹلوں کی دنیا میں بلاشبہ پاکستان کو اپنے جدید اور درخشندہ کراچی انٹر کانٹی نینٹل پر نہایت فخر ہوگا۔ یہ ہوٹل بین الاقوامی معیاروں کے عین مطابق ہے۔اس کا آغاز 1964ء میں ہوا تھا۔ اب دوسرے بڑے شہروں لاہور، ڈھاکہ، راولپنڈی میں بھی یہ ہوٹل کام کرنا شروع کردیں گے۔

انٹر کانٹی نینٹل کے متعلق ہر بات ہی نظریاتی طور پر نئی ہے۔دوسرے ہوٹلوں کی طرح یہاں کوئی مرد بیرا نہیں ہے بلکہ ان کی جگہ خوبصورت اور تعلیم یافتہ خواتین ہیں جو سٹیورڈیس کہلاتی ہیں۔ وہ آپ کے کمرے آپ کے کپڑوں اور آپ کے دوسرے سامان کی دیکھ بھال کرتی ہیں وہ اردو میں بھی بات کرتی ہیں۔انگریزی میں بھی۔ان میں سے بعض تو پنجابی، بنگالی، پشتو اور فرانسیسی بھی بول لیتی ہیں۔ کمرے نہایت خوبصورت اور فرض شناس ہیں۔ بستر ایسے ہیں کہ لیٹیں تو فوراً نیند آ جاتی ہے۔

خوراک بھی شاندار ہے۔سنیک بار ہو کہ کافی شاپ...... دلکش ڈائننگ روم ہو کہ سب سے اوپر کی چھت پر جذبات انگیز چاندنی لاؤنج جہاں چاند ستاروں کا حسین منظر بھی ہوتا ہے اور موسیقی بھی...... مہمان کی مرضی ہے کہ کہیں بھی لطف اٹھائے۔

یہ مقام واقعی کچھ ہے اور اس نے دوسرے ہوٹلوں پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔اب وہ سب انٹر کانٹی نینٹل کے مقابلے کے لیے تگ و دو میں ہیں۔ جب ایک ٹیکسی ڈرائیور آپ کی منزل سن کر اپنے چہرے پر ایک شکن ڈال کر کہتا ہے "کونٹی نینٹل، ہاں بالکل سیدھا راستہ ہے۔" اس وقت آپ گھبرائیں نہیں۔ یہ صحیح ہے۔انہوں نے اس کا مخفف ڈھونڈ ھ لیا ہے۔تمام سڑکیں کونٹی نینٹل کو جاتی ہیں۔اس کے اخراجات نیویارک کے چھوٹے ہوٹلوں سے بھی بہت کم ہیں۔ پچاس روپے روزانہ اور شہر میں بہترین سروس...... مہمانوں کے لیے ایک تازہ پانی کا تیرنے کا تالاب ہے۔ پول سپروائزر انچارج بھی بڑی دلکش شخصیت ہے۔ڈی لکس سیلون، تحفوں کی دکانیں اور ایک مشرقی زیورات کی دکان بھی ہے۔ جو انتہائی خوبصورت اور معیاری ہیں لیکن ان کے نرخ اتنے زیادہ نہیں۔

ہوٹل میں گھومتے پھرتے آپ کو کبھی نقدی کی کمی محسوس نہیں ہوگی کیونکہ یہاں یونائیٹڈ بنک کا شاندار دفتر ہے اور حبیب بنک کا بھی...... اسی طرح پی آئی اے، پین امریکن اور لفتھانسا کے دفاتر بھی موجود ہیں جو آپ کو اس نیک زمین پر کسی بھی سمت لے جانے اور پھر واپس لانے کے لیے حاضر ہیں...... کہاں واپس لانے کے لیے؟ یقیناً کراچی انٹر کانٹی نینٹل میں۔

میٹروپول سے امریکہ کے سفارت خانے کا فاصلہ صرف پانچ منٹ کا ہے۔

عمارت نے کراچی جم خانہ کو گھیر رکھا ہے خوبصورت عمارت اس رنگ و روغن میں لپٹی چمک رہی ہے جو بکسلے پینٹس آف پاکستان کا عطیہ تھا۔کراچی جمخانہ سیّاحوں اور مقامی شہریوں دونوں کا ہردلعزیز کلب ہے۔ چیف ٹینس کوچ نور احمد کی ہمہ تن متوجہ نگاہوں کی نگرانی میں بے شمار لوگ ٹینس کھیلتے ہیں۔

اسی بلاک میں کے ایل ایم کا صدر دفتر ہے۔اس عمارت کی کھڑکی میں حسین و جمیل گڑیاں ہالینڈ کا مخصوص قومی لباس پہنے پرفضا منظر میں متحرک دکھائی دیتی ہیں۔

دوسرے ہوٹل، جو سیّاحوں میں مقبول ہیں اور جن کا کرایہ بہت کم ہے۔ سنٹرل، کولمبس، میرا میر، ایکسیلیئر، فاروق (جہاں لوگ مرغ کے تکے کھانے جاتے ہیں) نارتھ ویسٹرن، دی تاج،

ڈی لکس، برسٹل اور ٹوانہ ہاؤس ہیں۔ٹوانہ ہاؤس،ٹورسٹ ان (سیّاحوں کی سرائے) کے نام سے مشہور ہے۔کولمبس کے سوا، جس کے کمروں کا کرایہ پچیس روپے یومیہ سے شروع ہوتا ہے، باقی تمام ہوٹلوں میں پندرہ سے بیس روپے یومیہ معہ خوراک کے بدلے تسلی بخش رہائش مل جاتی ہے۔

علاوہ ازیں دس فضائی کمپنیوں کے بڑے بڑے دفاتر کا مرکز بھی کراچی میں ہے ان کمپنیوں کے نام ہیں، ایئر سیلون، ایسٹ افریقہ ایئر لائنز، ایران ایئر، عراقی ایئر ویز لمیٹڈ، جاپان ایئر لائنز (جال) کویت ایئر ویز اور متحدہ عرب ایئر لائنز۔ یہ وہ کمپنیاں ہیں جو لوگوں کو دنیا کے چاروں کونوں سے علی بابا کے اس ملک میں لاتی ہیں، کراچی ایئر ویز کلب سیّاحوں کے لیے مشہور تاریخی مقام موہنجوڈارو کے فضائی سفر کا باضابطہ انتظام کرتی ہے جس سے انسان ناہموار سڑک پر موٹر کے تھکا دینے والے سفر کی زحمت سے بچ جاتا ہے۔

امریکی سفارت خانے سے ایک بلاک پرے، حکومت پاکستان کا ٹورسٹ بیورو ہے۔ایک وجیہہ افسر، جو سیّاحوں کا خیر مقدم کرتا اور انہیں مفید مشورے دیتا ہے، اس دفتر کا انچارج ہے، اس کا ٹیلیفون نمبر 50119 ہے۔اس بیورو کے دو دفتر اور بھی ہیں۔ایک فضائی اڈے میں ہے، جو ان سیّاحوں کی مدد کرتا ہے جو ہوائی جہازوں کے ذریعے آتے ہیں، اس کا ٹیلیفون نمبر 49241 ہے، دوسرا دفتر ویسٹ وہارف میں واقع ہے جو ان مسافروں کی رہنمائی کرتا ہے جو بحری جہازوں کے ذریعے آتے ہیں، جس بلاک میں یہ بیورو ہے، اسی میں غلام رسول ٹیلر ماسٹر کی دکان ہے، جس کے بورڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نذیر محمد کا والد ہے، جو سارا دن آلتی پالتی مارے خواتین کے دلفریب ملبوسات سیتا رہتا ہے۔اس ملک میں ''فلاں ابن فلاں'' کہنے کا بہت رواج ہے، اس لحاظ سے نذیر محمد غلام رسول کا بیٹا ہے، یہ دکان ایک کھلی ہوئی کھڑکی لگتی ہے اور مقامی گائیڈوں اور ٹھگنے قد کے اخبار فروش لڑکوں کے جمع ہونے کی جگہ ہے، یہ لڑکے تازہ رسالے فروخت کرتے ہیں اور غیر سرکاری اطلاعات مفت مہیا کرتے ہیں، ابھی حال ہی میں نذیر محمد کے ہاں دسواں بچہ پیدا ہوا ہے، بیگم نذیر محمد کی حالت اچھی نہیں تھی، وہ قلت خون کے باعث کمزور ہو رہی تھی، میں نے نذیر محمد سے پوچھا ''تم اسے کھانے کو کیا دیتے ہو؟''

''صرف سیال چیزیں پینے کو دیتا ہوں'' اس نے جواب دیا

''لیکن یہ ناکافی ہیں'' میں نے کہا ''اسے دلیہ کھلایا کرو، پرانے فیشن کا دلیہ، جس میں ایک کچا انڈہ ملا ہوا ہو، اس کے کھانے سے اس کی صحت بحال ہو جائے گی۔''

اسے دلیے کا قائل کرنے میں کچھ دن لگ گئے، علاوہ ازیں میں نے اس کی بیوی کو اور بھی نفیس اور عمدہ چیزیں دیں، جن سے اس کی حالت سدھر گئی اور ایک مرتبہ پھر نذیر محمد میرا خوش باش و بے فکر ٹیلر ماسٹر بن گیا، وہ روایتی بحری قزاق کی طرح خوبصورت اور ایک مدبر کی طرح شائستہ تھا۔

جب اس نے اور اس کے بھائی نے ایک نیا فراک مجھے تحفے میں دیا تو میں ان کے احسان کے بوجھ تلے دب گئی، میں نے پوچھا ''تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟ میرے پاس درجنوں ملبوسات ہیں، مجھے اس کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے بچوں کو اس کی ضرورت ہے تم اس کپڑے سے اپنی ننھی منی بچیوں کے لیے کم از کم دو جوڑے تیار کر سکتے ہو۔''

اس نے سختی سے جواب دیا ''میم صاحب! آپ میری غیر ملکی دوست ہیں، مجھے ایسے دوست بہت پسند ہیں۔اس فراک کا کپڑا میرے بھائی نے اپنی چھوٹی سی دکان سے لا کر دیا تھا، ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ آپ کے لیے تحفہ خریدتے، میں نے اسے سی دیا ہے۔آپ کو کہیں سے خرید کر نہیں دیا بلکہ ہم نے خود تیار کیا ہے، اور کسی کو کچھ ادا نہیں کیا۔''

میں اس کی باتوں سے ازحد متاثر ہوئی، میرا غریب ٹیلر ماسٹر اور اس کا مفلس بھائی یہ سب کچھ میرے لیے کر رہے تھے، آخر میں نے انہیں خوش کرنے کے لیے یہ فراک لے لیا، ان کی دکان کے ساتھ والے مکان میں ہیئر ڈریسر ڈینس کی دکان ہے، اس دکان کی کھڑکی میں پھول کھلے ہیں۔عشق پیچاں کی بیل جتنی اس دن سرسبز و شاداب تھی، پہلے کبھی نہ تھی، اسی طرح سورج کی روشنی بھی ازحد چمکیلی تھی، میں اپنے نئے فراک کی خوشی میں اس دکان میں شیمپو کے لیے داخل ہو گئی۔

ڈینس کی چھوٹی سی دکان بڑی عجیب و غریب لیکن بڑی آرام دہ ہے، اس کی نشستوں کے عین سامنے ایک باغ ہے اور فضا میں کوئی اجنبیت نہیں، اس کا مالک جارج بڑا زندہ دل انسان ہے اور لڑکیوں کے بالوں کی اصلاح اور آرائش میں بڑی چابکدستی اور مہارت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ آپ شکستہ دل اور مغموم کیوں نہ ہوں، جارج کے مشاق ہاتھ لگتے ہی آپ خوش و خرم ہو جائیں گے اور اس کے سیلون سے تازہ دم ہو کر نکلیں گے، آپ کے بال چمکنے لگیں گے اور بالوں کے خم اپنے صحیح مقامات پر بیٹھ جائیں گے، اور جب آپ اس کی باتیں سنیں گے کہ کس طرح اس نے لندن کی

بہترین دکانوں میں کام کیا تو آپ کا دل باغ باغ ہو جائے گا۔

کراچی میں آپ کو ہر قسم کے ہیئر ڈریسر مل سکتے ہیں، مسلمان اور عیسائی، یہ ہر ہوٹل کے قرب و جوار میں موجود ہوتے ہیں۔ ایکسیلیٹر ہوٹل کے قریب ایک حسین چینی خاتون ہے، جس کا ہیر یانی ہے، وہ بال تراشنے اور ان کی آرائش کرنے میں ماہر ہے۔ اس کی چھوٹی سی دکان میں جو ایک حجام کی دکان کے عقب میں واقع ہے، ہمیشہ جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ میٹروپول ہوٹل کے عقب میں ایک اور سیلون ہے، جس کا مالک ایک نیک دل مسلمان یو۔ این۔ چارلی ہے، ایک اور ہیئر ڈریسر کا نام اچیئر ہے، جس کی دکان کا رخ گیری کی دکان کی طرف ہے جو ایک ڈالر سے کم اُجرت سے بال کاٹتا ہے۔

آرائش حسن کی بات چل نکلی ہے تو کراچی میں اس کے لیے سب کچھ موجود ہے۔ ایک سیلون بھی ہے جسے ایک جرمنی اور پیرس کے تربیت اور تعلیم یافتہ ماہر آرائش حسن اور فزیا تھراپسٹ چلاتے ہیں۔ وہ اپنی آرائشی تدابیر میں انسانی دلچسپی بھی شامل کر لیتے ہیں۔ اس جذباتی تاثر کے باعث آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ نے نیا جنم لیا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو حسین دکھائی دینے کے لیے اس کے ہاں جایئے، یہاں آپ کے لیے آرام کا پیغام ہے۔ سحر انگیز تراش خراش ظاہری طور پر حسن میں اضافہ کرتی ہے اور تھراپی کے ذریعے آپ کو آرام سکون بھی میسر آ جاتا ہے۔

یہ سب کچھ کیسے ہوتا ہے؟ ہاں یہ بہت اہم ہے۔ اس کی مالک مادام قیصر سلطانہ جو نہایت ہنس مکھ لیکن کم سخن نوجوان اور دلکش خاتون ہیں وہ آپ پر ذاتی توجہ دیتی ہیں اور آپ کو اپنے تیئں خوشدل محسوس کرنے پر اس وقت مجبور کرتی ہیں۔ جب آپ ایسا نہ کرنے پر تلے ہوتے ہیں۔ جب آپ سارے آرام دہ، اور انبساط بخش سلوک کا لطف اٹھا چکتے ہیں تو آپ کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک راز آپ ایک عمر جس کی تلاش میں رہے ہیں، وہ سچا ثابت ہوا۔ بیگم قیصر کو ایک محبوب بیوی اور تین خوبصورت بچوں کی ماں ہونے کی حیثیت سے زندگی کی جو خوشی حاصل ہے۔ اسے بھی وہ اپنے گاہکوں کے لیے وقف کر دیتی ہیں۔ اس سے انہیں اور خوشی ہوتی ہے۔

میں ایک پاکستانی خاتون، اور شادی شدہ یا غیر شادی شدہ سیاح خاتون سے عرض کروں گی کہ کوئی ایسا دن جس روز بہت زیادہ تھکن ہو اور آپ دل ہی دل میں کہہ رہی ہوں۔ ''بس اب لیٹنا چاہیے۔ کاش کوئی مجھے لٹا دے۔ میرے کندھے دبائے جو خریدا ہوا سامان اٹھا اٹھا کر تھک گئے ہیں۔ کوئی میرے پاؤں ایسے دبائے کہ وہ پھر درد نہ کریں۔ کوئی مجھے خوبصورت بنا دے۔ غرض وہ سب باتیں جو آپ کی تھکن بھی دور کر دیں۔ آپ تر و تازہ نظر آئیں۔ ہم میں سے تو اکثر کو رکشوں، ٹیکسیوں اور پیدل چل چل کر ایسے لمحات سے سابقہ پڑتا ہے ہم بالکل تھک ہار جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ کبھی ہماری طبیعت بحال نہیں ہوگی۔ فوراً ہم اپنے آپ کو بستر کے سپرد بھی نہیں کر سکتے کیونکہ ابھی بڑا کام پڑا ہوتا ہے۔ گھر کی مالکہ ہو تو اگلے کھانے کا فکر ہوتا ہے۔ مہمان ہو تو آئندہ سیر کی تمنا ہوتی ہے۔ اس وقت بال بچے چھوڑ کر پانی میں تیرنے یا ٹینس کھیلنے بھی نہیں جایا جا سکتا۔ ایسے لمحوں میں آپ وہی کریں، جو میں کرتی ہوں۔ آپ چپکے سے ڈائل 47639 نمبر پر گھمایئے یہ بیگم قیصر کا مختصر سا ادارہ ہے اس کا نام قیصرین ہے۔ فون پر بتایئے کہ آپ ان کے مرکز حسن میں آنا چاہتے ہیں یہ خوش اخلاق بیگم آپ کو فون پر ہی خوش آمدید کہیں گی اور آپ کی سہولت کے مطابق وقت دیں گی۔ اس وقت صرف آپ ہی ہوتے ہیں جس پر غور کیا جاتا ہے۔ آپ کے احساسات اور صبر بھی قابل غور ٹھہرتے ہیں میں نے اس کا باقاعدہ تجربہ کیا اور یہ واقعہ پیش خدمت ہے۔

میں سٹ پٹا گئی تھی۔ آج دھوپ بہت تیز تھی۔ میں نے کئی ایک خاص ملاقاتیں بھی کیں میں نے خریداری کی۔ ایک ایسے شخص سے بھی تلخ کلامی کی جس سے نہیں کرنا چاہیے تھی (کیا ہم سب اس بات کے مریض نہیں ہیں) مجھے یاد ہے کہ 3 بجے نیک دل بیگم صاحبہ نے مجھے بلا لیا۔ مجھے تمام کام چھوڑ دینے کے لیے کہا ان کی کار میں بیٹھتے ہی طبیعت پہلے کی نسبت زیادہ ہشاش بشاش ہوگئی ایک مرتبہ قیصرین کی رنگین اور پھولدار چار دیواری میں کپڑے اتار کر گرم حمام میں داخل ہوگئی۔ مجھ پر سکون بخش حرارت گرتی رہی اور مجھے غنودگی محسوس ہونے لگی۔ بیس منٹ بعد ایک خوش شکل سفید بالوں والی جرمن معاون مجھے تھراپی کے میز تک لے گئی۔ ایک ماں کی طرح میرے بالوں کو اس نے صاف ستھرے تولیوں سے صاف کیا، پھر بیگم کی ایک پاکستانی معاون نے اس میز کے تھراپی کے آلات، یعنی الف لیلوی گدے مجھ پر تہ کیے۔ اوپر نیچے وہ جا رہے تھے۔ اوپر نیچے اور آہستہ آہستہ سب درد اور تکلیف یوں دور ہو رہی تھی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ اف کتنا مزا آ رہا تھا میں تو وہیں ٹھہری رہتی وہیں سو جاتی اور وہیں رات بسر کرتی۔ لیکن صد حیف کہ یہ خوش منظر صرف آدھ گھنٹے میں بیت گیا۔

اس سے اگلا مرحلہ چہرے کے آرائش کا ہوتا ہے یہ بھی خوب ہے۔ پھر اسی طرح ان صوفوں میں سے کسی پر لیٹے ہوئے، آنکھوں پر پیڈ بندھے ہوئے چہرے پر مسلسل خوشبو کی بارش ہوتی رہتی ہے لیکن یوں لگتا ہے کہ محبت برس رہی ہے آپ ذرا سوچیں تو آپ کسی دور دراز دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ بیگم کی معاونین میں سے کوئی آتی ہے اور آپ کے چہرے کو گرم تولیوں کا لمس پہنچاتی ہے۔ یہ حرارت یہ سکون۔ آپ اپنے آپ کو بہشت میں محسوس کرتے ہیں اور گرم گرم تولیے یکے بعد دیگرے...... کس کافر کا یہاں سے اٹھنے کو دل چاہتا ہے بار بار یہی حظ اٹھانے کو جی چاہتا ہے۔ بیگم صاحبہ اپنے ماہر اور تربیت یافتہ ہاتھوں سے آپ کے لب و رخسار کو گرمئ حسن بخشتی ہے۔ ابروؤں کے نشتر اور تیز کر دیتی ہیں۔ جب یہ سحر انگیز عمل ختم ہوتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ سارے جسم کو ایک حرارت بخش غلاف پہنا دیا گیا ہے اس لمحے بھول جاتا ہے کہ کبھی کسی سے تلخ کلامی ہوئی تھی، کوئی درد، تکلیف یا پریشانی لاحق ہوئی تھی۔ آپ چند لمحے خاموشی سے بیٹھ جاتی ہیں اور دیکھتی ہیں۔ اس اثنا میں ایک اور معاون کسی دوسری خاتون گاہک کو ورزش کے کمرے، میں لے جا رہی ہوتی ہے پھر آپ سب چائے پیتی ہیں۔ دنیا کی ہر شے پیاری لگتی ہے اور آپ سب سے پیاری...... ذرا تصور کیجیے کہ یہ سب کچھ چند سکوں کے عوض مل جاتا ہے۔

جاتے وقت آپ یوں محسوس کرتی ہیں کہ کوئی خواب دیکھا تھا۔ آپ کی دلی مسرت اور انبساط کا یہ عالم ہوتا ہے جیسے آپ کا کوئی انعامی بانڈ نکل آیا ہے۔ یقیناً اس سیلون سے یہی کیفیت حاصل ہوتی ہے۔

کراچی شہر کی مٹر گشتی بھی ایک مہم ہے۔ الفنسٹن سٹریٹ، جو پاکستان کی پکاڈیلی سٹریٹ ہے، کی فضا پر میلے کا گمان ہوتا ہے جہاں چھ سے، ساٹھ سال کی عمر کے خوانچہ فروش ہر کونے پر کھڑے ہو کر موتیوں کے بنے ہوئے بٹن فروخت کرتے ہیں اس بازار کے خوش خلق تجار آپ کو اشارہ کر کے بلاتے ہیں اور پوچھتے ہیں "کیا آپ نفیس قالین خریدیں گے؟ خالص مشرقی مال ہے اندر تشریف لے آئیں" ان دکانوں میں سے ایک کا نام بخارا پیلس ہے، اس دکان کے اصلی مالک وہ لوگ تھے، جو مغل شہنشاہوں کے عہد میں قالین تیار کیا کرتے تھے۔ ان کے موجودہ قالین ہر کمرے اور گوشے کے لیے موزوں ہیں، کراچی میں آنے والے اکثر سیاح قالین خریدتے ہیں، دکاندار اتنے ہوشیار ہیں کہ وہ ان قالینوں کو بڑی احتیاط سے باندھ کر آپ کے وطن جانے والے جہاز میں لادنے کا انتظام بھی خود کرتے ہیں، خرید و فروخت کے لیے، سب سے پہلے آپ کو دو دروازوں والی گرینج ایجنسیز کی دکان پر رکنا ہوگا۔ یہاں آپ کو دنیا بھر کی کتابیں اور رسالے، اسٹیشنری، قلم، پاکستان کی یادگاریں اور تحائف دستیاب ہوں گے، ہر قسم کی گھڑیاں بھی ملیں گی اور ان کی مرمت بھی کرائی جا سکے گی، وہ کم از کم نیویارک ہیرلڈ ٹریبون کا یورپی ایڈیشن ہر روز فروخت کرتے ہیں تاکہ آپ سٹاک مارکیٹ کے بھاؤ معلوم کر سکیں، جو بمشکل 24 گھنٹے پرانے ہوتے ہیں۔ اس دکان کے عین سامنے کشمیر آرٹس شاپ ہے اس کی یہ خصوصیت ہے کہ یہاں اونٹ کی کھال کے لیمپوں سے لے کر ننھی منی گڑیاں تک مل سکتی ہیں۔

اسی راہ پر لندن واچ شاپ کی طرح جیولرز کی دکانیں ہیں جو مرمت کا کام بڑا عمدہ کرتی ہیں ان کے ہاں ایسے ٹائم پیس ہیں جو انہوں نے دور دراز مقامات سے فراہم کیے ہیں، جو قدیم اور جدید پرزوں سے مکمل کیے گئے ہیں اور جو بڑی دلکش ہیں، ان کے ہاں سونے چاندی کے نایاب تحائف ہیں جنہیں مشاق کاریگروں نے تیار کیا ہے۔ ان کے مقابلے میں سوئس واچ کمپنی ہے جو قریب ہی ہے۔ یہ بھی مرمت کا کام بہت عمدہ کرتی ہے، ان کے پاس مختلف براعظموں کی بنی ہوئی اشیا ہیں، ایسے کلاک ہیں جن میں رقص کا نظارہ پیش کیا گیا ہے اور موسیقی بجانے والے ڈبے لگے ہیں اور جنہیں بڑی ترتیب سے سجایا گیا ہے۔ یہ آغا خاں کے مخصوص گھڑی ساز ہیں۔

بازار کی دوسری جانب "آپٹیکو" کی دکان ہے، اس علاقے میں چشمہ سازی کی یہ مقبول دکان ہے، ان کی قیمتیں درمیانہ ہیں جن کے عوض وہ مصنوعی شیشے تیار کر کے آپ کی مرضی کا چشمہ تیار کر دیتے ہیں اور اگر آپ کا چشمہ گم ہو جائے تو ان کے ہاں ایک سند یافتہ چشمہ ساز ہے جو بلا معاوضہ آپ کی آنکھوں کا معائنہ کرتا ہے اور اگر آپ بدحواسی کی وجہ سے اپنا قلم کھو دیں تو ان کے شوکیس پارکر اور دیگر مشہور قلموں سے بھرے پڑے ہیں۔

عالمگیر ٹیکسٹائل ملز کا تیار کردہ لیڈی ہملٹن سِلک ان مقبول کپڑوں میں سے ایک ہے جسے پاکستان خواتین زیب تن کرتی ہیں، علاوہ ازیں نفیس اور باریک دوپٹے اور برقعے جن سے عورت کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے، یہ شہر کی سینکڑوں دکانوں سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ یہ ایسی اشیاء ہیں جنہیں سیاح اپنے وطن لے جا سکتے ہیں۔

وکٹوریہ روڈ پر سیاح اپوا کی دکان کا مال دیکھ کر خوشی سے جھومنے لگتے ہیں۔ چھوٹے اونٹوں

سے لے کر سونے، چاندی، پیتل اور ہاتھی دانت کی قیمتی اشیاء دیکھ کر وجد آ جاتا ہے اور جب وہ ریکس سینما کے قریب ایپائیل ایمپوریل میں پہنچتے ہیں تو ایک مرتبہ پھر خوشی سے باغ باغ ہو جاتے ہیں، یہاں انہیں خواتین کے ہینڈ بیگوں اور دوسرے نوادرات کے نمونے ملتے ہیں۔

ان دنوں وکٹوریہ روڈ پر صرف دلکشی ہی نہیں کھل رہی ہے۔ بلکہ اس میں بالکل ہی نئی چمک دمک ہے اور حقیقی معنوں میں ایک اول درجے کا خوبصورت ہوٹل اس کے دامن میں آ گیا ہے۔ یہ ان سیاحوں کے لیے مژدۂ جانفزا ہے جو لاکھ پتی نہیں ہیں۔ صرف پچیس روپے روزانہ پر آپ کو بالکل نیا کمرہ...... غسل خانے اور ناشتے کے ساتھ مل جاتا ہے۔ آپ کو اس کے علاوہ کچھ نہیں دینا پڑا۔ آپ کو یہاں ٹھہرنے کے لیے گراں خرچ کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کی آرائش ایئر کنڈیشننگ اور خدمت انتہائی طور پر گراں قدر ہے۔ سینک بار اور عمدہ عشائیہ گاہیں اور ایک بنک سب ایک ہی چھت تلے واقع ہیں اس کے علاوہ 102 کمرے ہیں جس میں چاہیے، رہیے۔ اسے ہوٹل جبیس کہتے ہیں۔ آپ اسے قطعاً نہیں بھولیں گے۔ شہر کے سب سے بہتر کاروباری مرکز کے عین درمیان میں۔ اس کے ساتھ ہی سارے بازار ہیں۔

یہیں بوہری بازار کی بغلی گلیوں میں، جو میٹروپول سے دس منٹ کے راستے پر واقع ہیں، امیر لوگوں اور غریبوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ کنگن اور چمکدار پتھروں سے مرصع سینڈل خریدنے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔

ایوا گارڈنر پاکستانی جوتے دیکھ کر ان کی اتنی گرویدہ ہو گئی تھی کہ اس کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے اپنے تمام دوستوں کو دینے کے لیے خمیدہ پنجے والی اور مرصع اور کشیدہ کاری والی جوتیوں کے 2,000 جوڑے خریدے تھے، بوہری بازار میں ہر قسم کا مال مل سکتا ہے، ایمپرس مارکیٹ بھی بڑی دلکش ہے، یہاں سے اشیائے خوردنی، کھانا، پھل اور گھریلو استعمال کی ہر چیز دستیاب ہو سکتی ہے۔ اسی علاقے میں کراچی کے تین چینی ریستوران واقع ہیں، جو اعلیٰ قسم کے ہیں، ان کے نام ہیں کینٹین، ساؤتھ چائنا کیفے اور اے۔ بی۔ سی، ہوٹلوں سے باہر علاقائی اور یورپی کھانے کے لیے شیزان اور زمین کے کافی ہاؤس مشہور ہیں۔

کراچی کے مناظر اور آوازیں بے شمار ہیں، حسین و جمیل فریئر ہال ہے جس میں قومی عجائب خانہ ہے، جہاں بدھ مت کی یادگاریں اور آرٹ کے ایسے نمونے رکھے ہیں جو 5,000 سال پرانے ہیں۔ انہیں دیکھ کر اس تہذیب و تمدن کا خیال آتا ہے، جس سے یہ خطہ مالا مال تھا جواب پاکستان کے نام سے موسوم ہے، بدھ کے ماننے والوں کے قیمتی جواہرات کو جو تین ہزار سال پرانے ہیں، دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے اور انہیں اس عجائب خانے میں بڑی اچھی طرح محفوظ کیا گیا ہے، قومی اسمبلی کی عمارت، جو برتر باغ کے قریب ہے، بڑی خوبصورت اور قابل دید ہے، چیف کورٹ کی شاندار عمارت سرخ پتھر سے تعمیر کی گئی ہے، بندر روڈ پر ڈنشا ہال ہے، جس میں ایک گھنٹہ گھر اور ایک اعلیٰ درجے کی لائبریری ہے۔ اس ہال میں پانچ سو افراد کی نشستوں کا انتظام کیا گیا ہے۔

وہ عمارت جس میں بیسویں صدی کی شاندار جھلک موجود ہے اور جس کا طرزِ عمارت غیر معمولی ہے، کراچی آرٹ کونسل ہے، جہاں ملکی اور غیر ملکی آرٹسٹ اپنی تصاویر کی نمائش کرتے ہیں، کراچی یونیورسٹی بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ یہ زمین کے ایک مرتفع قطعے پر 1279 ایکڑوں میں پھیلی ہوئی ہے، اس کے ساتھ پچیس کالجوں کا الحاق ہو چکا ہے، جن میں تمام تعلیمی مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ امریکی سفارت خانہ، جس کا ڈیزائن ایک امریکی ماہر تعمیرات نے تیار کیا تھا، ایک اور قابل دید مقام ہے، اسے کراچی کے دارالخلافہ کی حیثیت کھونے سے پہلے نئی چانسری کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا، یہ اس وقت تک چانسری رہے گا جب تک نیا دارالخلافہ پوری طرح آباد نہیں ہو جاتا، اس کے سفید اور سنہری رنگ گرم خطوں کی عکاسی کرتے ہیں اور یہ ایشیائی چمکیلی فضا سے بالکل ہم آہنگ ہیں، کراچی کا سینٹ پیٹرک کیتھڈرل جو 1881ء میں تعمیر ہوا تھا، صحیح گوتھک آرٹ کا نادر نمونہ ہے، ویٹکن لیگیشن کا گرجا جدید طرز تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ کلفٹن میں واقع ہے اور اس کا رخ سمندر کی جانب ہے۔ پاکستان ان معدودے چند مسلمان ممالک۔ میں سے ایک ہے جس میں ایک ویٹکن لیگیشن موجود ہے اور کراچی کو اس پر بڑا فخر ہے۔

اپنے پیارے قدیم اور درخشندہ کراچی کے پاس اور کیا ہے؟ یہاں گڑیاں بنانے والے بھی ہیں جو یہ کھلونے محبت کے لیے بناتے ہیں۔ پاکستان کی خواتین اور لڑکیاں لباس کے جو نمونے بھی پہنتی ہیں وہ سب کپڑے کی ان پیاری پیاری گڑیوں کو پہنائے جاتے ہیں۔ دلہن گڑیا چمکتے زیورات، نقاب، سلکی اور ریشمی کپڑوں میں ملبوس شلوار اور قمیض میں۔ سیاح انہیں بہت پسند کرتے ہیں انہیں خرید بھی لیتے ہیں۔ کیونکہ محض دو ڈالروں میں اسی ایشیائی سرزمین کی یہ یادگار ہاتھ لگ

جاتی ہے۔ کسی بھی مغربی گڑیا سے زیادہ دلکش ہوتی ہے یہ گڑیاں ملک بھر میں خواتین بلکہ مردوں کو بھی مسحور کرتی ہیں یہ پچاس سالہ احمد یار خاں جو کبھی ایک معزز اور رئیس باپ کے بیٹے تھے۔ زندگی کے نشیب وفراز نے انہیں ناداری کی حالت تک پہنچا دیا تو انہوں نے اپنے فنکارانہ ذوق کے سہارے گڑیاں بنانا شروع کر دیں اور اس میں کامیابی حاصل کی۔ اب یہ ماہر دستکار اپنی خوبصورت گڑیوں کے طفیل نہایت اچھی زندگی بسر کر رہا ہے ان گڑیوں کی ادھر ادھر نمائش بھی ہوتی رہتی ہے ملک کی بہترین دکانوں میں یہ گڑیاں فروخت کے لیے بھی موجود ہیں۔ لیجیے سب سے پہلے الفنسٹن سٹریٹ میں ہو آئیے۔

ہلکی پھلکی سیر کے لیے کسی سیاح کو کلفٹن کی سیر سے محروم نہ رہنا چاہیے۔ یہ شہر سے صرف تین میل دور ہے یہاں سرخ پتھر کی سیڑھیاں لائیڈز پائیر تعمیر کی گئی ہیں جو کلفٹن سے شروع ہو کر ساحل سمندر تک چلی جاتی ہیں، درمیان میں کہیں کہیں ایسے مقامات بھی آ جاتے ہیں، جو ہموار ہیں اور جہاں سیڑھیاں نہیں ہیں۔ جونہی آپ سمندر کے کنارے ریتلی زمین پر پہنچیں گے آپ کو خوانچے والوں کی ایک لمبی قطار نظر آئے گی جن کے خوانچوں میں ایسی خوبصورت اشیاء رکھی ہیں جو چمکیلے رنگین سیپ اور گھونگے سے تیار کی گئی ہیں، آپ ایک روپیہ خرچ کر کے (ذرا تصور کیجیے! روپیہ صرف 20 سینٹ کے برابر ہوتا ہے) سیپ کی بنی ہوئی چوڑیاں، بالیاں، ہار، ایش ٹرے اور چھوٹی چھوٹی بطخیں خرید سکتے ہیں، کلفٹن کے خوانچے والے سے سودا خریدنا بڑا نفع بخش ہوتا ہے۔ ایک اور سودا بھی ہے اور وہ ہے اونٹ کی سواری۔ میں ایک اونٹ پر سوار ہوئی تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ میں دنیا کی بلند ترین چوٹی پر پہنچ گئی ہوں اونٹ جھوم جھوم کر سمندر کی لہروں میں چلنے لگا اور میں بھی اس کے کوہان اور پٹھے کے درمیان بیٹھی جھومتی رہی، میں نے سوچا کہ اس طرح میں کسی اور سمندر میں جا نکلوں گی، لیکن اونٹ کے مالک نے آرام سے اونٹ سے کچھ کہا، وہ بیٹھ گیا اور میں فوراً نیچے اتر آئی۔ اس کے مالک نے جلدی جلدی اس کے ریگ آلودہ پاؤں سمندر کے پانی سے دھو ڈالے، جس سے میں بڑی حیران ہوئی۔

لائڈز پائیر کی بنیاد ایک خاتون نے رکھی تھی۔ نہایت پیاری خاتون جو آنریبل لیڈی لائیڈ تھیں۔ ہر سہ پہر کو جب سمندر سے خنک ہوا کلفٹن کی ریت سے گزرتی وہ وکٹوریہ میں سوار تیرگی پھیلنے سے پہلے پہلے ایک چکر لگاتی تھیں۔ سمندر کو جانیوالی راہ پتھریلی تھی اور کہیں بھی ہموار نہیں تھی۔ پانی تک فاصلہ بھی بہت طویل تھا۔ اپنی اس سیر کے دوران لیڈی لائیڈ کو ایک معزز پارسی رئیس سے ملنے کا اتفاق ہوتا جن کا نام سر جہانگیر ہرمز جی کوٹھاری تھا وہ دونوں جلد ہی گہرے دوست بن گئے۔ کوٹھاری صاحب سمندر کے قریب ایک چھوٹی سی پہاڑی پر تعمیر شدہ شاندار بنگلہ میں رہتے تھے۔ لیڈی لائیڈ اور سر جہانگیر اس بنگلے کی بالکونیوں میں چائے پیتے۔ یہاں ہوا کا بہت زور ہوتا تھا۔ ایک دن دونوں یہیں بیٹھے تھے۔ لیڈی لائیڈ پتھریلے راستہ پر سینکڑوں لوگوں کو بدقت چلتے دیکھ رہی تھیں، کہ پتھروں کی نوک سے ان کے پاؤں ضرور زخمی ہوتے ہوں گے اس دلدوز نظارے کے بعد انہوں نے سر جہانگیر سے کہا کہ اگر یہاں باقاعدہ سڑک ہو تو ان بے چارے بے شمار لوگوں کو تکلیف نہ ہو جو یہاں تازہ ہوا کی تلاش میں آتے ہیں جنہیں اتنی توفیق نہیں کہ سمندر کے نزدیک گھر بنائیں۔

قابل احترام پارسی نے لیڈی لائیڈ کی بات مان لی اور اب اس فکر میں تھے کہ یہ سب کچھ کیسے ہو۔ لیڈی لائیڈ نے جہانگیر کو یہ سمجھایا کہ صرف ایک pir کی ضرورت ہے جو نیچے سمندر تک جائے۔ یہ بہت بڑی بات ہو گی اور ان کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہو جائے گا۔ سر جہانگیر کو یہ تجویز پسند آ گئی اس نے یہ pir تعمیر کروا دی لیکن اپنے نام کی بجائے اپنی دوست کے نام پر۔ عوام کے لیے یہ راہ 23 مارچ 1921ء کو کھول دی گئی۔ کلفٹن کے ساحل کو جاتے پیارے اور ابدی راستے پر ایک کتبے سے سیاح یہ الفاظ پڑھ سکتے ہیں...... لیڈی لائیڈ pir

لیڈی لائیڈ کی تجویز سے متاثر ہو کر یہ pir ار پویلین 3 لاکھ روپوں کی لاگت سے جے۔ ایچ۔ کوٹھاری۔ او۔ بی۔ ای نے تعمیر کروایا اور پھر کراچی کے عوام کی نذر کر دیا گیا۔ یہ تحفہ سر جہانگیر کی سخاوت اور عوامی جذبے سے عبارت ہے۔

آج ہر شخص اس سرخ جودھپوری پتھر سے تعمیر کردہ pir کا لطف اٹھا سکتا ہے جو سیدھا نرم ریت کے ٹیلوں کی طرف لے جاتا ہے۔

اونٹ ایک ایسا حیوان ہے جو صدیوں سے تاریخ میں اپنا مقام پیدا کر چکا ہے، لیکن 1961ء میں بشیر شتربان کے اونٹ نے ایک مرتبہ پھر اپنا مقام حاصل کیا۔ امریکہ کے نائب صدر لنڈن جانسن جب پاکستان کے دورے پر آئے تو یہ شریف انسان کھسیانی ہنسی والے شتربان بشیر سے چند باتیں کرنے کے لیے رک گیا۔ شتربان اسے اتنا پسند آیا کہ اس نے اسے بطور مہمان امریکہ

آنے کی دعوت دے دی، چند ماہ بعد بشیر شتربان بڑے شاندار طریقے سے اپنے ملک سے روانہ ہوا تاکہ میرے ملک کی الف لیلوی مہم سے مسرور ہو، وہاں اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ امریکی بشیر سے بڑے متاثر ہوئے، اس کی تعریف وتوصیف اور عاقلانہ تقریر نے تمام دلوں کو موہ لیا۔ جب وہ کراچی واپس آیا تو اس کی بڑی شہرت ہوئی، جو اس کا جائز حق تھا، آج کل متبسم بشیر پھر گاڑی بانی کا دھندا کرتا ہے، لیکن وہ اونٹ جس کی بدولت وہ اتنا مشہور ہوا اب خاندان کے ایک رکن کی حیثیت سے آرام کر رہا ہے، جب مسز کینیڈی کراچی آئیں تو آپ نے بشیر سے ملنے کی خواہش کی، اور انہوں نے ایوان صدر کی ایک گراؤنڈ میں بشیر کے مشہور اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہو کر سیر کی۔

ان چیزوں کے علاوہ کراچی میں اور کیا ہے؟ اس میں سٹیٹ بنک کی بلند اور پرشکوہ عمارت ہے، اس کی دیواریں مقامی سفید پتھر سے تعمیر کی گئی ہیں، اور اس کے کمروں کی منقش لکڑی مشرقی پاکستان سے آئی ہے۔ سیاح اس کی سیر اسی جوش وخروش سے کرتے ہیں۔ جس طرح وہ نیویارک کے ایمپائر سٹیٹ بنک کی عمارت کی سیر کرتے ہیں۔

ہیوک روڈ پر واقع ایوان صدر فن تعمیر کا شاندار نمونہ ہے۔ یہ عمارت پاکستان کو برطانیہ سے وراثت میں ملی ہے، پہلے پہل یہ سابق سندھ کے گورنر کی سرکاری رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی، آزادی کے بعد یہ حسین وجمیل ایوان قوم کے باپ قائداعظم کی رہائش گاہ بن گیا۔ اس کے گرداگرد بڑے بڑے باغات ہیں، جن میں سرسبز وشاداب قطعے ہیں، جہاں صدر غیر ملکی مشاہیر کے اعزاز میں استقبالیہ دعوتیں منعقد کرتے ہیں۔

کراچی میں کئی پرانی اور نئی مساجد ہیں۔ سیکرٹریٹ کی مسجد خضرا مشہور ہے۔ اس میں بیک وقت پانچ سو نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں۔

ایک جگہ سینڈ سپٹ ہے، جہاں خشکی یا سمندر کے راستے جاتے ہیں، اس کے کنارے ڈھلوان ہیں، یہ مقام تیراکوں کی جنت ہے، ساحل سمندر پر آراستہ پیراستہ جھونپڑیاں تعمیر کی گئی ہیں جہاں وہ لوگ ٹھہرتے ہیں جو اس جگہ رات بسر کرنا چاہیں، اس سے آگے ہاکس بے میں لہریں اٹھ اٹھ کر آسمان سے باتیں کرنا چاہتی ہیں، یہاں کا ہلال نما ساحل تیرنے کے لیے سہولتیں فراہم کرتا ہے۔

جزیرہ منوہڑہ، جس کا لائٹ ہاؤس بڑا جاذب نظر ہے، کراچی کی بندرگاہ سے تھوڑی دور ہے، یہاں کشتی کے ذریعے پہنچا جاتا ہے، اس پر کھڑے ہو کر بحیرہ عرب کا نظارہ بڑا دلکش دکھائی دیتا ہے، منگھوپیر جائیں تو اس کی فضا میں گندھک کی بو رچی بسی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ آپ جس وقت چاہیں یہاں گندھک والے پانی سے غسل کر سکتے ہیں، منگھوپیر میں ایک اور بھی دلکشی ہے۔ یہاں موٹے تازے مگرمچھ ہیں، جنہیں سیاح کھانے کو اتنا کچھ دیتے ہیں کہ ان سے ہلا نہیں جاتا۔ ان مقامات پر جن کا ذکر کیا گیا ہے، سمندر کی سیر اور مچھلی کا شکار کھیلا جا سکتا ہے۔

بندمراد کے چھوٹے سے گاؤں میں، جس میں سیاحوں کے لیے نہایت عمدہ ڈاک بنگلہ موجود ہے، آپ مرغابی کا شکار کھیل سکتے ہیں اور شکار کیے ہوئے جانور واپس ہوٹل میں پکوانے کے لیے لا سکتے ہیں۔

کراچی میں دو ایسے ہوٹل ہیں جنہیں میٹروپول کے مالک چلاتے ہیں اور جن میں آپ شہر کے پرہجوم بازاروں سے دور، ایک ہفتہ عشرہ ٹھہر سکتے ہیں، ان میں سے ایک ہوٹل فضائی اڈے پر ہے جو کراچی کے بین الاقوامی فضائی اڈے کے میدان کے اوپر واقع ہے۔ اس کی چھت پر بیٹھ کر آپ کھانا کھا سکتے ہیں، رقص وسرود سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں، ستاروں اور ہوائی جہازوں کے آنے کا نظارہ کر سکتے ہیں اور یہ سب کچھ آپ نیلے آسمان کے نیچے، شوروغوغا سے الگ اور دور رہ کر حاصل کر سکتے ہیں۔ دوسرا ہوٹل دو میل پرے گرینڈ ہوٹل ملیر ہے۔ یہ بھی ایسی جگہ ہے جہاں ضرور جانا چاہیے۔ یہاں تیرنے کے لیے ایک تالاب ہے، جس میں تازہ پانی ہوتا ہے، ایک تالاب بچوں کے لیے بھی موجود ہے، یہاں سرسبز وشاداب قطعات زمین ہیں، یہاں آپ آرام کر سکتے ہیں۔

کراچی کے سفری ایجنٹ بڑے تیز طرار ہوتے ہیں، کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ آپ کے سامنے کوئی نہ کوئی نئی چیز پیش کریں اور یہ حقیقت ہے کہ جس گرمجوشی سے وہ یہ پیش کش کرتے ہیں، اسے دیکھ کر بہت سے سیاح سیروسیاحت کو وسیع کر لیتے ہیں۔ ان میں سے قدیم ترین کاکس اینڈ کنگ کی فرم ہے جو 1962ء سے کراچی میں سفر اور سیروسیاحت کا انتظام کرتی ہے۔ وہ ہر مسافر کا خیال رکھتی ہے۔ اس کے رہنما آغاز سفر سے ہی سیاح کے ہمرکاب رہتے ہیں، دوسری کمپنیاں جو مشہور ہیں ان میں سے ایک امریکن ایکسپریس کمپنی ورلڈ وائڈ سروس

ہے، جس کے پرکشش افسر میکلوڈ روڈ پر ہمیشہ مستعد رہتے ہیں ان کمپنیوں کا مقابلہ فضائی امدادی کمپنیوں سے ہوتا ہے جو قریب ہی واقع ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ امریکی اور برطانوی سیاحوں کے علاوہ دوسرے براعظموں کے سیاحوں کی جماعتوں کی سیر وتفریح کا بندوبست کرتی ہیں، یونیورسل ایکسپریس نے اس وقت کام شروع کیا تھا جب پاکستان نے آزادی حاصل کی تھی، سیاحوں کو سیر وتفریح کرانے میں ان کی شہرت مسلمہ ہے، اس کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ ان کے جو رہنما سیاحوں کے ساتھ رہتے ہیں وہ بڑی اچھی طرح اپنے فرائض بجا لاتے ہیں۔ دوسرے ایجنٹوں کے نام ٹریولوگ، یونیورسل ایکسپریس، گلوب ٹریول اور خیبر ٹریولز ہیں۔ نئی ایجنسی سکائی لائنڈ ٹریولز اپنے نام کی نسبت سے خوب کام کرتی ہے۔ ان کی حد آسمان تک ہے اور اس ایجنسی کا نوجوان اور ترقی پسند ناظم ہر وقت نئے نئے پرجوش سفروں کے منصوبے سوچتا رہتا ہے۔

اگر آپ دنیا کے سات سمندروں میں سے کسی ایک کی سیر کرنا چاہتے ہیں، تو آپ اس سیر کا آغاز کراچی سے کر سکتے ہیں۔ یہ شہر جہازی ایجنٹوں سے بھرا پڑا ہے۔ زیادہ مشہور کمپنیاں یہ ہیں، امریکن پریذیڈنٹ لائنز، لائڈ ٹرانسٹینو، پی اینڈ او اور رینٹ لائنز، ان کے علاوہ بیشمار کمپنیاں اور ہیں، شہر میں مقامی نقل وحرکت بڑی کم خرچ ہے اور اس کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک آرام دہ اور سست رفتار سواری قدیم وضع کی گھوڑا گاڑی وکٹوریہ ہے، جس کا کرایہ ایک روپیہ فی میل ہے، ٹیکسی کا کرایہ بھی ایک روپیہ فی میل (دس منٹ) ہے، اور دلچسپ سواری رکشا کا کرایہ چار آنے فی میل ہے جو ہمارے سکے نکل کے برابر ہے۔ بخشیش دینا آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔ ایک روپیہ خرچ کر کے آپ کراچی کے عالیشان چڑیا گھر، ریس کورس (گھوڑ دوڑ ہر بدھ اور اتوار کو ہوتی ہے) یا گاندھی گارڈن جا سکتے ہیں، کراچی میں آپ ایک لکھ پتی کا بجرا بھی کرائے پر حاصل کر سکتے ہیں، اس کا نام سی دیو ہے، یہ لمبے یا چھوٹے سفر کے لیے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ٹیلیفون نمبر ہے 50320 اس سے آپ کو مطلوبہ معلومات حاصل ہو جائیں گی۔

کراچی کے تجارتی مرکز میں خوبصورت فلک بوس عمارتیں ہیں جو نیک دل لوگوں کی یاد میں تعمیر کی گئیں۔ 1953ء میں ایک بہت بڑی کاروباری شخصیت امیر علی فینسی سے ان کے روحانی پیشوا آغا خان نے کہا کہ اگر میکلوڈ روڈ پر دفتر کے لیے ایک بہترین عمارت تعمیر کی جائے تو یہ شہر کے لیے نہایت اہم ہوگا اس کے لیے یہ بھی تجویز ہوا کہ یہ عمارت امیر علی فینسی صاحب کی زیر نگرانی کمپنیوں میں سے ایک نیو جوبلی انشورنس کمپنی کے نام پر ہوگی۔

1959ء کے دوران نیو جوبلی انشورنس ہاؤس نے اپنے دروازے وا کر دیئے اب پاکستان کی بعض اہم ترین فرموں کے دفاتر اس عمارت میں ہیں۔ خود امیر علی فینسی صاحب کی انڈسٹریل مینجمنٹ کا دفتر بھی یہاں ہے جو ملک کی کاروباری مہمات کی ایک بڑی تعداد کو کنٹرول کرتی ہے جس میں کراچی گیس کمپنی بھی ہے اور سٹیل کارپوریشن آف پاکستان لمیٹڈ بھی۔ آج کل کے معیار کے مطابق فینسی صاحب ابھی نوجوان ہی ہیں اور وہ ہر وقت ایک جواں سال شخص کی طرح کام میں مصروف رہتے ہیں۔ ایک ہفتے وہ یورپ میں پاکستان کے لیے بہتر تجارتی امکانات پیدا کر رہے ہوتے ہیں۔ دوسرے ہفتے وہ امریکہ میں ملتے ہیں یا جاپان میں ہوتے ہیں جہاں اپنے اور دفتری امور کی نگہداشت کرتے ہیں یا پھر اپنے وسیع دفتر میں ہوتے ہیں وہ کبھی ایک ساعت بھی ضائع نہیں کرتے کیونکہ وہ ہمیشہ مستقبل کے پروگرام بناتے رہتے ہیں جن سے ان کے اپنے ہزاروں ملازمین بالخصوص اور اپنے ہموطنوں کا بالعموم معیار زندگی بلند ہو سکے۔ اس کا اپنا قریبی عملہ اپنی اچھی پوزیشن کے لحاظ سے پوری آسائشیں حاصل کرتا ہے۔

ملک میں زیادہ خوشحالی اور مستحکم معیشت کے لیے فینسی صاحب کے نزدیک مضبوط متوسط طبقہ نہایت ضروری ہے اس مقصد کے حصول اور معیار زندگی بلند کرنے کے لیے وہ چھوٹے آدمیوں کی مدد کرنے کے قائل ہیں چھوٹے آدمیوں کو قرضہ دینے کے لیے بینکنگ کے نظام کو بڑھانے کے لیے بڑی مساعی کی ہیں ان کا ایمان ہے کہ اگر یہ قرضے ملنے لگ گئے تو پاکستان کے کم آمدنی والے لوگوں کو موقع ملے گا کہ وہ اپنی چھوٹی دکانوں، کیفوں اور تجارتی مہموں کو کامیابی سے چلا سکیں۔ دوسرے انسانی منصوبوں کے علاوہ یہ سنجیدہ اور خاموش طبع کاروباری شخصیت تگ ودو کرتے نوجوانوں کی ترقی کے لیے ذاتی توجہ صرف کرتی ہے۔

ان کے روحانی پیشوا آغا خان تعلیم کو نہایت اہم ضرورت خیال کرتے ہیں اس لیے فینسی صاحب اسماعیلی بھائیوں کی تعلیم میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ اس دلچسپی کے علاوہ ایک ادارہ فینسی فاؤنڈیشن کے نام سے قائم ہے جو پاکستان کے ہر طبقے کے مستحق طلبہ کو خواہ وہ اسماعیلی ہوں کہ نہ...... مالی امداد اور وظائف دیتا ہے۔

ہز ہائی نس پرنس کریم آغا خان اس ملک میں کئی مرتبہ آ چکے ہیں گزشتہ بار آئے تو وہ اسی

خاندان کے مہمان تھے۔ امیر علی پاکستان میں اسماعیلی فیڈرل کونسل کے صدر اور آغا خان کے وزیر ہیں۔ یہ اعزاز ان کی قیادت اور معاشرہ کے مسائل کی سوجھ بوجھ کے باعث خود آغا خان نے عطا کیا تھا۔

مسٹر امیر علی فینسی پیدائشی قائد ہیں۔ وہ کئی نمایاں کمپنیوں میں ڈائریکٹر اور چیئرمین ہیں وہ ایک ادارے پاکستان سروسز لمیٹڈ کے ڈائریکٹر بھی ہیں یہ ادارہ پاکستان کے جدید ترین ہوٹلوں کا انتظام سنبھالے ہوئے ہے۔ تجارت اور صنعت کے مختلف شعبوں میں ان کا اثر نمایاں ہے اور تیل صاف کرنے کی صنعت اور گیس سے لے کر بینکنگ اور انشورنس تک ان کی بات ہر جگہ مانی جاتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے...... کہ اپنے خاندان کو نظر انداز کیے بغیر ایک مصروف آدمی اپنے فرائض سے کیسے عہدہ برآ ہو سکتا ہے ان کے بڑے فرزند شوکت اپنے والد کے نقش قدم پر چل رہے ہیں ان کے خیالات بڑے روشن ہیں اور انہیں اپنے گھرانے پر فخر ہے کہ انہوں نے اس میں آنکھ کھولی۔

فینسی خاندان کی طرح کئی دوسرے خاندانوں نے اپنی مساعی سے اپنے وطن کے نام پر جو کامیابیاں حاصل کی ہیں انہوں نے پاکستان کا نام بلند کر دیا ہے۔

کراچی کے صنعتی قلب میں، جو ایس۔ آئی۔ ٹی۔ ای کے وسیع و عریض علاقے میں واقع ہے، سیر و تفریح کا جو انتظام بڑے بڑے کارخانوں کی انتظامیہ نے کر رکھا ہے وہ بہت خوشگوار ہے۔ اس علاقے کی سیر کرنے والا یہ معلوم کر سکتا ہے کہ پیداوار کتنی ہے۔ شہر میں کیا کچھ تیار کیا جاتا ہے، اسے کس قدر درآمد کرنا پڑتا ہے اور اس صنعتی علاقے سے کس قدر برآمد کیا جاتا ہے، آپ میری طرح نیوزی لینڈ جا کر بالوں کا ایک برش اٹھائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ پاکستان کا تیار کردہ ہے، اس شہر میں دوا سازی کی فیکٹریاں ہیں، ٹیکسٹائل ملز ہیں اور ایسے کارخانے ہیں جو ضرورت کی ہر شے تیار کرتے ہیں، پرشکوہ ولیکا ملز میں مشینوں سے ایک ملین سے زیادہ جرابوں کے جوڑے ہر سال تیار کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ فرم اپنے اونی کمبلوں، سوتی کپڑے، کمخواب اور ریشمی کپڑے کے لیے مشہور ہے۔

پاکستان میں کسی جگہ بھی گھومنے نکل جائیے، ہر جگہ بکسلے پینٹس کا سائن بورڈ سب سے یہ کہتا دکھائی دے گا کہ اسے استعمال کریں۔

یہ ایک اچھی بات ہے کیونکہ ہم رنگ و روغن کے بغیر رہ بھی تو نہیں سکتے۔ یہ بے جان چیزوں

کی زندگی اور چمک ہے ہم دلکش رنگ والی چیزوں کے لیے بیتابی سے ہاتھ پھیلا دیتے ہیں۔ یہیں پاکستان کی اس سب سے پہلی پینٹس کمپنی کی ضرورت پڑتی ہے۔

تقسیم کے بالکل ایک سال بعد جب ابھی ملک بے شمار قلتوں سے دو چار تھا۔ خان کے خاندان کو بھی اس قلت کا احساس تھا۔ پاپا رحیم بخش خان نے اپنا پہلا پلانٹ نصب کیا درحقیقت یہ پاکستان کی پہلی پینٹ فیکٹری تھی جو سندھ انڈسٹریل ٹریڈنگ اسٹیٹس کے علاقے میں بکسلے پینٹس ورکس کے نام سے قائم کی گئی۔ کچھ عرصہ کام اس قدر تسلی بخش نہیں تھا۔ لیکن سخت محنت، ایک پیاری بیوی اور بچوں کے پاس ہر رات کو گھر آنے کے معمول کے ساتھ رحیم بخش نے اس منصوبے میں کامیابی حاصل کر ہی لی اور 1954ء میں دوسرے پلانٹ کی بنیاد رکھ دی اور پھر 1956ء میں مشرقی پاکستان میں چٹاگانگ میں ایک اور پلانٹ نصب کیا گیا۔

بہت سی بیرونی فرمیں بھی میدان میں تھیں لیکن بخش خان ان کے مقابلے میں نہ صرف سبقت لے گئے بلکہ پاکستان کے لیے کثیر مقدار میں زرمبادلہ بھی کمایا۔ اب اس فرم میں انڈونیشیا سوڈان، گھانا، نائیجیریا، میرالیون سے طلبہ فرم کے وظائف پر رنگ و روغن کی تکنیک کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

خان کے پانچوں لڑکے بھی بڑے ہو کر اسی کاروبار میں شامل ہو گئے چوتھے لڑکے نے جو بیرسٹر ایٹ لا ہے، اپنے قانونی علم کو خاندان کے لیے وقف کیا ہوا ہے اس طرح کاروبار کے قانونی پہلو کے خلا کو پُر کر کے اس نے اپنے والد کو موقع بہم پہنچایا ہے کہ وہ پینٹ کی برآمد پر پوری توجہ دے سکیں۔

بکسلے فرم کے ہاں رنگ و روغن کی تحقیقات کے بارے میں بہترین ماہرین کا گروہ کام کر رہا ہے ان کی لیبارٹری بے حد شاندار اور سب سے وسیع اور تکنیکی اعتبار سے ہر لحاظ سے مکمل ہے اس کے آلات و تنصیبات بلاشبہ اس علاقے میں بے مثال ہیں یہی بات ان کی مشینری پر بھی صادق آتی ہے قدرتی بات ہے کہ اس ساری کامیابی کے لیے باخبر ماہرین فن کی ضرورت تھی۔ چنانچہ فرم نے ایک قدم اور اٹھایا اور کیمیا دانوں کو اس فن میں مزید تربیت دی۔ ان کا دوسرا بیٹا بکسلے پینٹ کے ان تکنیکی نکات اور فن کو لے کر بیروت گیا جہاں وہ اپنے ماہرین کی مدد سے رنگ و روغن کا ایک کارخانہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگلی مرتبہ جب میں وہاں جاؤں گی تو

پھر بکسلے پینٹ کا وہی مانوس نشان میرا اسی طرح خیر مقدم کرے گا۔

بہر کیف جس بات پر ان لوگوں کو بہت زیادہ ناز ہے وہ یہ کہ ان کے تیار کردہ روغن دنیا میں کسی بھی جگہ کے تیار کردہ روغنوں سے کسی طرح کم نہیں اور یہ ساری کامیابی بیرونی فنی امداد سے قطعاً بے نیاز رہ کر حاصل ہوئی ہے۔ ایک ترقی پذیر ملک کے لیے یہ ایک شاندار کامیابی ہے۔

داؤد پلانٹس میں تین ہزار سے زیادہ آدمی کام کرتے ہیں، جو شہد کی مکھیوں کی طرح اپنے کام میں لگے رہتے ہیں اور ایسا سوتی کپڑا تیار کرتے ہیں۔ جو مصر اور مانچسٹر کے کپڑے کا مقابلہ کرتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں کرنافلی پیپر ملز کے علاوہ اس کمپنی کی کئی اور ٹیکسٹائل ملز بھی ہیں۔ ایچ اینڈ ایم سلک ملز میں نایاب نمونوں کی بھڑکیلی ساڑھیاں تیار ہوتی ہیں، ان کے تیار کردہ کپڑے جن کے نام ٹونگل ٹشو اور مون لائٹ ہیں بہت مشہور مقبول ہیں کریم سلک ملز نفیس دوپٹے تیار کرتی ہے جو دیکھنے میں اتنے باریک ہیں کہ اوڑھنے والی پر جادو کر دیتے ہیں دوسری مشہور فیکٹریاں بوانی والکن ٹیکسٹائل ملز، حسین ملز، حبیب ملز وغیرہ ہیں۔ ان سب کے مالکان کراچی کے باشندے ہیں جب آپ ان ملوں کی سیر کر کے باہر آئیں گے تو آپ کے ہاتھوں میں کپڑے کے نمونے ہوں گے، جو آپ کو مفت نذر کیے جائیں گے، مالکان بڑے فیاض واقع ہوئے ہیں۔

ان فیکٹریوں کا تیار کردہ کپڑا زیادہ تر الفنسٹن سٹریٹ میں فروخت ہوتا ہے جہاں خواتین کے ملبوسات تیار کرانے والے رشید نامی درزی کی ایک چھوٹی سی دکان ہے جس میں کئی کاریگر بیٹھے ہیں جو کراچی کے امراء اور فلمی ستاروں کے لیے ملبوسات تیار کرتے ہیں۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ رشید کی یہ شہرت محض اس لیے ہے کہ وہ شہر کے ازحد مشہور پارچہ فروش جلال الدین کی دکان میں بیٹھا ہے، جلال دین کی دکان میں طلائی...... اور دوسرے غیر معمولی رنگوں کی کئی قسم کی بروکیڈ موجود ہے۔ ایسی بروکیڈ جو آپ کو صرف کسی ملکہ کے محل میں نظر آ سکتی ہے۔ کراچی کے باشندے اور سیاح اپنی پسند کی بروکیڈ خریدتے ہیں، رشید درزی اس بروکیڈ کو دیدہ زیب لباس میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ خواتین اس کے تیار کردہ ملبوسات کو دیکھ کر مسحور ہو جاتی ہیں۔ ذرا تصور کیجیے، اگر آپ رشید سے اپنا گاؤن تیار کروائیں، تو آپ لاف زنی کر سکتے ہیں کہ یہ ''ساختہ کراچی'' ہے۔ باقی رہی اس کی قیمت تو یہ لندن یا نیویارک کے مقابلے میں صفر کے برابر ہے۔

ہر روز صبح سویرے دو مشہور انگریزی اخبارات کراچی سے شائع ہوتے ہیں، ایک کا نام

مارننگ نیوز اور دوسرے کا ڈان ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے اخبارات ہیں جو پاکستان کی ہر زبان میں شائع ہوتے ہیں اور ہر قسم کے رسائل بھی، سیاح اگر چاہیں تو وطن واپس جانے سے پہلے کراچی میں اپنے نام کے ملاقاتی کارڈ بھی چھپوا سکتے ہیں۔ ساؤتھ نیپئر روڈ پر واقع چنارا پرنٹنگ پریس سے آپ ایک سو کارڈ حاصل کر سکتے ہیں، جن کا ڈیزائن اور طباعت چوبیس گھنٹوں کے اندر مکمل ہو جاتی ہے اور جب انہیں آپ کے لیے کاغذ میں باندھا جاتا ہے تو آپ کو گنے کے رس کا ایک گلاس بھی پیش کیا جاتا ہے۔ کراچی کے لوگوں کی مہماں نوازی کی کوئی حد نہیں۔

دنیا کے سب سے بڑے اسلامی ملک کے شہری ہونے کی وجہ سے یہاں کے باشندے قدرتی مفاہمت کے جذبے سے مالا مال ہیں۔ آپ ان کے درمیان ایک غیر ملکی اور اجنبی ہونے کی وجہ سے ایک خاص شخصیت کے مالک بن جاتے ہیں۔ جس کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو وطن ہی میں سمجھتا ہے۔ یقین کیجیے آپ جھنجھلا کر اپنے تئیں پھاڑ کھائیں گے جب آپ دیکھیں گے کہ آپ کے منہ سے بار بار یہی نکل رہا ہے ''جب میں کراچی میں تھا تو......''

جب آپ علی بابا کے اس ملک سے خریدے ہوئے تحائف کے بنڈل کھول کر اپنے کمرے کے آتشدان یا دیگر مقامات پر رکھیں گے تو کراچی کے قیام کی یاد عود کر آئے گی اور آپ کی زندگی کے روزمرہ چکر میں ایک گم گشتہ روشنی کا اضافہ کر دے گی۔

تاریخی ٹھٹھہ

مغربی پاکستان میں کراچی سے چل کر سیاح کے راستے میں دوسرا مقام ٹھٹھہ آتا ہے جو اس سے کہیں زیادہ پیش کرتا ہے جس کی اس کے خاموش مقامات سے توقع ہے۔ اس کے گاؤں میں بے شمار صحت مند اور خوش لوگ رہتے ہیں، اس کی جھیلیں مچھلیوں سے بھری ہوئی ہیں اور کنول دھوپ میں جھومتے رہتے ہیں۔ شہر کی زندگی پر سکون اور سادہ ہے۔ اس کی شہرت ان لوگوں کی وجہ سے ہے جو عرصہ ہوا مر چکے ہیں اور جن کے مقبرے اور ان کے گردونواح انتہائی خوبصورتی اور لازوال شان کی یادگاریں ہیں۔ ٹھٹھہ پاکستان کے ان مقامات میں سے ہے جو ہر سیاح کے شوق کو ابھارتا ہے ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ہر عمدہ چیز دیکھ رکھی ہے۔

ٹھٹھہ کے قبرستان، ماکلی پہاڑی پر عظیم الشان قدیم یادگاریں ہیں جن سے چودھویں اور اٹھارہویں صدی کے درمیان کے سندھ کی عظمت عیاں ہے۔ 1371ء سے 1739ء تک ٹھٹھہ بہت بڑا علم و تدریس کا مقام تھا۔ اس عرصہ میں چار مسلمان بادشاہوں کی پشتوں کا عروج و زوال ہوا اور سندھ کی تاریخ وقت پر منقش ہوگئی۔ سمّا راجپوتوں نے 1340ء سے 1520ء تک حکومت کی۔ ان کے بعد ارغون آئے اور 1520ء سے 1555ء تک برسر اقتدار رہے۔ 1555ء سے 1562ء تک عنان حکومت ترخانوں کے ہاتھ میں رہی۔ ان سب کے بعد دہلی کے مغل بادشاہ تھے جن کی تہذیب اور فنون 1739ء تک فروغ پاتے رہے۔

سارے یورپ اور ایشیا سے مشہور دانا، ماہرین فن، سائنس دان اور عالم فاضل یہاں جمع ہوئے اور سیاحوں اور تاجروں کے مطابق اس شہر کی روزمرہ کی زندگی میں اسلامی تعلیمات اور علمی

مباحث کو سب سے اونچا مقام حاصل تھا۔ کھڈی کی صنعت میں ایک وقت میں کم از کم چالیس ہزار لوگ ملازم تھے جو بہترین قسم کا کپڑا تیار کرتے تھے۔ اس کی بندرگاہ لوری لندن کی بندرگاہ کے برابر بڑی تھی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہاز بیش قیمت سامان لے کر یہاں آئے تھے۔ جہازوں کے کپتان ٹھٹھہ کو ہندوستان کی سب سے مشہور منڈیوں میں شمار کرتے تھے۔ مغلوں کی حکومت میں اسے سونے کا شہر سمجھا جاتا تھا۔ صنعتی دولت نے اس شہر کو سماجی طور پر مکمل بنا دیا تھا اور یہاں کے صناع کار وقت کے مشہور لوگوں میں گنے جاتے تھے۔

ٹھٹھہ کا زوال 1739ء میں شروع ہوا (جس کی وجہ سے اس کی عظیم معیشت بھی تباہ ہوگئی) جب سندھ کا صوبہ ایران کے نادر شاہ کے حوالے کر دیا گیا۔ نادر شاہ نے اس کی حکومت میاں نور محمد کو سونپ دی جو خدا باد منتقل ہوگیا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں ٹھٹھہ کی شان اور عظمت ماند پڑ گئی۔ یہ مقبروں کا شہر بن گیا اور اسے ترک کر دیا گیا۔

اس کی تاریخی اہمیت کی وجہ سے ماہر فن کاروں نے یادگاروں کو محفوظ رکھنے کا کام شروع کیا ہے اور سیاح گزرے ہوئے مغل گورنروں کے مقبروں پر صناع کاری کے نازک اور انوکھے نمونے تفصیل سے دیکھ سکتا ہے وہ سنگ مرمر اور چونے کی لازوال مضبوطی کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے جو ہزارہا پشتیں گزرنے کے بعد بھی ویسا ہی کھڑا ہے۔

مقبروں کی حفاظت، ظاہری چمک دمک اور شان و شوکت اس بناوٹی جلوس سے ملتی ہے جس کے بارے میں آدمی سوچ سکتا ہے کہ رنگ برنگے جھنڈوں اور باجے کے ساتھ نکالا گیا تھا۔ انتہائی تلاش کے باوجود مجھے اس سارے علاقہ میں گھروں اور سکولوں کے نشانات کہیں نہ مل سکے لیکن مقبرے اس بات کی گواہی دیتے تھے کہ مغلوں کے دور میں مقبروں کو نایاب خوبصورتی کی مثال بنانے میں خرچ اور محنت کی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی۔ ماکلی پہاڑی کے جنوب میں، ٹھٹھہ کے چھوٹے شہر سے تقریباً میل بھر کے فاصلہ پر، مرعوب کن یادگاروں کا سلسلہ وقت کے اوراق پلٹتا ہے۔ مساجد، مقبرے، عمارات اور دروازے توجہ کھینچ لیتے ہیں۔ پہاڑی پر مقبروں کا شہر ہے جہاں کنول سے لبریز تالاب ہیں جن کے کناروں پر سوسن پھیلی رہتی ہے۔

یہ ایک دہشت ناک نظارہ ہے جس سے آنے والا دنگ رہ جاتا ہے یہاں کی خاموشی میں ڈرامہ ہے۔ دور تک پھیلی ہوئی جنگلی بیلوں سے ڈھکی ہوئی دیواریں آج بھی اپنے مالکوں کی قبریں

چھپائے ہوئے ہیں اوران کی پہرہ داری کررہی ہیں۔اپنی مناسب جگہ پر نصب ہر اینٹ رنگ اور ترتیب کا بہترین نمونہ ہے اور صدیاں گزرنے پر بھی اس مضبوطی سے قائم ہے۔ بہت سی اینٹوں کے جدا جدا ڈیزائن ہیں، بعض پر قرآنی آیات کندہ ہیں۔اندرونی دیواریں خوبصورت پتھروں کے پتلے پتلے ٹکڑوں کی ہیں جنہیں چونے سے جوڑ کر مختلف انداز میں لگایا گیا ہے۔ ہلکے نارنجی رنگ نے اپنی گرم چمک دے دی ہے گویا سورج نے اپنی قوت سے ان میں زندگی بھر دی ہو۔

قبرستان میں اگر الٹی طرف سے چلیں تو یادگاروں کے تین خاص فریق آتے ہیں جو تاریخی سلسلے کے مطابق ہیں مغلیہ دور کی یادگاریں سب سے پہلے پڑتی ہیں۔ان میں ازبک، تغرل بیگ، عیسیٰ خاں ترخان نعمانی، جان بابا، دیوان شرفا خاں اور نواب امیر خاں کے خاندان کا قبرستان شامل ہے۔ دوسرے فریق میں جو ترخان اور ارغون دور سے تعلق رکھتا ہے عیسیٰ خاں اول، باقی بیگ ترخان، ابنسابائی، سلطان ابراہیم، میر سلیمان اوران کے رشتہ داروں کے مقبرے ہیں۔ تیسرا فریق جو بالکل شمال میں ہے سما دور سے متعلق ہے اور اس میں جان نظام الدین مبارک خاں ملک راجپال اوران کے خاندانوں کے مقبرے ہیں۔

سب سے بڑی اور پرشکوہ عمارت عیسیٰ خاں ترخان ثانی کے مقبرے کی ہے جس نے 1644ء میں وفات پائی۔ ایک چوکور صحن کے وسط میں ایستادہ، اونچی دیوار سے گھری ہوئی یہ عمارت اندر سے گنبددار ہے جس میں دو الگ، بڑی بڑی بالکونیاں ہیں۔ اندرونی دیواریں خوشرنگ ٹائیلوں سے بنی ہیں جن پر پھول اور لہریئے کا کام ہے عیسیٰ نے یہ عظیم الشان مقبرہ اپنی زندگی میں ہی تعمیر کرادیا تھا تا کہ وہ اپنی پسند کے مطابق اپنی آخری آرام گاہ بنوا سکے۔اس کے کچھ حصوں کے ڈیزائن بننے کے بعد بہترین معماروں کے ہاتھ کاٹ دیئے گئے، تا کہ کوئی دوسرا بادشاہ ان کی خدمات حاصل کر کے اس کی نقل نہ بنوا سکے۔اس دور کے بادشاہوں میں یہ رواج عام تھا۔ میرے خیال میں کھڑکیوں کی ترتیب بہترین ہے۔ اُن سے آسمان کی روشنی منعکس ہوتی ہے۔ مقبرہ اونچی چوکی پر بنا ہوا ہے اوراس کے گرد کا ہر حصہ امتیازی خصوصیت کا حامل ہے۔ گو یہاں سارا کام پتھروں پر کیا گیا ہے لیکن صنع کاری اس قدر لطیف اور نازک ہے گویا مہین ریشم پر کشیدہ کاری کی گئی ہو۔ یہاں خاندان کے ان گنت افراد دفن ہیں لیکن عیسیٰ کی چہیتی بیوی اپنے ایک خاص تعمیر کردہ کونے میں دفن ہے۔ایک تنگ اور اونچا زینہ چھت کی طرف جاتا ہے۔ دو میل پرے ٹھٹھہ شہر میں سے قابل ذکر عمارت شاہجہان مسجد ہے جو جامعہ مسجد بھی کہلاتی ہے۔ یہ ایک صحن کے گرد بنی ہوئی ہے اور عبادت کے کمروں کا رخ مشرق اور مغرب کی طرف ہے۔ باغ میں محرابوں پر بنی ہوئی دو بڑی بڑی گیلریاں ہیں۔ اگر محراب میں کھڑے ہو کر نماز پڑھی جائے تو ساری مسجد میں آواز سنائی دیتی ہے۔ برصغیر ہندو پاک میں ٹائیل پر سب سے محنت کا کام اس عمارت میں ہے۔ یہاں کے نقش ونگار اس قدر خوبصورت اور نایاب ہیں کہ محکمہ تعمیرات نے ان کی خوبصورتی کو محفوظ رکھنے کے لیے ان کی نقلیں بنوالی ہیں۔ شاہجہان نے اس مسجد کا کام اپنے ابتدائی سالوں میں شروع کرایا۔ 1647ء میں اس کی وفات کے بعد اس کے لڑکے اورنگ زیب نے اسے تکمیل تک پہنچایا جس نے مستقبل کا خیال کرتے ہوئے مسجد کے اندر ترانوے آرام دہ حجرے تعمیر کرائے تا کہ اس کے ہزاروں رشتہ دار یہاں آرام سے ابدی نیند سو سکیں۔ مسجد کا اندرونی حصہ سادہ اور سفید ہے اور اینٹوں میں جواہرات کی طرح جڑے ہوئے چمکدار ٹائیلوں کے لیے بہترین پس منظر مہیا کرتا ہے۔

ماکلی پہاڑی پر ہی جانی بیگ ترخان (جس نے 1601ء میں وفات پائی کا مقبرہ دل میں احترام پیدا کرتا ہے۔ ترخان سندھ کا آخری خودمختار حکمران تھا جس نے اپنی آخری آرام گاہ کی تعمیر میں دلچسپی لی۔ چمکدار اور کھردری گہری نیلی اور چمکدار سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی اس عمارت پر رنگے برنگے نقش ہیں۔ خاص عمارت ہشت پہلو ہے جس کے دونوں طرف نصف گنبد نما طاقچے بنے ہوئے ہیں۔ محراب دار دروازوں پر قرآنی آیات خوبصورت سفید خط میں لکھی ہوئی ہیں۔ مقبرے کا ایک حصہ گر چکا ہے لیکن فصیل اب بھی قائم ہے جس کے ماکلی پہاڑی کا چھ میل کا علاقہ صاف نظر آتا ہے یہاں سمندری ہواؤں کی طرح تیز ہوا چلتی ہے۔ اوپر اڑتے ہوئے تیتر اپنے ہمجولیوں کے ساتھ میناروں پر آکر بیٹھ جاتے ہیں اور اس سنسان جگہ پر زندگی کے سہانے راگ گاتے ہیں۔ ایک اور شاندار مقبرہ عظیم جرنل مرزا بیگ کا ہے جو اورنگ زیب کی طرف سے لڑا تھا۔ یہ مقبرہ ایک بڑے پویلین کے انداز میں بنا ہوا ہے۔ اس کے سولہ پہلو محرابوں سے منقسم ہیں اور گنبد آٹھ ستونوں پر بنے ہوئے ہیں۔ مقبرے کے تمام حصوں پر بڑے بڑے کنول اور سورج مکھی کے پھول کھڑے ہیں۔ آڑھے ترچھے ٹائیل چھت کی زینت ہیں جو خمیدہ پتھروں کے ستونوں کے سہارے کھڑی ہے۔

انفرادی حیثیت رکھنے والا ایک اور مقبرہ جام نظام الدین کا ہے جس نے 1461ء سے 1509ء تک حکومت کی۔ اس کی عمارت پندرھویں صدی کے گجرات عہد سے ملتی ہے۔ تمام دیواریں، جن پر کنول کی کلیاں اور کھلے ہوئے پھول بنے ہیں، بل کھاتے ہوئے پتھروں کے حلقوں سے گھری ہوئی ہیں۔ ایک حلقہ پر خوبصورت خط میں قرآنی آیات کندہ ہیں۔ دروازے قطار میں لگائے گئے ہیں اور تمام کونوں پر چھوٹے چھوٹے مینار ہیں جو عجب نظارہ پیش کرتے ہیں۔

عمارتوں کے دوسرے فریق میں، جو صحنوں میں بنائی گئی ہیں، باقی بیگ ترخان اور اہنسا باقی کے مقبرے ہیں جن کے کئی احاطے ہیں، اندرونی دیواروں پر گلاب اور سورج مکھی کے پھول نقش کیے گئے ہیں۔ پتھروں پر فارسی اور عربی کے اشعار لکھے ہوئے ہیں۔

مبارک خاں، جس نے 1490ء میں وفات پائی، کا شاندار مقبرہ چوکور ہے اور اونچی پیڑھی پر تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ اونچی دیواروں سے گھرا ہوا ہے جن پر ہلکے عربی نقش ونگار بنے ہوئے ہیں۔

جان بابا (جس نے 1608ء میں انتقال کیا) کا مقبرہ عیسیٰ خاں کے مقبرہ کے نزدیک ہے۔ ابتدا میں اس کے تین گنبد تھے اب صرف ایک باقی ہے جس پر لکڑی کے جالے کی طرح نازک نقش ونگار بنے ہوئے ہیں ہر دیوار پر مختلف نقش ہیں جو اپنی بے عیب تفصیل کی وجہ سے توجہ کھینچ لیتے ہیں۔ اس کے جنوب میں ماکلی پہاڑی کے دامن میں جھیل کے سامنے بارہ ستونوں والا برآمدہ بنا ہوا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سما شہزادہ جام تماچی ایک غریب مچھیرن نوری کی محبت میں گرفتار رہا تھا۔ الاؤ کے گرد بیٹھ کر سندھی آج بھی یہ کہانی سناتے ہیں۔

دیوان شرفا خاں (جس نے 1638ء میں وفات پائی) کا مقبرہ ماکلی کا سب سے زیادہ محفوظ شدہ مقبرہ ہے۔ یہ ایک بڑی چوکور عمارت ہے جس پر ایرانی طرز کا گنبد بنا ہوا ہے۔ اس کے چاروں کونوں پر مینار ہیں جن کے اوپر جانے کے لیے زینہ بنا ہوا ہے۔ نمایاں رنگ دیواروں کے ہیں جو سرخ اور نیلی اینٹوں سے بنی ہیں۔

قبروں اور روحوں پر، جو مقبروں کے اندر یا باہر کھلے آسمان کے نیچے پڑی ہیں، اقلیدسی نقش و نگار قرآن پاک کی آیات اور ادبی حیثیت کی تاریخیں لکھی ہوئی ہیں سیاح ان کتبوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور طالب علموں کو پرانے سندھ کی تاریخ اور زندگی کے بارے میں بہت سا مواد ملتا ہے۔

سیاح اور طالب علم ٹھٹھہ کو کئی وجہ سے پسند کرتے ہیں۔ اس کے گاؤں تصویروں کی طرح ہیں جن کے کردار اپنے ملک کی زندگی میں حصہ لینے کے لیے ہنستے ہوئے فریم سے باہر نکل آئے ہیں۔ کشادہ، ہوادار ریستوران اور چھوٹے چھوٹے ہوٹل تاجروں، کسانوں، دکانداروں اور سندھی نجومیوں کے آپس میں مل بیٹھنے کی جگہیں ہیں۔ وہ روزانہ یہاں بلاناغہ چائے پینے، ریڈیو اور مقامی موسیقاروں کو سننے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ خواہ چائے خانہ کتنا کھچا کھچ بھرا ہوا کیوں نہ ہو اجنبی کے لیے میز فوراً خالی کردی جاتی ہے کیونکہ وہ معزز مہمان ہے۔ وہ یہاں گپ لگاتے ہیں، چائے پیتے ہیں اور اپنے اردگرد کی دنیا کو دیکھتے ہیں گویہ چیزیں انہوں نے ہزاروں بار دیکھی ہوئی ہیں۔ بچے سیٹیاں بجاتے ہوئے گزرتے ہیں، بیل گاڑیاں رینگتی ہوئی چلتی ہیں، جنگلی خاردار جھاڑیاں لمبی ہوتی جاتی ہیں اور ابلتی ہوئی چائے کی تیز بو سندھ کی خوشبو بن جاتی ہے۔ ان شاندار تاریخی مقبروں سے چلنے کے بعد نیچے گاؤں میں کار روک کر چائے خانوں میں بیٹھ کر بہت لطف آتا ہے آپ کو پرانی کہانیاں سننے کو ملیں گی۔ یہی وہ دیہاتی ہوسکتا ہے جس کے آباؤ اجداد نے مغل بادشاہوں کے مقبروں پر روغن کیا تھا۔ دوسرا آدمی زراعت (جو ٹھٹھہ کی معیشت کا خاص ذریعہ ہے) سے متعلق ہوسکتا ہے جس کے باپ دادا نے شاہی ضیافتوں کی زینت کے لیے بہترین پھل اور سبزیاں پیدا کیں۔ یہاں آپ بڑھیوں اور معماروں سے ملیں گے جو آپ کو کہانیاں سنائیں گے کہ کس طرح خاندانی مقبروں پر نقش ونگار بنانے کے بعد اس مشقت طلب کام کرنے والوں کے ہاتھ کاٹ دیئے جاتے تھے۔ یہ اس لیے کیا جاتا تھا کہ کوئی دوسرا بادشاہ ان کی خدمات حاصل کرکے اس طرح کا ڈیزائن نہ بنوا سکے۔ ان بیتے دنوں میں زندگی خوشی، دکھ، جبر اور ذات پرستی کا مجموعہ تھی۔

ٹھٹھہ کے باہر، مشہور کانجھر اور سنہری جھیلوں میں تیراکی اور مچھلی پکڑنے کا لطف اٹھایا جاسکتا ہے۔ سیاح محکمہ تعمیرات کے بنگلوں میں ٹھہر سکتے ہیں۔ پانچ میل دور پٹھان کے مقام پر گھاٹ ہے۔ مسافروں اور سامان سے لدی ہوئی کشتیاں دن میں دوبار اس کے پار سجاول جاتی ہیں۔ گاؤں کے ساتھ گزرتا ہوا یہ سفر بہت خوبصورت ہے۔ واپسی پر پہاڑیوں پر بنے ہوئے مقبرے بآسانی نظر آتے ہیں تھوڑے ہی فاصلہ پر ایک ہسپتال تعمیر کیا گیا ہے۔ زیادہ سیاحوں کی رہائش کے لیے نئے ڈاک بنگلے بنائے جا رہے ہیں۔

ٹھٹھہ کراچی کے مشرق میں اکسٹھ میل دور قومی شاہراہ پر واقع ہے جو حیدرآباد کو جاتی ہے۔ ڈیڑھ گھنٹہ کا راستہ ہے جو کار کے ذریعے طے ہوسکتا ہے یا ریل سے جو تیرہ میل دور جنگ شاہی کے اسٹیشن پر ٹھٹھہ جانے والی سیدھی بس سے ملتی ہے۔ ٹھٹھہ کے گردونواح میں محکمہ آثار قدیمہ کے ریسٹ ہاؤس (جس کی اجازت کراچی میں آثار قدیمہ کے دفتر سے لینی پڑتی ہے) یا محکمہ تعمیرات کے بنگلوں میں ٹھہرا جاسکتا ہے۔ دونوں جگہوں پر جدید سہولتیں مہیا ہیں اور اچھے ملازم خدمت کے لیے مقرر ہیں کرایہ بے حد سستا ہے۔

شہری زندگی سے خوشگوار تبدیلی اور رومان پرور تاریخی پس منظر کے لیے ٹھٹھہ بہترین جواب ہے۔

ترقی کی طرف گامزن حیدرآباد

یہ قدیم مقام آج کا شاندار مستقبل رکھنے والا شہر ہے جہاں لوگوں کو بے شمار شعبوں میں ملازمت کے مواقع حاصل ہیں نووارد نئے حیدرآباد کی چمک دمک دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور مقامی لوگوں کے خلوص کی گرمی ہمیشہ ان کے دل میں تازہ رہتی ہے ترقی کے باوجود اس خلوص میں آج بھی فرق نہیں آیا حیدرآباد جو سرکاری طور پر سابقہ سندھ کا علاقہ ہے بڑی آرام دہ جگہ ہے کیونکہ یہاں کا طرز زندگی بڑا سادہ ہے۔

یہاں کے لوگ صدہا سال سے لا ابالی رہے ہیں جنہیں اپنی روزمرہ زندگی سے پورا پورا لطف اٹھانے کا شوق ہے خود کفیل اور امیر وادی سندھ میں فصلوں کے درمیان انہیں میلے اور تہوار منانے کے لیے کافی وقت مل جاتا ہے یہ لوگ آداب مجلس کو بہت اہمیت دیتے ہیں اس علاقے کے بہت سے نغمے عید اور دوسرے مذہبی تہواروں کے موقعوں کے لیے مرتب کیے گئے ہیں۔

حیدرآباد کے سندھی بڑے سیدھے سادھے لوگ ہیں جن میں مہمان نوازی، بلند خیالی اور روشن خیالی کوٹ کوٹ کر بھری ہے ان کے پیشے بھی عام سے ہیں اور سندھی دیہاتی صرف وطن کا فرزند ہی نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں اس سے والہانہ عشق کرتا ہے، اسے اپنے گھر سے اس قدر محبت ہے کہ وہ شاذونادر ہی دوسرے گاؤں جاتا ہے وہ اپنی زندگی گاؤں میں ہی بسر کرنی پسند کرتا ہے اور گاؤں سے اسے بے پناہ عقیدت ہے اپنے مخصوص انداز میں وہ لوگوں کو اچنبھے میں ڈال دے گا اور انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کریگا کہ گو زندگی ایک ٹھوس حقیقت ہے لیکن آرام اور تفریح بھی اس کے اہم حصے ہیں۔

سیاح کے لیے حیدرآباد میں بہت سی تعجب خیز چیزیں ہیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ کراچی اور لاہور کے بعد حیدرآباد تیسرا بڑا شہر ہے، جہاں بے شمار دیکھنے والے مقامات ہیں۔ یہ شاعروں اور موسیقاروں کے ملنے کا مقام ہے یہاں تاریخی مقبرے اور ایک مشہور قلعہ ہے قلعہ کے سنگ بنیاد پر یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں ۔

''او خدا! اس شہر میں امن قائم رکھ۔''

سیاح قلعہ سے بہت متاثر ہوتے ہیں، انہیں یہاں کی بیشمار صنعتیں، قیمتی ریشم، چمڑے کا خوب صورت سامان، پتھر کا کام اور متبرک ٹائیل (جو گھر لے جا کر خاص کونے میں رکھا جا سکتا ہے) بھی انہیں متاثر کرتی ہیں ان چیزوں کے بالکل برعکس یہاں کے کارخانوں سے سیمنٹ کی مضبوط چادریں ایسے نکلتی ہیں جیسے نلکے سے پانی، فوٹو گرافی سے شوق رکھنے والوں کے لیے چمکدار اینٹوں والی عمارات اور منقش دیواروں والا یہ شہر بہت خوبصورت تقابل پیش کرتا ہے۔ اس اہم شہر کی آبادی پانچ لاکھ ہے۔

خواہ وہ کسان، دکاندار اور تاجر ہوں یا کلرک، طالب علم ہوں یا ملازم، ہر شخص اپنے طرز زندگی سے پوری طرح لطف اٹھاتا ہے یہ خوش باش لوگ ہیں اور اپنے گردوپیش سے پوری طرح مطمئن بھی۔

حیدرآباد کی صنعت نفیس پارچات، نایاب ڈیزائن کے کپڑے اونٹ اور گھوڑوں کی کاٹھیوں کے لیے دیدہ زیب کشیدہ کاری کا کام اور گھریلو اور صنعتی استعمال کے لیے تعمیراتی سامان پر مشتمل ہے دور دراز کے علاقوں میں گانڈن، پالہ، جرکی، کھگو اور گوجہ مچھلیاں پائی جاتی ہیں جنہیں نہروں سے پکڑا جاتا ہے ان میں سے پالہ مچھلی زیریں وادی سندھ کی معیشت کے لیے کافی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس کے ذریعے تقریباً دس ہزار مچھیروں کو روزگار ملتا ہے حیدرآباد اور خیرپور ڈویژن میں موسم کے دوران روزانہ ایک لاکھ سے اوپر مچھلیاں پکڑ لی جاتی ہیں۔ مچھلیاں سمندر سے دریائے سندھ میں آ جاتی ہیں اور مون سون کے دوران تیرتی ہوئی نیچے سکھر بیراج تک چلی جاتی ہیں۔ جنگلوں میں لومڑیاں، بھیڑیئے، ہرن اور جنگلی سور عام ملتے ہیں۔ شکار کھیلے جانے والے پرندوں میں مرغابی، بطخ، بٹیر اور تیتر کی بہتات ہے۔ حیدرآباد کے خاص درخت بابل، بہر، نیم، بہان، جنڈی اور ٹالی ہیں۔ یہاں کونے کونے میں پھول کھلے ہوتے ہیں۔ حیدرآباد سچ مچ پھولوں کا شہر ہے۔

دیہاتی زندگی سندھی معاشرہ میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اقتصادی فلاح محنت سے پیدا کی جاتی ہے۔ زراعت، گھریلو صنعتیں اور مویشی پالنا ان کی زندگی کا اہم حصہ اور ذریعہ معاش ہیں۔ یہی ان کے سوچنے، اقدار اور رویہ کا ذریعہ ہے، جسے وہ دیانت داری سادگی اور عزت سے پورا کرتے ہیں، سندھ کا دیہاتی دھرتی کا بیٹا ہے، وہ اس سے عشق کرتا ہے اور اپنے گاؤں کی اس کے دل میں اس قدر محبت ہے کہ وہ اپنے پیدائشی مقام سے شاذ و نادر ہی نکلتا ہے۔ اس کا دیہاتی معاشرہ ماحول سے بالکل منطبق ہے۔ اسی سے اس کی زبان ظہور میں آئی ہے۔ جس میں نغموں اور گانوں کا عظیم ذخیرہ ہے۔ برصغیر میں اس سے زیادہ سماجی مشاہدہ کی مثال نہیں ملتی۔ سندھیوں کی بات چیت الفاظ کا ناقابلِ یقین ذخیرہ اور جن لوگوں نے اس کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ کھیتی باڑی اونٹ اور بھیڑ بکریوں کے پالنے سے معاشرہ اور لوگوں پر کس حد تک اثر ڈالا ہے۔

حیدرآباد پر صدیوں اتنے میروں نے حکومت کی ہے کہ اسے آج بھی ''میروں کی جنت'' کہا جاتا ہے۔ ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کے گردونواح میں لاتعداد صوفی رہتے ہیں۔ صوفی بڑے زاہد و عابد مذہبی لوگ ہیں جن کے پاس گاؤں والے اپنی مشکلات لے کر جاتے ہیں۔ سیاحوں کو صوفیوں اور سندھیوں میں بہت سے دلچسپ تقابل نظر آتے ہیں۔ صوفیوں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ مستقبل کا حال بتاتے ہیں اور ان کی ہر جگہ بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ جب وہ کراچی جاتے ہیں تو چند روپیہ لے کر پیش گوئیاں کرتے ہیں۔ وہ حیرت انگیز طور پر درست ثابت ہوتی ہیں۔ جو لوگ ان کا مذاق اڑاتے ہیں وہ بھی آخر اپنے بارے میں خوشخبری سن کر دنگ رہ جاتے ہیں۔

دس صدی قبل سندھ کے لوگوں میں یہی کلچر پھیلا ہوا تھا، زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ پرورش پاتا رہا ہے۔ عربوں کی فتح سے پہلے حیدرآباد نران کوٹ کے نام سے آباد تھا۔ نران اس پہاڑی کا قدیم نام ہے، جس پر قلعہ تعمیر کیا گیا۔ ابتدا میں یہ مقام نران ٹکیر جو کوٹ کہلاتا تھا اور نرون پہاڑی کے قلعہ کے نام سے مشہور تھا، اس کے اردگرد خوبصورت باغات اور چراگاہیں تھیں، اس زمانہ میں پرانا مہران دریا (دریائے سندھ) اس کے مشرق میں بہتا تھا۔ 1752ء میں نوجوان عرب جنرل محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے کے وقت قلعہ بدھوں کے قبضہ میں تھا، جن کے میسوپوٹیمیا کے گورنر سے

دوستانہ تعلقات تھے، محمد بن قاسم کے عدل کی تعریف سن کر بدھوں نے اس کے آنے پر خود ہتھیار ڈال دیئے۔ تالپور، سید، پیر اور میر ضلع کے ممتاز خاندان تھے۔ میر عموماً تالپور کہلاتے تھے۔ یہ بلوچوں کی اولاد میں سے ہیں، کلہوروں کی پوری فوج بلوچیوں پر مشتمل تھی فوج کی کامیاب بغاوت کے بعد سندھ کی عنانِ حکومت میر تالپوروں کے ہاتھ میں آ گئی اور کلہوڑ بالکل ختم کر دیئے گئے۔ بعد میں آنے والی پشتوں میں بھی مسلمان حیدرآباد پر قابض رہے۔ 1757ء میں دریائے سندھ نے اپنا رخ بدلا جس سے کلہوروں کے پرانے دارالحکومت اور دادو ضلع کی جھونپڑیوں میں، جو دریا کے دائیں کنارے آباد تھیں، سیلاب آ گیا۔

غلام شاہ کلہوڑا، جو اس وقت علاقہ کا حکمران تھا، نے دریا کو رُخ بدلتے دیکھ کر قلعہ والی پہاڑی کو اپنے دارالحکومت کے لیے مناسب ترین مقام سمجھا۔ اس انتخاب کے بعد اس نے چھتیس ایکڑ زمین پر اینٹوں کا شاندار قلعہ تعمیر کرایا۔ اس کے بعد اس نے شہر کا نام نِران کوٹ سے بدل کر حیدرآباد رکھ دیا۔ یہ نام حضرت امام علیؓ کے اعزاز میں رکھا گیا جو (حیدر) کے نام سے مشہور تھے۔ غلام شاہ کلہوڑا 1773ء میں فوت ہوا۔ اور حیدرآباد میں دفن ہوا۔ 1783ء میں تالپوروں نے اس کے خاندان کا تختہ اُلٹ دیا۔

حیدرآباد کے چائے خانوں میں سیاح خوش اور تفریح پسند سندھیوں سے باآسانی مل سکتے ہیں۔ انہیں فوراً ہی مختلف مشاغل میں شرکت کی دعوت دی جائے گی۔ سندھی شکار کے شوقین ہیں یہاں مور، کبوتر، فاختائیں، مرغابیاں، جنگلی ہنس، چھوٹی بطخیں، بٹیرے اور پلور بکثرت ہیں، جن کے شکار کی عام اجازت ہے۔ دریا کے کنارے رہنے والے موہن قبائل اور دوسرے سندھی آبی جانوروں کے شکار کے لیے بندوق استعمال نہیں کرتے اور انہوں نے لکڑی پھینکنے، بھالے، دام ڈالنے اور پانی سے بطخ پکڑنے کے اپنے طریقے ایجاد کر رکھے ہیں، شور مچانے سے بھی کام لیا جاتا ہے، اور یہ کام بڑی مہارت سے کیا جاتا ہے۔ سندھی زبان میں اس مشکل کھیل کے لیے بہت سے مخصوص الفاظ ہیں، اور ذرا ہی دیر میں سیاح بھی انہیں جوش و خروش سے دہرانے لگتا ہے۔ گھوڑے کی سواری بھی بہت پُرلطف ہے، سندھی شہ سوار گھوڑے ایک مخصوص انداز میں چلاتے ہیں، جو ناہموار زمین کے لیے نہایت موزوں ہے۔

براڈوے کے گانے کی طرح، سیاح سندھی گھوڑے کی دوگامہ چال دیکھ کر مسکرا اٹھتے ہیں،

وہ کہتے ہیں ''ہم دوگامہ چال دیکھنا چاہتے ہیں۔'' وہ ماہر سندھیوں کی حیران کن شہ سواری دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں، جو بغیر کاٹھیوں کے گھوڑوں پر کرتب دکھا سکتے ہیں۔ یہ فن آج بھی حیدرآباد کا خاصہ ہیں، اونٹوں اور گھوڑوں کی دوڑ اس قدر مقبول ہے کہ اس پر شرطیں لگتی ہیں۔ میدان میں مرغوں اور کبوتروں کی لڑائی پر بہت بھاری شرطیں لگتی ہیں، دوسری طرف پتنگ بازی جوان بوڑھوں میں یکساں مقبول ہے۔ آج بھی چند گھنٹوں کے اندر اندر کشتی دیکھنے کے لیے بہت بڑا مجمع اکٹھا کیا جا سکتا ہے، اور تماشبین ہر لمحے زور شور سے تالیاں بجاتے ہیں، دوسری تفریحات میں شطرنج، ڈانس، تاش اور مختلف جوئے کے کھیل شامل ہیں، جن میں عورتیں نہایت مشاق ہیں۔

سندھ کے عوامی ناچوں میں زبردست تنوع ہے۔ بعض ناچ اس قدر مشکل ہیں کہ انہیں کافی مشق کے بعد سیکھا جا سکتا ہے، لوگ عوامی ناچوں کے رسیا ہیں۔ دیہاتی لوگ میلوں تہواروں اور دعوتوں پر جمع ہوتے ہیں جو خالص سندھی انداز میں ہوتے ہیں۔ یہ ناچ مقامی موسیقی کی دھن پر ہوتے ہیں جو بین، ڈھول اور مجیرے پر بجائی جاتی ہے۔ یہ لوگ ڈھول کے طور پر بڑے بڑے مٹکوں کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ دل بہلانے کے یہ سیدھے سادے طریقے تمام کسانوں کو خوش کرتے ہیں سندھ میں موسیقی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ برصغیر میں اسلامی کلچر کا یہی وہ پہلا مقام تھا جہاں خوشی کے موقعوں کے لیے مسرت و انبساط کے نغمے پھیلے کیونکہ جغرافیائی طور سے یہ لوگ باقی حصے سے الگ تھلگ تھے لہٰذا انہوں نے مقامی موسیقی کو ترقی دی، جو اسلامی عہد کے ساتھ ساتھ شروع ہوئی۔ صدیوں قبل محمد بن قاسم کا پورے سازینے سے استقبال کیا گیا تھا۔ تاریخ کے اوراق پلٹنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی سندھ کے سامن لوگوں نے محمد بن قاسم کا بہت زور شور سے رقاصوں اور ڈھول کی موسیقی سے استقبال کیا جو شادیوں اور دوسرے خوشی کے موقعوں پر بجائی جاتی ہے۔ قاسم اس شاندار استقبال سے اس قدر متاثر ہوا کہ عرصہ تک اس کا چرچا رہا۔ یہی موسیقی آج بھی چلی آتی ہے اور ایسی ہی تقریبات اور رسومات پر بجائی جاتی ہے گو حیدرآباد کے ہوٹلوں میں کیبرے ڈانس نہیں ہوتا لیکن سیاحوں کی درخواست پر رقص و سرور کی محفلیں اکثر گرم ہوتی ہیں۔

حیدرآباد کے مکانات بیحد دلچسپ ہیں، بیشتر مکانات پتھر کے ہیں اور جنوب کی جانب بنے ہیں جس طرف سے گرمیوں میں ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔ کمروں میں ٹھنڈی ہوا حاصل کرنے کا یہ ان

کا انفرادی طریقہ ہے۔ کمرے کی چھت پر لکڑی اور پلاسٹر کے بادکش بنائے جاتے ہیں اور پر جنوب اور مغرب کی جانب کا حصہ کھلا رکھا جاتا ہے جو ہوا کو کھینچتا ہے اور اس طرح ہوا خود بخود نیچے کھلے ہوئے راستے کے ذریعے کمرے میں داخل ہوتی رہتی ہے۔ گرمیوں کے جھلسانے والے دنوں میں بادکش لوگوں کے لیے ایک نعمت ہیں۔ سردیوں میں لکڑی کے تختے سے چھت کا راستہ بند کر دیا جاتا ہے۔ 1948ء سے لے کر اب تک بہت سی نئی آبادیاں پھیل گئی ہیں جن کو سیاح دیکھنا پسند کریں گے مثلاً جنوب میں شاہ لطیف آباد کالونی، مشرق میں صنعتی علاقہ اور حیدرآباد شہر کے شمال مغرب میں جام شورو۔ یہاں تمام مکانات بادکش بنے ہوئے ہیں، پرانے زمانے کی جھلک لیے ہوئے ان نئی آبادیوں کی تعمیر سے حیدرآباد کا رقبہ پھیل گیا ہے اور خوبصورتی میں بھی اضافہ ہو گیا ہے شاہ لطیف آباد کی طرف سے بائیں سڑک سے جب سیاح حیدرآباد پہنچتا ہے تو ایک الگ پہاڑی پر پرانا قلعہ اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ یہ قلعہ کلہوروں نے بنوایا تھا۔ اس کے اندر ایک مقبرہ ہے جس پر نیلے ٹائیلوں کا کام ہے جسے سیاح بے حد پسند کرتے ہیں۔

علاقہ کے دوسرے شہر دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ نیا ہالہ 1800ء کے لگ بھگ مخدوم میر محمد نے تعمیر کرایا تھا کیونکہ پرانے ہالہ کو جو اس سے صرف دو میل کے فاصلے پر ہے۔ اس وقت دریائے سندھ سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ہالہ میں دیکھنے والی چیزیں دو مقبرے اور ایک مسجد ہے۔ یہ خانقاہیں مشہور صوفی پیر مخدوم نوح کی یاد میں ہیں جو 1505ء میں پیدا ہوئے اور ستاسی سال کی عمر میں وفات پائی۔ یہاں سال میں دو بار مارچ اور اکتوبر میں میلہ منعقد ہوتا ہے جس میں سندھ کے کونے کونے سے ہزاروں لوگ آ کر پیر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اس مقبرہ کا سنگ بنیاد 1795ء میں مخدوم محمد زماں نے رکھا اور اسی سال میر فتح علی تالپور نے اس پر گنبد تعمیر کرایا۔ مقبرے کے شمال میں ایک خوبصورت مسجد ہے جو 1810ء میں تعمیر ہوئی۔ لوگ یہاں آج بھی نماز ادا کرتے ہیں۔ ہالہ سفالی کے برتنوں کے لیے مشہور ہے۔ ہالہ کے مشرق میں چار میل دور بھیت شاہ ہے۔ تمام سندھی اس چھوٹے سے گاؤں کو بہت متبرک سمجھتے ہیں کیونکہ یہاں پر مشہور شاعر اور صوفی شاہ عبدالطیف کا مزار ہے جو یہاں رہے اسلامی اصولوں کی تعلیم دی اور یہیں وفات پائی۔ مقبرہ پر 1167ء کی تاریخ کندہ ہے جو قریب قریب ان کی وفات کی تاریخ ہے۔ یہ مقبرہ اینٹوں سے بنا ہے اور بنیاد پتھر کی ہے۔ فرش پر چمکدار ٹائیلوں کا کام ہے۔ اس کے نزدیک دو اور پیروں کے

مقبرے ہیں جو 1231ء اور 1218ء میں تعمیر ہوئے۔ یہاں ہر سال صفر کے مہینے میں میلہ ہوتا ہے جو تین روز چلتا ہے۔ اس میں ہزارہا سندھی اور سیاح شرکت کرتے ہیں۔ میلہ کے زمانہ میں ہر سال ادبی محفل بھی منعقد ہوتی ہے۔ سیاحوں کی آسانی کے لیے یہاں ایک خوبصورت ریسٹ ہاؤس اور ثقافتی مرکز بھی تعمیر کیا گیا ہے۔ بدین ایک اور دیکھنے والا گاؤں ہے جس میں سکول، ہسپتال اور ٹاؤن کمیٹی ہے اس کی بنیاد ایک ہندو نے ڈالی تھی۔ افغان جنرل مددخاں نے اسے بالکل برباد کر دیا اور تقریباً ڈھائی سو سال قبل شاہ بدین قادری نے اس کی دوبارہ تعمیر کی جس کے نام سے یہ چھوٹا سا شہر منسوب ہے۔ اس کے اعزاز میں ہر سال اکتوبر میں یہاں بہت بڑا میلہ ہوتا ہے جس میں تقریباً پندرہ ہزار لوگ شرکت کرتے ہیں۔ اس کی حیثیت موسمی تہوار کی سی ہے۔ ایک اور میلہ بلاری میں منعقد ہوتا ہے جہاں تقریباً ایک لاکھ روپیہ کی مالیت کا ریشمی کپڑا اور روپہلی اور سنہری کام کیا ہوا سامان فروخت ہوتا ہے۔ یہاں دیکھنے کی خاص چیز مشہور شاعر شاہ کریم کا مقبرہ ہے۔ اس نے 1622ء میں وفات پائی۔ حیدرآباد میں میروں کے مقبرے اہم تاریخی عمارتیں ہیں شہر کے شمال میں یہ خوبصورت مقبرے اس وقت کے حکمران کلہوروں نے بنوائے تھے جنہیں بعد میں تالپوروں نے شکست دی۔ تالپور عہد میں مقبروں کی طرف کسی نے توجہ نہ دی اور وہ خراب ہو گئے۔ پہلا مقبرہ، جو غلام شاہ کلہورا کا ہے بالکل کھنڈر ہو کر رہ گیا۔ بعد میں اس کی مرمت ہوئی اور تقریباً پرانی شکل دے دی گئی۔ برطانوی دور کے بعد تالپوروں نے اپنی زندگی میں ہی (جس کا رواج اس زمانے میں عام تھا) اپنے مقبرے تعمیر کرائے لیکن یہ کلہوروں کے مقبروں کے مقابلے میں نچلے درجے پر آتے ہیں۔ سب سے پرانا دیکھنے والا مقبرہ چار یار کا ہے جسے اس نے 1812ء میں خود اس کی تعمیر کروائی اور ایک ایک پتھر اپنے سامنے لگوایا۔

بعد کے میر یہاں کے معزز خاندان بن گئے۔ بلوچیوں کی نسل سے تعلق رکھنے والے یہ میر بہت طاقتور تھے اور اپنی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہونے دیتے تھے۔ ان کی قوت بہت زیادہ تھی اور اس دور میں سارے کلہوروں کو ختم کر دیا گیا۔ بہرحال ان کے زمانہ میں کلچر کو فروغ ہوا جو فرعونوں کے دور کی تہذیب سے لگا کھاتا تھا اور یونانی' ترکی اور ایرانی کلچر سے مشابہہ تھا۔ اس خطوط سے ترقی ہوئی اور علاقائی طاقت پیدا ہوئی جو تمام سندھیوں کا نشان امتیاز ہے۔

آج کا حیدرآباد طمانیت کی تصویر پیش کرتا ہے۔ ترقی کے آثار ہر طرف نمایاں ہیں۔ عظیم

الشان غلام محمد بیراج، جس کا افتتاح مارچ 1955ء میں ہوا شہر کے مشرق میں ہے۔ یہ تین سوفٹ لمبا ہے اور اس میں آبھ لاکھ پچھتر ہزار کیوسک پانی کا نکاس ہوسکتا ہے۔ اس میں چوالیس پشتے ہیں جن میں ہر ایک کا فاصلہ ساٹھ فٹ ہے اور اس کے دروازے اکیس فٹ گہرے ہیں۔ دریا کی ٹریفک میں آسانی کے لیے بیراج میں مقفل راستہ بنایا گیا ہے اور کشتیوں کو گزارنے کے لیے سڑک کے پل کا تھوڑا سا حصہ اوپر اُٹھ جاتا ہے چار بڑی نہریں دادو، حیدرآباد اور ٹھٹھہ کی زمینوں کو سیراب کرتی ہیں۔ ان علاقوں میں زمین کی زرخیزی اسی بیراج کا عظیم کارنامہ ہے۔ بیراج کی تعمیر سے پہلے یہاں پیداوار بہت کم تھی۔ اس پروجیکٹ میں پانی کے اخراج کا انتظام سیم اور تھور کو روکنے کا طریقہ اور دریائے سندھ پر سجاول کے مقام پر نیا پل شامل ہے۔ اس پروجیکٹ نے حیدرآباد کی صنعتی زندگی کو بہت مدد دی ہے۔ اس کی وجہ سے مویشی اور تحقیقاتی فارم، مچھلیوں کے فارم اور پانی کے تالاب بنے۔ یہاں سکول گھریلو صنعتیں اور گھارو، بھمبور، ہالیجی، ڈھانڈ، ٹھٹھہ، کالری جھیل اور کوٹری کے مقام پر نہایت آرام دہ سیاحوں کے مرکز ہیں۔ یہ مرکز ریلوے لائن کے ساتھ ہیں اور آمدورفت کی آسانیاں میسر ہیں۔ درحقیقت غلام محمد بیراج محض دیکھنے کی چیز ہی نہیں ہے بلکہ اس کے بیشمار فوائد ہیں۔ یہ ایک وسیع علاقہ ہے جہاں بیسویں صدی کی تمام آسائشیں انسان کی خدمت کے لیے مہیا کردی گئی ہیں۔ انجینئری سے دلچسپی نہ رکھنے والے لوگ بھی اسے دیکھ کر بیحد متاثر ہوتے ہیں۔

حیدرآباد کی سڑکوں پر دورویہ اونچے درخت ہیں جو گرمی کے دنوں میں سایہ مہیا کرتے ہیں قومی شاہراہ کراچی سے سیدھی آتی ہے اور ٹھنڈی سڑک (مال روڈ) نہایت کشادہ اور خوبصورت ہے۔ کراچی کی نسبت یہاں رطوبت کم ہے اور سمندر کی تازہ اور ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔ سردی زیادہ شدت کی نہیں ہوتی۔ سیاح لوگ تجارتی مرکز شاہی بازار کو بہت پسند کرتے ہیں جہاں کرامت گھنٹہ گھر ہے۔ یہاں بیشمار بازار اور خوبصورت عمارتیں ہیں۔ تجارت کا خاص سامان روئی، گندم اور بنولے ہیں۔ بازاروں میں چائے، نمک اور دوسری اشیائے خوردنی ملتی ہیں۔ حیدرآباد اپنی گلاس کی صنعت اور ایسبسٹاس فیکٹری کے لیے مشہور ہے۔ دادا ایسبسٹاس سیمنٹ پلانٹ بہت بڑا بالکل جدید اور دیکھنے کی چیز ہے۔ چھتیں بنتی ہوئی دیکھ کر آپ کو بمشکل یقین آئے گا۔ ان کے بننے کا طریقہ دیکھنے والا ہے۔ سفالی کے برتن عمدہ دریاں ہالہ کے برتن ٹرنک' ظروف، پھول

دان اور رنگ برنگا کئی قسم کا فرنیچر کا سامان ان چند گھریلو صنعتوں میں سے ہیں، جو حال ہی میں شروع ہوئی ہیں اور ملک کے کونے کونے سے آنے والوں کو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتی ہیں سیاحوں کو روزمرہ کے استعمال کی یہ چیزیں اس قدر دل کش لگتی ہیں کہ وہ ارادہ سے زیادہ خرید لیتے ہیں۔ یہاں کپڑے کے چھ کارخانے ہیں جن کا خوبصورت مال سارے ملک میں فروخت ہوتا ہے۔ یہ کارخانے مہر ٹیکسٹائلز، فتح ٹیکسٹائلز، سلور کوٹن ٹیکسٹائلز، محمد ٹیکسٹائلز اور فضل گلزار ٹیکسٹائلز ہیں، یہ پُرخلوص لوگ اپنی مصروفیت میں سے وقت نکال کر سیاحوں کو کارخانے دکھائیں گے تاکہ وہ ان کی کارکردگی دیکھ سکیں۔ ٹنڈو محمد خاں کے فوجی شوگر مل میں اب اعلیٰ درجے کی چینی کثیر مقدار میں تیار ہوتی ہے۔ سندھ صنعتی علاقے میں بیشتر صنعتی ادارے قائم ہیں۔

حیدرآباد میں بے شمار ہوٹل ہیں جہاں سیاحوں کو اچھا کھانا، صاف ستھرے کمرے، اور عمدہ سروس ملتی ہے۔ رٹز اور ہوٹل انڈس بہت نفیس ہیں۔ یہ شہر کے وسط میں مال روڈ پر واقع ہیں اور کرایہ بالترتیب بیس اور تیس روپیہ یومیہ ہے۔ فردوس سیدھا سادھا لیکن عمدہ ہوٹل ہے۔ یہاں ایک دن کا کرایہ تمام اخراجات ملا کر بیس روپیہ ہے۔ سب سے اچھا ہوٹل اورینٹ ہے جو حال ہی میں کھلا ہے۔ یہ جدید ترین آسائشوں سے مزین، نہایت آراستہ پیراستہ اور ائرکنڈیشنڈ ہے سامان آرائش کی دکانیں اور سہولتیں حیدرآباد کی روز افزوں ترقی کے مطابق ہیں۔ حیدرآباد فلٹریشن پلانٹ (Filtration Plant) پر بجا طور پر فخر کرتا ہے جو دو سال ہوئے تعمیر ہوا ہے دیہات میں کنوؤں کا پانی صاف شفاف اور میٹھا ہے جب یہ دستیاب نہ ہو تو پانی کے تالاب بنا لیے جاتے ہیں۔ جن میں صاف پانی ہمیشہ جھلمل جھلمل کرتا رہتا ہے۔

یہاں کافی سینما ہیں جن میں مقامی اور غیر ملکی فلمیں چلتی ہیں۔ فردوس اور میجسٹک بہت شاندار ہیں یہاں کلب بھی ہیں جہاں سیاح اگر وہ زیادہ عرصہ قیام کریں اعزازی ممبر بن سکتے ہیں۔ حیدرآباد میونسپل باغ میں بیس ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ یہ اسٹیڈیم کے ساتھ ہے۔ جہاں تمام تقریبات ہوتی ہیں۔ شہر کے دوسرے پارکوں اور باغوں میں پھولوں کے تختے ہیں، جہاں سیر اور خرید و فروخت کے درمیان آرام کیا جاسکتا ہے۔

سیّاح نوجوانوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ پٹارو (حیدرآباد کے نزدیک) کے کیڈٹ کالج میں تقریباً ایک ہزار لڑکے روز کلاسوں میں جمع ہوتے ہیں جن میں استطاعت ہے وہ فیس ادا

کرتے ہیں نادار طلباء کے لیے بے شمار وظائف اور دوسری رعایات ہیں لازمی چیز حصول علم کا شوق اور پڑھائی میں دلچسپی ہے۔ بہرحال چونکہ تمام طلباء کو یکساں رہائش اور دوسری آسانیاں حاصل ہیں۔ اس لیے کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ فیس کون ادا کرتا ہے یہاں خاندانی امتیاز بالکل نہیں ہے۔ امتیاز ان طلباء کو ملتا ہے، جو محنت سے اسے حاصل کرتے ہیں۔

آج کا حیدرآباد ایک عظیم ترقی پذیر شہر ہے، چمنیوں سے آسمان کی طرف دھواں بلند ہو رہا ہے۔ کاریں اور تانگے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں اور غلام شاہ کلہورا کی روح پگڑیاں باندھے شہریوں کو، جن کے دل سادگی اور محبت سے معمور ہیں، دیکھ کر شفقت سے مسکرا رہی ہے۔

پُراسرار موہنجوڈارو

وادیٔ سندھ — سپاٹ ریتیلے میدان اونچے نیچے ٹیلے، بنجر اور زرخیز دونوں کی زمینیں — جن کے ساتھ ساتھ کچی سڑکیں میلوں چلی جاتی ہیں۔ ان پر جابجا بیل گاڑیوں نے اپنے گہرے نشانات بنا لیے ہیں۔ یہ وہ شاہراہ ہے جو موہنجوڈارو کے شہر خاموش کی طرف جاتی ہے۔ عجیب پراسرار گھمبیر موت کا شہر۔ یہاں مہمانوں کے لیے تعمیر کردہ ڈاک بنگلہ میں کم از کم ایک رات ضرور بسر کیجیے۔ تاکہ آپ اس دور افتادہ شہر کے تعمیراتی عجائبات سے لطف اندوز ہو سکیں۔ موہنجوڈارو کراچی سے 366 میل دور سندھ کے مغربی کناروں پر واقع ہے۔ یہاں سکھر کے راستے ایئرکنڈیشنڈ گاڑی اور جیپ کے ذریعے جاتے ہیں اور جن سیاحوں کے پاس وقت کم ہو ان کے لیے ہوائی ٹیکسیاں اور ہیلی کاپٹر بھی ہیں جو آپ کو بڑے آرام سے ان کھنڈرات کے قریب ایک خاص مستقر پر لے جاتے ہیں اور پھر اسی دن واپس لے آتے ہیں۔ آخری چھ میل آپ کی جیپ یا تانگہ جنگلی پھولوں اور چہچہاتے پرندوں سے بھری جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتی ہے۔ ادھر اُدھر کپاس کے کھیت اور پھلوں کے پودے بھی ہیں۔ یہ خوش گوار منظر دھوپ کھائی زمین پر بکھرے موہنجوڈارو کے قبل از تاریخ کھنڈرات کے ساتھ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔

آج سے چار ہزار برس پہلے یہ تہذیب اپنے پورے عروج پر تھی لیکن صرف نصف صدی کی بات ہے کہ اس خطے کی پہلی دفعہ کھدائی کی گئی جس سے اس سرزمین کے آغاز، تہذیب طرز زندگی اور دیوتاؤں کی حقیقت اور بربادی کے متعلق کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے 1950ء میں ایسے ٹھوس حقائق بتائے جن کی روشنی میں اس تہذیب کے خدوخال پوری

طرح اُجاگر ہوگئے۔

پتھروں پر کندہ کتبوں کے مطالعہ سے بھی بہت سی معلومات حاصل ہوئی ہیں جو اس زمانے کی داستان پر روشنی ڈالتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور کی ترقی کے متعلق پڑھ کر آپ حیران ہو جائیں گے۔ موہنجوڈارو کے عجائب گھر میں یہ سب اسرار محفوظ ہیں اور وہاں آپ کو خوبصورت مجسّمے دیکھنے کا بھی پورا موقع ملے گا۔ چمکدار دلکش مجسّمے، برتن، زیورات پتھر کی مہریں — یہاں سیّاح نیا علم اور نئی روشنی حاصل کرتا ہے۔

ان بھولے بسرے دنوں میں ایک عظیم فنِ تعمیر نے جنم لیا تھا جس نے موہنجوڈارو کے عظیم شہر کی مفید اور عملی خطوط پر منصوبہ بندی کی اور معاشرے کے ہر فرد کی سہولت کو پیشِ نظر رکھا۔ ہر آنے والا اس بات کو خاص طور پر محسوس کرتا ہے کہ اتنے قدیم زمانے میں بھی لوگ اس معیار کی تہذیب کے حامل تھے۔ تاریخ سے بھی قدیم تر وادیٔ سندھ میں کئی ایسے آثار دریافت ہوئے ہیں جو آج کل کے ماہرینِ تعمیرات کے لیے بھی روشنی کا سرچشمہ ہیں۔ دو سو چالیس ایکڑ پر کھدی ہوئی اور الف لیلوی عمارات کی حامل یہ قدیم سرزمین تفصیل سے اس وقت کی انتظامیہ، مذہب اور طرزِ زندگی کو اُجاگر کرتی ہے — یہ تہذیب 300 سال قبل مسیح میں روم، کریٹ، Tigris اور وادی نیل کی تہذیبوں سے مشابہ ہے۔

ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت بنا ہوا شہر سرخ رنگ کی اینٹوں کی عمارتیں نالیوں کا بہتر انتظام گندے پانی کے لیے کنوئیں غلے کے سرکاری ذخیرے عوام کے لیے حمام ایک مذہبی درسگاہ واضح طور پر بتاتے ہیں کہ یہ ایک صدر مقام تھا یا ایک خاص اہمیت کا حامل بین الاقوامی شہر جہاں ایک بہت بڑی آبادی، خوش تنظیم شہری اور اقتصادی زندگی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ ایسے قیمتی پتھر اور دھات کی چیزیں جو اس علاقے میں نہیں پائی جاتی ہیں ان کی دریافت اس امر پر روشنی ڈالتی ہے کہ دوسرے ملکوں سے بھی خوب تجارت ہوتی تھی۔ بعض چیزوں پر ہاتھیوں، شیروں اور گینڈوں کی شکلیں بنی ہوئی ہیں۔ یہ اور شہر میں نالیوں کا انتظام اس بات کا شاہد ہے کہ یہ خطہ ان دنوں مون سون کی زد میں تھا۔ بارشیں بکثرت ہوتی تھیں اور زرعی پیداوار بھی بہت ہوتی تھی۔ گندم، جو اور کپاس یہاں کی خاص فصلیں تھیں۔ بعد میں مون سون نے اپنا رُخ بدل لیا اور یہ علاقہ سوکھ گیا۔

موہنجوڈارو کے لوگ درمیانی قد و قامت کے، سرخی مائل رنگ، لمبے سر اور چہرے، اور سیاہ بالوں والے تھے۔ دوسرے بہت سے نوادرات میں ایک معزز آدمی کا سنہری خلعت میں ملبوس مجسمہ ملا ہے۔ جس سے اس زمانے کے لباس پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ ترشی ہوئی ڈاڑھی اور صاف کی ہوئی لبیں اس بات کی مظہر ہیں کہ ان دنوں استرے مستعمل تھے۔ عورتیں سکرٹ نما قمیض پہنتی تھیں۔ زیورات کا بھی عام رواج تھا جن میں موتیوں کے ہار، گجرے، سونے کے بازو بند، لونگ اور بالیاں شامل تھیں۔ بالوں کو پنکھے کی شکل میں گوندھا جاتا تھا۔ بچے مٹی کے بنے ہوئے کھلونوں اور گاڑیوں سے کھیلتے تھے۔ چینی کے جانور اور بندر بھی ان کے پسندیدہ کھلونے تھے۔ ان کے سر اور دُمیں رسیوں سے بندھے ہوتے تھے جو علیحدہ بھی کیے جا سکتے تھے۔ ایسے کھلونے کافی تعداد میں ملے ہیں۔ ڈائس (دانہ) درونِ خانہ کھیلوں میں سے ہر دلعزیز کھیل تھا۔

مختلف سائز اور وزن کے باٹ بھی خاصی تعداد میں ملے ہیں۔ یہ سب ایک شکل اور ایک ہی ساخت کے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ ایک مضبوط حکومت کے زیرِ اثر تھے۔ وزن اور پیمائش کا باقاعدہ معیار سختی سے نافذ العمل تھا۔ جو برتن دستیاب ہوئے ہیں وہ تانبے یا کانسی کے بنے ہوئے ہیں۔ یہاں کے لوگ لوہے سے ناآشنا تھے۔ دھات کی جو دوسری چیزیں ملی ہیں، ان میں تین چاندی کے برتن اور سیسے کی چھوٹی پلیٹ کے علاوہ کلہاڑی، تلواریں، نیزے، چُھرے، چاقو اور استرے بھی ہیں۔ کچھ عجیب الفاظ میں کندہ مہریں بھی ایک خاصی تعداد میں ملی ہیں۔ موہنجوڈارو سے ملنے والے مٹی کے برتنوں میں مختلف شکلوں اور سائزوں کی صراحیوں کی ایک بڑی تعداد ہے جن میں سادہ بھی ہیں اور بعض کے دستوں پر باقاعدہ روغن کیا ہوا ہے۔

یہاں کے باشندوں کے متعلق ابھی تک یہ واضح طور پر علم نہیں ہو سکا کہ وہ کون تھے؟ کس نسل سے تعلق رکھتے تھے! ماہر عمرانیات ارض کا یہ دعویٰ ہے کہ اس آبادی کی اکثریت اس نسل میں سے ہے جن کے متعلق یہ تحقیق کی گئی ہے کہ وہ وسطی ایشیا میں ملنے والی ابتدائی زرعی آبادیوں سے وابستہ تھیں۔ ان کا رسم الخط جو چینی کے برتنوں پر یا نعتیں کتبوں پر محفوظ ہے وہ بھی اس بات کا شاہد ہے۔ غیر ملکی تاجر اور ملاح جن کے جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز ہوتے تھے وہ بڑی تعداد میں ادھر آتے۔ ان کے ساتھ سامانِ تجارت اور دوسرے ملکوں کی پیداوار بھی کثیر تعداد میں ہوتی۔ جس سے نئے ڈیزائنوں اور ترقی کے نئے منصوبوں کی طرح پڑتی۔

اتنی بڑی بین الاقوامی تہذیب کا انجام ایک المیے پر کیسے ہوا — یہ ایک دوسرا معمہ ہے۔ انسانی ڈھانچوں سے تو ہم یہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک روز کسی حملہ آور بلا نے انہیں بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہندوؤں کی ایک تحریر ورگ وید..... کی شہادت یہ ہے کہ آریوں کے جنگ کے دیوتا نے یہ تباہی مچائی تھی۔ یہاں یہ درج ہے کہ آریوں نے شہر پر شمال سے حملہ کیا تھا۔ شہری اپنے گھروں میں بے خبر ہی اس حملے کی زد میں آ گئے اور گلیوں میں نہایت بہیمانہ طور پر مار ڈالا گیا — اس طرح یہ ایک صدیوں پرانی تہذیب ایک دم مٹ گئی۔

ڈوکری ریلوے سٹیشن سے نو میل کے فاصلے پر اس قبل از تاریخ زمانے کے شہر کے آثار ٹیلوں کے ایک بے قاعدہ سلسلے میں موجود ہیں۔ یہ شہر دو حصوں میں ہے۔ ایک زیریں جو مشرق کی سمت ہے اس میں مکانات اور دکانیں ہیں۔ دوسرا بالائی جو مغرب میں ہے اور اس میں نہایت اہم عمارتیں موجود ہیں۔ مثلاً بڑا حمام، دینی درسگاہ ایک ستونوں والا ہال بدھ مندر جو بدھ بھکشوؤں نے تباہی کے بعد بنایا تھا۔ ایک پرشکوہ معبد کے آثار بھی ملتے ہیں۔ جو ایک بلند چبوترے پر تعمیر کیا گیا تھا۔

شہر ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت تعمیر کیا گیا تھا۔ کھلی سڑکیں ہیں جنہیں کہیں کہیں دائیں طرف کو کاٹتی گلیاں گزرتی ہیں۔ امراء کی رہائش گاہوں میں پکے فرش ہیں۔ کوڑے کرکٹ کے لیے باقاعدہ ڈربے بنے ہیں۔ یہ سارے عمدہ انتظامات دیکھ کر ایک ماہر تعمیرات بے ساختہ بول اٹھے۔ ”یہ واضح امر ہے کہ یہ شہر یونہی معرض وجود میں نہیں آ گیا تھا۔ یہ ایک ایسے بااختیار ماہر شہریت کی دماغی اور عملی کاوش ہے جس کا ارادہ ہی قانون تھا۔

قابل دید مقامات میں ایک بدھ مندر اور کشن دور کے بھکشوؤں کی رہائش گاہ کے کھنڈرات بھی ہیں۔ یہ آس پاس کے علاقے سے 72 فٹ اونچی تعمیر کی گئی تھی۔ بدھ مندر کے اس ملبے کے اوپر سے شہر اور دریائے سندھ کا ایک فضائی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ بدھ مندر کے اس کھنڈر کا مغربی حصہ مرکزی راستے ”بھگوان کی گلی“ سے ایک طرف ایک پرشکوہ ڈھانچہ کھڑا ہے، جس میں ایک کھلا ہال ہے اور اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ ظاہر شکل وصورت اور بڑے حمام کی قربت کے پیش نظر یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ بھکشوؤں کی درسگاہ تھی۔ جہاں بھکشوؤں کا سربراہ بھی رہتا تھا۔ ساتھ ہی بڑا حمام اور نہانے کا تالاب تھا جو 8 فٹ گہرا تھا۔ چھوٹی چھوٹی دیواروں کے ساتھ 10 فٹ اونچے ڈاچ ٹاور، بڑی تعداد میں موجود تھے، جو عمارت میں مضبوطی کا باعث بھی تھے۔ ایک اور فراخ عمارت شہنشاہ کا محل یا اس صوبے کے حکمران کی رہائش گاہ تھی، جو اس شہر کے جنوبی حصے میں ہے۔ یہاں آنے والے موہنجوڈارو کے نئے عجائب گھر سے ضرور محفوظ ہوں گے۔ یہ شہر کے بالکل نزدیک ہی ہے۔ یہاں ان کھنڈرات سے برآمد ہونے والے بڑے دلچسپ نوادرات محفوظ ہیں۔ ان میں مشہور کندہ مہریں، ذاتی زیورات، اور جواہر، موسیقی کے آلات، اوزار، محنت مزدوری کے اوزار، گھریلو استعمال کے برتن، مٹی کے برتن، پتھر اور لکڑی کی بنی ہوئی مورتیاں بھی شامل ہیں۔ غیر معمولی قسم کے مٹی کے برتن، تصویروں والے کھلونے بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

کراچی ایرو کلب نے اپنے چھ نشستوں والے ”کسینا“ ہوائی جہاز سے کراچی سے موہنجوڈارو تک چارٹرڈ پروازوں کا انتظام کیا ہے۔ یہ طیارہ پانچ مسافروں کے لیے واپسی سمیت 750 روپے لیتا ہے۔ چارٹرڈ پروازوں سے فائدہ اٹھانے کے خواہشمند سیاح محکمہ سیاحت کلب روڈ کراچی سے رابطہ قائم کریں یا ایرو کلب کنٹری کلب روڈ کراچی سے براہ راست رجوع کریں۔ سیاحت کے ڈائریکٹر مسٹر ایم، زیڈ کیانی، جو ان انتظامات کے نگران ہیں، 1963ء کے آغاز میں ”کسینا“ کے ذریعے پرواز کر کے اس علاقے میں گئے تھے جہاں محکمہ آثار قدیمہ نیا ریسٹ ہاؤس تعمیر کر رہا ہے۔ کیانی صاحب نے یہاں بیس غیر ملکی سیاحوں کو دیکھا جو یہ طویل فاصلہ ریل اور سڑک کے ذریعے طے کر کے یہاں تک پہنچے تھے۔ پاکستانی طلباء اور سیاحوں کی بھی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔

یہ کوئٹہ ہے

کوئٹہ کے لوگ بیک وقت سنجیدہ اور خوش باش ہیں۔ انہیں مشکلات سے عشق ہے۔ یہ لوگ پٹھان بروہی اور بلوچی نسل سے ہیں اور ان قبیلوں کی تمام خصوصیات ان لوگوں میں موجود ہیں کوئٹہ میں ان کی اپنی دنیا بستی ہے اور جب وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں تو ان سے محبت، نفرت اور فخر کا جذبہ جھلکتا ہے۔

عہد رفتہ میں ان کی زندگی بڑی کٹھن تھی۔ ان لوگوں کے اصول نہایت سادہ ہیں...... آنکھ کے بدلے آنکھ...... دانت کے بدلے دانت خواہ حالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ اسی طرح رہنا پسند کرتے ہیں۔ انہیں اس مخصوص تنہائی سے محبت ہے اور مطمئن ہیں کہ وہ شہروں سے دور رہتے ہیں انہیں ہر دشوار کام سے دلچسپی ہے اور زندگی کی عام آسائشیں پسند نہیں۔ یہاں آپس کی رقابت نہیں اور لوگ اپنے کام سے مطلب رکھتے ہیں ان کا اپنا ضابطۂ اخلاق ہے جو ہر چیز سے برتر ہے اور آپس کے معاملات میں دیانتداری برتی جاتی ہے آج کل خاندان میں سب سے بڑے لڑکے کو اپنی راہ اختیار کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اور اسے اپنے باپ کے نقش قدم پر نہیں چلنا پڑتا۔ باپ خواہ کتنا ہی دقیانوسی کیوں نہ ہو وہ بیٹے کو اپنی پسند اختیار کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

رفتہ رفتہ قدیم روایات جدید خیالات کو جگہ دے رہی ہیں۔ نئی نئی تبدیلیاں ظہور میں آ رہی ہیں اور بلوچی قبائل کے سردار بھی رضا مند نظر آتے ہیں۔ کالج میں پڑھا ہوا لڑکا بہت بڑا سرمایہ ہے وہ قبائلی جرگوں میں دستاویزات کو بہتر طریقے پر پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ گاؤں کو اردو، انگریزی اور بلوچی کی کتابیں لیے لوٹتا ہے اور والدین دل ہی دل میں خوش ہوتے ہیں ان کا

مستقبل روشن ہو رہا ہے لڑکے اور لڑکیاں بیرون علاقے کی خوبیوں سے مستفیض ہو کر لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے گھر لوٹ رہے ہیں کوئٹہ سے نوے میل دور جنوب میں قلات کے علاقہ میں قدیم دور کے ہندوؤں کے مندر ہیں دائمی شعلوں سے گھری ہوئی شعرا کی مورتی آج بھی موجود ہے...... جنگ و جدال اور قتل و غارت کے قصے اور زمیندار راجے سب غائب ہو گئے ہیں ان کی جگہ بنیادی جمہوریت نے لے لی ہے!! بلوچیوں نے بھی اسے قبول کر لیا ہے۔

یہاں کڑاکے کی سردی پڑتی ہے لیکن اس کے باوجود فصلیں ہوتی ہیں۔ یہ محنت کش لوگ کاشت کرتے ہیں یہاں نہ زیادہ بارش ہوتی ہے نہ دھوپ نکلتی ہے۔ مغربی پاکستان میں قلات قلیل ترین آمدنی والے علاقوں میں سے ہے لیکن صدر ایوب کے دور حکومت میں ترقی ہو رہی ہے۔ بھیڑیں پالنا مقبول پیشہ ہے اور مکران کے ساحل پر مچھلی کثیر مقدار میں ملتی ہے۔

سڑک کے کنارے پھوس پھیلاتا ہوا کسان اور بلند پہاڑیوں کے دامن میں آپ کو پھول نظر آتے ہیں۔ یہ کوئٹہ ہے جو دوسرے شہروں سے مختلف ہے۔ پاکستان کے دونوں صوبوں میں کوئی شہر اس سے مشابہت نہیں رکھتا۔ کوئٹہ کی خوبصورتی پتھروں کے زمانے کے چھوٹے چھوٹے شہروں سے لیکر جھیلوں، وادیوں اور چنار کے درختوں سے سرسبز پہاڑیوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں کے لوگ بھی دوسروں سے مختلف ہیں۔

اگر خوش قسمتی سے آپ کی ملاقات کوئٹہ والا سے ہو جائے تو آپ فرق دیکھ کر دنگ رہ جائیں گے۔ وہ نہ تو بلدیہ کا رکن ہے نہ کوئٹہ کا مالک۔ وہ تو محض بلوچیوں کی نسل سے ہے جس کی رگوں میں بہادر بروہی خون دوڑ رہا ہے۔ اس کے ساتھ خوبصورت بچے ہیں جن کے مشاغل مختلف ہیں جن میں شتر مرغ پالنا اور ہاتھی دانت کے چھوٹے چھوٹے ہاتھی جمع کرنا شامل ہیں۔ باپ کو بھی چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے اور اس کے پاس بے شمار کتابیں اور نایاب مغل تصاویر ہیں لیکن ابھی تک گوہر مقصود اس کے ہاتھ نہیں آیا اس کے ہاں کوئی لڑکی پیدا نہیں ہوئی۔

چھوٹے سے کھانے کے کمرے سے ان کے رہن سہن کا اندازہ ہوتا ہے۔ مشرقی قالین پر پانچ فٹ لمبی بے داغ لوہے کی گول ٹرے میز کا کام دیتی ہے جس کے گرد سارا خاندان کھانے کے لیے جمع ہوتا ہے کھانے کے بعد خاندان کا ہر فرد سفید تکیوں کی ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلائے آرام کرتا ہے۔ نو سفید تکیے ایک لائن میں رکھے جاتے ہیں۔ کوئٹہ والوں نے صدیوں پہلے کی مسلم روایات کو

اپنایا۔ وہ آج بھی اسی طرح کھانا کھاتے ہیں جس طرح آئندہ کھائیں گے، اور اس سکون اور آرام سے لطف اندوز ہوتے ہیں جس سے ہم مغربی لوگ گزر چکے ہیں۔

کوئٹہ کے گرد قدرتی تماشہ گھر چھوٹیوں اور پہاڑیوں پر مشتمل ہے کوئٹہ شہر ہوائی اڈہ سے چند میل دور ایک خوبصورت شاہراہ کے ساتھ واقع ہے تمام سیاح کشادہ صاف شفاف سڑکوں کو دیکھ کر بہت متاثر ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کو قطع کرتی ہیں۔ اگر یہاں کے باشندوں کا لباس روایتی نہ ہوتا تو یہ گمان ہوتا کہ پاکستان کا حصہ ہی نہیں۔ کوئٹہ کے بازاروں میں ایشیا کا حسن ہے اور لمبے تڑنگے سرخ گالوں والے پٹھان اور بلوچی چنگیز خاں کے زمانے سے یہاں پھر رہے ہیں۔

کوئٹہ جسے پہلے کواٹا کہا جاتا تھا کا مطلب قلعہ ہے جس کے اندر پرانا شہر بسا ہوا ہے۔ یہ امیر سبکتگین اور محمود غزنوی کی حکومت کے حصہ کی حیثیت سے وجود میں آیا اور بعد میں ان کے وارثوں کو منتقل ہو گیا۔ بلوچی حکومت نے وسطی قلات کے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ جس پر التمش رند سردار منڈو حکومت کرتا تھا۔ یہ شان و شوکت کا دور تھا لیکن مستقل لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے چکروں کی ڈالی ہوئی مضبوط بنیاد کمزور ہو رہی تھی۔ پھر بروہی خاندان سے ایک غریب آدمی میر احمد اٹھا جس نے گیارہویں صدی میں قلات پر حکومت کی اور تمام سرحدوں کو یکجا کر کے امن قائم کر دیا۔

1730ء میں کوئٹہ میر مہابت خاں کے زیر نگیں آ گیا اور اس نے 1751ء تک قلات پر قبضہ رکھا۔ اس کے بعد برطانیہ نے اس پر قبضہ کر لیا اور اس کی فوجیں اور قبائلی کونسل 1842ء تک حکومت کرتی رہیں۔ برطانیہ کی علیحدگی کے بعد افغانوں نے پشین اور شورارد پر قبضہ کر لیا اور کوئٹہ ایک بار پھر خاں قلات کو واپس کر دیا گیا جو 1876ء تک حکومت کرتے رہے۔ اس سال کے معاہدہ کے تحت قلات کے علاقہ میں برطانوی فوجیں مقیم ہو گئیں اور سر رابرٹ سنڈیمن تین سو سپاہیوں کے ساتھ کوئٹہ کی حفاظت پر مامور ہو گیا۔ 1877ء میں یہ بلوچستان ایجنسی کا صدر مقام بن گیا۔ موجودہ کوئٹہ تحصیل کو 1883ء میں خاں قلات سے پچیس ہزار روپیہ سالانہ پر مستقل پٹہ پر لے لیا گیا۔

بلوچستان کی تاریخ میں معزز ترین شخص خاں قلات خداداد خان کا بیٹا شہزادہ اعظم خاں تھا۔ برطانیہ نے خاں کو گورنر جنرل کے ایجنٹ سے ملاقات کے لیے بلایا۔ شہزادہ کو شک ہوا کہ کہیں یہ اس کے باپ کو برطرف کرنے کی چال نہ ہو۔ لہٰذا اس نے باپ سے استدعا کی کہ وہ نہ جائے۔ بہادر خاں نے اس انتباہ کو نظر انداز کر دیا اور عام قیدیوں کی طرح پکڑا گیا۔ برطانیہ کے ساتھی قبائلی سردار اس کا مضحکہ اڑاتے اور اسے جگہ جگہ لیے پھرنے میں لطف اٹھاتے۔ وہ معزول شدہ خاں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے بہانے آتے اور اس کا مذاق اڑاتے، نوجوان شہزادہ حقیر باپ کی خدمت کے لیے ساتھ ساتھ چلتا۔ حتیٰ کہ موت نے خاں کو قید و بند سے نجات دلا دی۔ اعظم خاں نے اگلے تیس سال جلاوطنی میں گزار دیئے اور طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کیں جب کہ اس کے دشمن عیش کر رہے تھے۔ اسے آزادی اور دولت کی پیش کش بھی کی گئی لیکن اس نے ان اصولوں کا غلام بننے سے انکار کر دیا جن پر وہ یقین نہیں رکھتا تھا۔

کوئٹہ کے علاقہ کے پرخلوص لوگ ان تمام قبائل کی پشت سے ہیں جنہوں نے جنگ و امن کی تاریخ اپنے ہاتھوں سے لکھی۔ یہ لوگ افغانستان، ایران اور ترکی سے آئے۔ آبادی اچکزئی، سید، بلوچی، بروہی اور پٹھانوں پر مشتمل ہے۔ چھاؤنی کوئٹہ اور پشین ضلع کے لوگ ملے جلے ہیں۔ بہت سے لوگ بلوچوں کو ایرانیوں اور ترکمانوں سے ملاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رند خاندان کے جانشین نڈر عربوں کی پشت سے ہیں۔ ان کی زبان عربی سے ملتی جلتی ہے اور بلوچی سے مراد ''کلغی یا ایال'' ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لفظ سنسکرت کے ''بال اور اوچھا'' کا مجموعہ ہے جس کا مطلب طاقتور ہے جب سیاح بلوچیوں سے ملتے ہیں تو انہیں احساس ہوتا ہے کہ ان کے خلوص میں بڑی کشش ہے کیونکہ وہ سیاحوں کو سارا علاقہ دکھانے میں بڑی مدد دیتے ہیں اس علاقہ کی آب و ہوا نہایت لطیف ہے مجھے یاد ہے جب کراچی میں شدت کی گرمی پڑ رہی تھی تو کوئٹہ میں موسم خشک تھا اور ٹھنڈی ہوا چلتی تھی۔ یہ موسم پھلوں کی پیداوار کے لیے نہایت موزوں ہے۔

سیب، خوبانیاں، آڑو، انگور اور سردہ یہاں بکثرت ہوتا ہے صرف انگور کی انیس منظور شدہ قسمیں ہیں جن کی یہاں کاشت ہوتی ہے لوگوں کو پودے مفت تقسیم کیے جاتے ہیں اور کوئٹہ ایسا مقام ہے جہاں درخت لگانے کی رسم پر خوشی منائی جاتی ہے حال ہی میں کوئٹہ کے کمشنر نے ہفتہ شجرکاری کا افتتاح کیا اور اپنی قیامگاہ پر سیب کا چھوٹا سا پودا لگایا محکمہ زراعت نے کسانوں اور لوگوں کو گھر میں لگانے کے لیے پھلوں کے بیس ہزار پودے تقسیم کیے۔ ہر شخص خوش تھا کیونکہ ہفتہ شجرکاری کا مقصد پورا ہو رہا تھا۔ کمشنر نے اس موقعہ پر تقریر بھی کی۔ انہوں نے کہا۔ ''چونکہ ہماری زمین باغات اور دوسری فصلوں کے لیے نہایت موزوں ہے۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ ان پودوں کا پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔'' کوئٹہ کے لوگ بے حد خوش تھے اور حکومت کی فراخدلی سے

بڑے متاثر تھے۔ وہ تعریف کرتے گھروں کو لوٹے کچھ ہی عرصہ میں چھوٹے چھوٹے درخت پھوٹ نکلیں گے اور ہر نیا پتہ اور کونپل ان لوگوں کے لیے ذریعہ انبساط ہوگا جو انہیں بڑھتا دیکھ رہے ہیں۔ یہاں ہر شخص تمام سہولتیں بہم پہنچانے پر انتظامیہ کا احسان مند ہے۔

شہر کی مرکزی شاہراہ جناح روڈ کسی چھوٹے سے امریکی شہر کی سڑک کی طرح ہے۔ یہاں خوبصورت ریستوران ہیں، جہاں سیاح مختلف کھانوں کا لطف اٹھاتے ہیں۔ کوئٹہ کے قلب میں چینی ریستوران عمدہ پیسٹریوں اور روٹی کی وجہ سے مشہور ہے۔ بازار میں کوئٹہ کا اپنا مخصوص کھانا 'لال کباب' پر ملتا ہے۔ یہاں گوشت آپ کے سامنے کوئلوں پر بھونا جاتا ہے اور بے حد خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے لوگ یہاں جمع ہوتے ہیں۔ کسی شخص کو جلدی نہیں ہوتی اور کسی قسم کی افراتفری نظر نہیں آتی۔

دکانوں میں وہ تمام اشیا موجود ہیں جو سیاح خریدنا چاہتے ہیں۔ اس میں مغرب سے برآمد شدہ چیزیں بھی شامل ہیں کوئٹہ کی خاص چیزوں میں بلوچستان کا کشیدہ کاری کا کام بھی شامل ہے۔ یہ ایسی خوبصورت چیز ہے جو سارے ایشیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔ کپڑے پر ڈیزائن بنا کر بے شمار چھوٹے چھوٹے شیشے لگائے جاتے ہیں جو سائز میں نئے پیسہ کے برابر ہوتے ہیں۔ ہر شیشے کے گرد رنگدار دھاگے سے کپڑے کے مطابق کروشیہ کا کام کیا جاتا ہے اس سے بیحد خوبصورت ڈیزائن بنتا ہے اور کپڑا ہر وقت جھلمل جھلمل کرتا رہتا ہے۔ پلنگ پوش اور میز پوش کے علاوہ کوٹ، لباس، اسکرٹ اور ہینڈ بیگ پر بھی کشیدہ کاری کی جاتی ہے۔ اس کے لیے صرف سحر انگیز کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے۔

کشیدہ کاری کے کام کی خاص دکان جناح روڈ پر اسٹائلو (Stylo) ہے، آپ اگر قسم بھی کھالیں کہ ایک پیسہ خرچ نہیں کریں گے، لیکن صرف قدم اندر جانے کی دیر ہے اور آپ بہک گئے۔ اگر چمکدار تھیلا آپ کو متوجہ نہیں کرتا تو کوٹی، جیکٹ یا خوبصورت لبادہ دیکھ کر آپ ضرور مجبور ہو جائیں گے۔ آپ کے لیے یہاں سے لوٹنا ناممکن ہوگا...... ہر طرف شیشے ہی شیشے ہیں اور یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں آپ کو پہاڑیوں اور کوئٹہ کی خوبصورتی کی یاد دلائیں گی۔ اسٹائلو میں ایک حصہ دار کوئٹہ والا بھی ہے جس سے میری ملاقات کسی دکان پر ہوئی تھی۔ وہ مجھے اپنے خاندان سے ملانے اپنے گھر لے گیا۔

کوئٹہ کے لوگ ہر کام نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے ہیں۔ اسٹائلو سے چند قدم کے فاصلے پر پاکستان مرکز صنعت وحرفت کے خوش مزاج مالک نذر محمد اس بات کا انتظار نہیں کرتے کہ ان کے ملازمین گاہکوں کی طرف توجہ دیں۔ وہ نہایت فخر سے ایک ایک چیز انہیں دکھاتے ہیں۔ گو ان کے ہاں بلوچی کشیدہ کاری کی چیزیں بھی ملتی ہیں لیکن ان کی دکان کی خصوصیت دھات کے برتن ہیں جو کراچی اور پشاور میں ملنے والے برتنوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ ''کیا آپ چمکدار برتن جمع کرنا پسند کرتے ہیں؟ مجھے تو بہت شوق ہے۔'' دکان میں پیتل کے دمکتے ہوئے برتن ہیں جن پر رنگ برنگ پتھر جڑے ہیں۔ ایک کی قیمت تقریباً پچاس روپے ہے۔ یہ برتن اتنے بھلے لگتے ہیں کہ آپ کا دل چاہتا ہے، بہت سارے خرید ڈالیں۔ پیتل کے ٹرے اور میزیں بالکل اچھوتی ہیں۔ ان پر مغل دور کی تصویریں نقش کی گئی ہیں جو نذر نے خود بنائی ہیں۔ کچھ کافی کی میزیں ہیں اور کچھ میں گڑھے بنائے گئے ہیں۔ ان گڑھوں میں گلاس اور عجیب وغریب شکلوں کی صراحیاں اور بوتلیں رکھی ہیں جو پیتل کی بنی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ ہاتھی دانت، ریشم اور چمڑے کی بنی ہوئی بے شمار چیزیں الماریوں میں رکھی ہیں۔ افغانی کاٹھیاں اور جوتے بالکل اچھوتے ہیں اور صرف اس دکان پر ملتے ہیں۔

اس وقت سارا کاروبار رک جاتا ہے جب نذر کا پہلوٹھی کا بچہ دکان میں لایا جاتا ہے اور باپ اسے دو چار ہلارے دیکر پیار کرتا ہے کوئٹہ میں خرید وفروخت کرتے ہوئے سیاح گھر کے لوگوں کو دکان میں آتے دیکھ کر بڑے خوش ہوتے ہیں۔ اس کے بعد تمام لوگ چائے پینے کے لیے رک جاتے ہیں اور باتیں ہونے لگتی ہیں کہ وارث کس طرح پرورش پا رہا ہے...... ''شاید ہمیں اس خوبصورت سانپ کی ٹانگوں والی گول میز پر کچھ رعایت مل جائے۔

کوئٹہ، پشین اور قلات کے اضلاع اس علاقہ میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں لیکن بہت سی پرانی رسمیں (گو یہ آہستہ آہستہ دم توڑ رہی ہیں) آج بھی قائم ہیں اور قبائلیوں کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ عزت کے قوانین نے، جو پرانے زمانے میں مروج تھے، ہر قبائلی کے لیے لازم کردیا ہے کہ وہ۔

(1) خون کا بدلہ لے۔

(2) جس شخص کو اس نے پناہ دی ہے اس کے لیے جان تک دے دے۔ پناہ کو ہمسایہ کہا جاتا

ہے اور یہ اس وقت تک لازم ہے۔ جب تک پناہ گزیں پناہ دینے والے کے گھر میں ہو (3) میزبانی کرے اور مہمانوں کے جان و مال کی حفاظت کرے۔

کوئٹہ کے علاقہ کی جوان عورتوں کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کے لیے شادی کے رسم و رواج میں ''دلہن کی قیمت'' کا ذکر ضروری ہے۔ اگر لڑکی جوان اور خوبصورت ہو تو اس کی قیمت ایک ہزار سے دس ہزار روپے تک ہوتی ہے۔ بیوہ کی قیمت کم ہوتی ہے۔ اس کے پانچ سو روپے بھی لگ سکتے ہیں اور بلوچیوں میں اگر کوئی بیوہ اپنے مرحوم خاوند کے خاندان میں شادی کرنے پر راضی ہو تو بالکل مفت مل جاتی ہے۔ یہ بالکل دوستانہ انتظام ہوتا ہے۔ کوئٹہ میں شادی کا منظر بڑا خوبصورت ہوتا ہے۔ کیونکہ خاندان کے لوگ شادی طے کرتے ہیں۔ لہٰذا دولہا دلہن ایک دوسرے کو پہلی بار دیکھتے ہیں۔ رشتہ کا انتخاب بڑی احتیاط سے کیا جاتا اور دلہن کو تحائف سے لاد دیا جاتا ہے۔ شادی کے بعد اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور وہ ہنسی خوشی اپنے گھر رہنے لگتی ہے۔

کوئٹہ کے لوگ جوانمردی کے کھیلوں کے شوقین ہیں۔ وہ کشتی لڑتے ہیں اور یانرا کھیلتے ہیں۔ جس میں دو لوگ تیسرے آدمی کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ اگر وہ پکڑا جائے تو ہار جاتا ہے۔ اگر وہ اپنے حریفوں کو پہلے چھولے تو جیت جاتا ہے۔ میلوں پر، جس میں سیاح بھی شرکت کر سکتے ہیں، خوب کھیل تماشے ہوتے ہیں۔ نیزہ بازی، نشانہ بازی اور انڈے پھینکنے کے مقابلے ہوتے ہیں، اور بانسریوں اور ڈھول کی گت پر خوشی کے نغمے گائے جاتے ہیں۔

دوسرے اہم میلے دونوں عیدیں ہیں۔ عید کے اگلے روز کوئٹہ سے چھ میل دور شیخ منڈا کے مزار پر میلہ لگتا ہے۔ یہاں پیروں کی بڑی عزت ہوتی ہے۔ آسمانی آفات اور بھوت پریت دور کرنے کے لیے ان کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ پیر لوگوں کے ساتھ مل کر دعا مانگتا ہے جس کے عموماً بڑے اچھے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

تفریح کے لیے کوئٹہ کے لوگ قہوہ خانوں میں جاتے ہیں اور گپ شپ کرتے ہیں یا پھر بڑے ہوٹلوں اور ریستورانوں میں جمع ہوتے ہیں اور سبز چائے اور حقہ پیتے ہیں۔ یہاں گھریلو اور قبائلی معاملات سے لیکر قومی اور بین الاقوامی حالات تک پر بحث ہوتی ہے اخباروں کا مطالعہ...... اور غیر ملکی خبروں پر تبصرہ ہوتا ہے۔ ''خلائی دوڑ میں کون آگے ہے؟۔ صدر ناصر آج کل کیا کر رہے ہیں؟۔ ارے یہ دیکھو! شہزادی الیگزنڈرا کی شادی ہوگئی۔ صفر کے مقابلے میں سات گول۔ اصل

میں برازیل کے لوگ فٹ بال کھیلنا جانتے ہیں۔'' اور بات چیت کا سلسلہ جاری رہتا ہے، کچھ لوگ شطرنج کھیلنے کے لیے رات کو لورد میں ملنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ کچھ مرغوں کی لڑائی دیکھنے کا پروگرام بناتے ہیں۔

جن ہوٹلوں میں لوگ جمع ہوتے ہیں زیادہ بڑے نہیں لیکن ان میں وسعت کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ سیّاحوں سمیت تمام لوگ سب سے پہلے لورد کا رخ کرتے ہیں کیونکہ وہ شہر کے وسط میں واقع ہے گو چھاؤنی میں چلتان میں جانے والے بھی بہت ہیں لیکن لورد لوگوں میں بے حد مقبول ہے۔ یہاں پچاس لوگوں کے لیے عمدہ کمرے ہیں اور کھانا بھی عمدہ ملتا ہے یہ ہوٹل چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے لورد خوبصورت باغات سے گھرا ہوا ہے ایک اسٹیج بنا ہوا ہے جہاں موسیقار جدید اور دیسی ساخت کے ساز بجاتے ہیں مہمان زائد پیسے خرچ کیے بغیر یہاں رات کو رقص کر سکتے ہیں اور کھانا کھا سکتے ہیں اس ہوٹل میں پی آئی اے کا دفتر بھی ہے انتظامیہ ہر لحظہ خدمت کے لیے مستعد ہے اور ناشتہ کسی وقت بھی مل سکتا ہے۔ گرم حمام بھی تیار رہتا ہے۔ تمام خرچ ملا کر کرایہ بتیس روپیہ یومیہ ہے۔ لورد کوئٹہ کلب کا صدر مقام بھی ہے جہاں لوگوں کی تفریح کے لیے فلم شعر، تمبولا اور خواتین کے لیے صبح اور شام رقص کی کلاسیں ہوتی ہیں۔

چلتان بھی بڑی خوبصورت جگہ ہے اور سکون پسند سیّاحوں کے لیے یہاں باغات ہیں۔ کرایہ پچیس روپیہ یومیہ ہے۔ بولان ہوٹل میں صرف کمرہ کرایہ پر ملتا ہے اور کھانا پکانے کی سہولتیں مہیا ہیں۔ سنگل کمرہ کا کرایہ آٹھ روپیہ اور ڈبل کا چودہ روپیہ ہے، لیکن کھانا پکانا کون پسند کرے گا جبکہ ان کا باورچی نہایت ارزاں قیمت پر بے حد لذیذ کھانا پکا لیتا ہے۔ کوئٹہ کے قلب میں ایک کشادہ اور جدید ترین سہولتوں سے مزین ہوٹل زیر تعمیر ہے۔ کوئٹہ میں بہت سے خوبصورت ڈاک بنگلے اور گورنمنٹ سرکٹ ہاؤس ہے ان کا کرایہ ایک روپیہ سے پانچ روپیہ یومیہ تک ہے۔ محکمہ اطلاعات کے ذریعہ یہاں ٹھہرنے کا انتظام پہلے سے کرنا لازمی ہے۔ ڈاک بنگلوں کو عموماً حکومت کے ملازمین استعمال کرتے ہیں لیکن سیّاحوں کو بھی اجازت مل جاتی ہے۔

کوئٹہ میں سیر کی ابتدا نئے ریڈیو اسٹیشن سے کی جاتی ہے۔ یہاں سیّاحوں کی بے حد عزت کی جاتی ہے اور ان سے کوئٹہ کی سیر کے تاثرات بیان کرنے کو کہا جاتا ہے۔ درختوں سے گھری ہوئی لٹن ایونیو پر پیدل یا تانگہ کی سیر بڑی پرلطف ہے۔ یہاں خوشنما مکانات اور عظیم الشان ریذیڈنسی

ہے جہاں صدر اور دوسرے معزز لوگ ٹھہرتے ہیں۔ اگلا مقام اسٹاف کالج ہے جو خوبصورت گردونواح میں گاؤں کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ یہاں گزشتہ زمانے میں برطانوی افسروں کو فوجی تربیت دی جاتی تھی اور آجکل پاکستان، ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے فوجی افسر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ شام کا وقت سرکلر روڈ پر پھل منڈی اور مشہور جامعہ اور اثنا عشری مسجد دیکھنے میں صرف کیا جا سکتا ہے۔

ٹاؤن ہال خوبصورت جگہ ہے اور صنعتی عمارات میں کپڑے کے مل، دواؤں کے کارخانے اور پھل محفوظ کرنے کے پلانٹ ہیں، جہاں آپ کو لذیذ جام چکھنے کے لیے دیئے جاتے ہیں آپ کوئلہ کی کان بھی دیکھ سکتے ہیں۔ کان کنی کوئٹہ کی معیشت کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ اگر کوئی سیاح بیمار ہو جائے تو سارے علاقہ میں بے شمار عمدہ ہسپتال موجود ہیں۔

کوئٹہ میں ایوب اسٹیڈیم نیا بنا ہے۔ یہاں بیک وقت دس ہزار تماشائیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ یہ ریس کورس کے نزدیک واقع ہے۔ قدیم شہر ہونے کے باوجود کوئٹہ میں بے شمار جگہیں ہیں جو بالکل جدید ہیں ان میں خوبصورت پارک بھی شامل ہیں۔ واپڈا نے ایک بجلی گھر قائم کیا ہے جو صنعتی ترقی میں مدد دے گا۔ اس کے علاوہ کوئٹہ سے گیارہ میل دور گنا کرو میں ڈیم بنایا جائے گا، جو پانی کی موجودہ بہم رسانی میں اضافہ کرے گا۔ اس کی گنجائش ساٹھ لاکھ کیوسک فٹ سے زیادہ ہوگی، اور پچھتر فٹ بلند ہوگا۔ اس طرح یہ علاقہ ترقی کر رہا ہے اور یہ تمام کام پاکستانی فوج کے انجینئر کر رہے ہیں جو کوئٹہ کے لوگوں کی بہبود کے لیے مقامی انتظامیہ سے تعاون کر رہے ہیں۔ تصویر کا دوسرا رخ دیکھیے۔ شہر کے نزدیک دریافت ہونے والی پہاڑیاں آثار قدیمہ کی دلچسپی کی حامل ہیں۔ یہ موہن جوڈارو کے دور کی بیان کی جاتی ہیں اور اس تعلق کا پتہ دیتی ہیں جو صدیوں پہلے اس علاقہ کے لوگوں کا اپنی ہمعصری تہذیبوں سے تھا۔

کوئٹہ سے صرف تیس میل دور قدیم پشین ہے جہاں سیاحوں کی دلچسپی کی بہت سی چیزیں ہیں اس کی فرض شناس ٹاؤن کمیٹی ترقی کے منصوبے بناتی ہے۔ پشین کے خوبصورت ریسٹ ہاؤس کے دروازے تمام سیاحوں کے لیے کھلے ہیں۔ اجازت نامہ محکمہ زراعت سے لینا پڑتا ہے۔ ایک رات ٹھہرنے کا کرایہ صرف پانچ روپیہ ہے چوکیدار خدمت کے لیے ہر وقت حاضر رہتا ہے۔ ڈاک بنگلہ اور پولیٹکل ریسٹ ہاؤس میں رہائش کا انتظام کوئٹہ کے محکمہ اطلاعات کی معرفت سیاحتی

مشاورتی کمیٹی (Tourist Advisory Committee) کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ یہاں کے افسران نہایت بااخلاق ہیں۔ پھولوں بھرے میدانوں سے گھرے ہوئے ریسٹ ہاؤس چھٹی اور ماہ عسل منانے کے لیے بہترین مقام ہیں۔ ہرے بھرے میدانوں کو دیکھ کر گھاس پر لوٹ لگانے کو دل چاہتا ہے۔

آٹھ میل آگے خوشدل خاں میں زراعت کے لیے خوبصورت مصنوعی جھیل بنائی گئی ہے۔ جہاں مرغابی کا شکار کھیلا جاتا ہے۔ سردیوں میں جھیل جم جاتی ہے اور سکیٹنگ کے لیے بہترین ہے۔ پشین سے سات میل دور یارو کے ریلوے اسٹیشن سے پشین کے گرد بارہ ہزار ایکڑ میں پھیلے ہوئے باغات سے سیب، انگور، آلو بخارے اور خوبانیاں باہر بھیجے جاتے ہیں۔

اس ضلع میں بے شمار مزار ہیں اور صوفیوں کی بڑی عزت و تکریم کی جاتی ہے۔ عرصہ دراز پہلے صوفیوں نے بہت سے کرشمے دکھائے ہیں۔ بابا شیخ فرید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے چشمہ جاری کر دیا تھا جس پر آج بھی ان کے جانشینوں کا قبضہ ہے۔ وہ ان کسانوں سے نذرانہ وصول کرتے ہیں جو شیخ صاحب کے چشمے کے نزدیک زرخیز زمینوں پر کاشت کرتے ہیں۔ ایک اور مشہور صوفی سید برت اور خواجہ چشتی کے مزار پر، جو ضلع پشین میں حانکڑی میں واقع ہیں، ہزاروں لوگ جاتے ہیں۔

کوئٹہ کی سیاحت کے دوران آپ ایک دن زیارت میں بھی گزار سکتے ہیں۔ یہ پچھتر میل دور ہے اور تقریباً دو گھنٹے کا راستہ ہے۔ بنجر میدانوں سے بلندی پر یہ نخلستان کی طرح ہے اور سطح سمندر سے آٹھ ہزار چالیس فٹ کی بلندی پر ہے۔ زیارت میں سیاحوں کی آمد کا زمانہ 15 مئی سے شروع ہو جاتا ہے اور اکتوبر تک چلتا ہے۔ جمالیاتی ذوق رکھنے والے اس کی بے مثال خوبصورتی دیکھ کر مبہوت رہ جاتے ہیں۔ پہاڑوں کے دامن میں شکار بکثرت ملتا ہے اور بلند چوٹیاں کوہ پیماؤں کو دعوت دیتی ہیں آپ یہاں صنوبر کے درختوں کے نیچے بیٹھ کر آرام کر سکتے ہیں اور پتھروں پر بہنے والے پہاڑی چشموں کے ٹھنڈے پانی سے پیاس بجھا سکتے ہیں۔

راستہ بادام کے درختوں سے گھرا ہوا ہے اور کمشنر کی رہائش گاہ کے نزدیک تیرنے کا تالاب ہے تیرتے ہوئے مغرب کی جانب ساری وادی پھیلی نظر آتی ہے یہ نظارہ نتھیا گلی سے زیادہ خوبصورت ہے۔ لوگ پتھر کے بنے ہوئے مکانات میں رہتے ہیں۔ یہاں پتھر اتنا ملتا ہے کہ اگر

اسے باہر لے جانے کا کوئی بندوبست کرلیا جائے تو بے شمار دولت پیدا کی جاسکتی ہے، ڈاک بنگلے اور ریسٹ ہاؤس بے شمار ہیں۔ ایک رات کا کرایہ دو سے پانچ روپیہ تک ہے۔ زیارت اتنی خوبصورت جگہ ہے کہ آپ مسحور ہو جائیں گے۔ میرے لیے وہاں سے آنا مشکل ہو گیا۔

سات میل آگے سنڈیمن اور ٹانگی کے دامن میں عجیب وغریب ریگستان پھیلا ہوا ہے۔ بلند چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی نظر آتی ہیں۔ ان چوٹیوں میں پانی کا چشمہ پوشیدہ ہے جو آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ نظر آنے والی چیز صرف ایک موکھلا ہے جو پہاڑیوں کو کاٹ کر بنایا گیا ہے اور جہاں سے دن رات پانی بہتا رہتا ہے۔ اسے سحر کہہ لیجیے۔ اس کے علاوہ اس کا اور کوئی نام نہیں۔ یہ حیران کن قدرتی کرشمہ سیاحوں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دو تنگ پہاڑ عاشق اور محبوب کی طرح ہیں، جو زمین پر جدا ہوتے ہیں اور بادلوں کے نیچے پھر مل جاتے ہیں......

حکومت نے پانی کو اکٹھا کرنے کے لیے چند قدم کے فاصلے پر تالاب بنا دیا ہے جو تمام وادی اور آس پاس کی پہاڑیوں کی زمین کو سیراب کرتا ہے۔ تالاب کے کنارے پتھر کی میز اور رنگ برنگے پتھر سے جڑی ہوئی بینچیں اس کی خوبصورتی کو دوچند کرتی ہیں۔

نیچے اتر کر چھوٹے سے گاؤں فورٹ سنڈیمن میں (جو سر رابرٹ سنڈیمن کے نام پر رکھا گیا ہے) دیہاتی آج بھی اسی طرح کاشت کرتے ہیں، جس طرح ان کے آباؤ اجداد کرتے تھے۔ ان کے چہروں پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے اور وہ نگر نگر گھومنے والے سیاحوں کو دیکھ کر کبھی حسد محسوس نہیں کرتے۔ ان کی متانت اور استقامت ہر آنے والے کو متاثر کرتی ہے۔

واپسی پر مغرب کی جانب کوئٹہ سے آدھے راستے پر چمن واقع ہے جو آپ کو ضرور دیکھنا چاہیے، کیونکہ یہ پاکستان اور افغانستان کی سرحد سے صرف دو میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ ایک اہم تجارتی مرکز ہے اور یہاں سے بیرون ملک منڈیوں کو سامان بھیجا جاتا ہے۔ چمن میں ہمیشہ چہل پہل رہتی ہے، اور ریلوے اسٹیشن اور کسٹم ہاؤس پر افغانستان برآمد اور درآمد ہونے والا سامان آتا ہے۔ وہ سیاح جو تفریح اور تجارت کی خاطر نکلے ہیں چمن میں نیا تجربہ حاصل کریں گے۔

قدرتی حنا جھیل کے کنارے دھوپ میں آرام کس قدر فرحت بخش ہے! یہ کوئٹہ سے صرف ساڑھے چھ میل دور ہے اور حنا اور اُرک وادی میں پکنک کے لیے بہترین مقام ہے۔ گو یہ علاقہ زرعی مقصد کے لیے بنایا گیا تھا جہاں سے کوئٹہ اور چھاؤنی کو پانی مہیا کیا جاتا ہے لیکن اب اس کو

سیاحوں کے تفریحی مرکز کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ جھیل کا پر سکون ماحول سیاحوں اور مقامی لوگوں کو مسحور کر دیتا ہے۔ جھیل کو پہاڑ کے گرد بل کھاتی ہوئی پتلی سی خوبصورت سڑک جاتی ہے۔ جہاں کوئٹہ کی مشہور کوئلے کی کانوں کے دہانے نظر آتے ہیں۔ جھیل کے گرد تازہ لگائی ہوئی گھاس اور پھول پھیلے ہوئے ہیں۔ جن کا عکس نیلگوں پانی میں پڑتا ہے۔ جھیل کے ایک طرف قلعہ کی طرح بند بنا ہوا ہے جس کے سرخ پتھر سنہری دھوپ میں نہاتے رہتے ہیں۔

اس بند کے پیچھے زراعت کے لیے سپن اور کریز کے پانی کے ذخیرے ہیں، جس کا مطلب 'نیلے پھولوں کا پانی' ہے۔ نزدیک ہی تیرنے کا تالاب ہے جس کو کنٹونمنٹ بورڈ نے خاص طور پر غیر ملکی مہمانوں کے لیے بنوایا ہے۔ جھیل کے وسط میں چھوٹا سا تیرتا ہوا جزیرہ ہے جس پر ایک چائے خانہ بنا ہے۔ سیاح کشتیوں میں بیٹھ کر تازہ ہوا میں مشروبات کا لطف اٹھانے کے لیے وہاں جاتے ہیں۔ ایک اور مقام جہاں سیاح کھانے کے علاوہ جھیل کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ چھوٹا سا کیفے ہے جو پھولوں بھرے پارک کے درمیان بنایا گیا ہے اتوار اور چھٹی کے دن یہ کوہ پیماؤں سے بھر جاتا ہے جو پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ شہر اور جھیل کے درمیان بس بھی چلتی ہے۔

کراچی سے کوئٹہ آنے کے لیے ریل اور سڑک کے ذریعے بہت عمدہ ہیں۔ پاکستان ویسٹرن ریلوے کی لائن کوئٹہ سے سات میل دور سرائیپ کے مقام پر ضلع میں داخل ہوتی ہے اور ستاسی میل دور سرحد تک جاتی ہے۔ کوئٹہ سے ساٹھ میل دور شیلا باغ کے مقام پر ریلوے لائن خوجک سرنگ سے گزرتی ہے جو سطح سمندر سے چھ ہزار تین سو اٹھانوے فٹ بلند ہے۔ یہ سرنگ برصغیر پاک و ہند میں سب سے بڑی ہے اور تقریباً اڑھائی میل لمبی ہے۔

کراچی اور لاہور سے روزانہ صبح پی آئی اے کا جہاز کوئٹہ آتا ہے۔ نیا تھرمل اسٹیشن بننے کے بعد سے جہاز کی نشستیں عموماً پر ہوتی ہیں لہٰذا اپنی نشست پہلے سے محفوظ کرا لیجیے۔

کوئٹہ کا تھرمل اسٹیشن، جس کا افتتاح صدر ایوب نے 13 ستمبر 1964ء کو کیا، ایک خواب تھا جس نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ یہ شیخ منڈہ میں واقع ہے اور بجلی کی وہ تمام ضروریات پوری کرتا ہے جن کی ماضی میں وادی کوئٹہ کے کوئلے کے کانوں کے علاقہ میں شدید کمی محسوس کی جاتی تھی۔ اس کے شروع ہونے سے پہلے بجلی گھر ایک نجی کمپنی کی ملکیت تھا جو بجلی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے انتہائی ناکافی تھا۔ بڑی عجب سی بات ہے کہ کوئٹہ میں بجلی پیدا کرنے کے آلات 1891ء

میں لگے تھے جبکہ لاہور جیسے بڑے شہر میں بھی لوگوں نے بجلی کی روشنی کا لطف نہ اٹھایا تھا۔ یہ اسٹاف کالج میں نصب کیے گئے تھے اور باقی شہر میں گیس لیمپ اور لالٹینیں استعمال ہوتی تھیں پھر گھریلو استعمال کے لیے مقامی آلات سے تھوڑی مقدار میں بجلی پیدا کی گئی۔

نیا تھرمل اسٹیشن جہاں قریبی کانوں کا کوئلہ بطور ایندھن استعمال ہوتا ہے، پندرہ ہزار کلوواٹ بجلی پیدا کر سکتا ہے جو مساوی قوت کے دو چرخابوں (Turbines) سے پیدا ہوتی ہے۔ علاقہ میں پانی کی کمیابی کی وجہ سے تھرمل اسٹیشن میں ٹھنڈا کرنے کا نظام بھی ہے جو ایشیا میں اپنی قسم کا واحد ہے یہ اسٹیشن کوئٹہ اور اردگرد کے علاقوں کو بجلی مہیا کرتا ہے۔ جہاں زراعت اور کان کنی کے لیے بجلی کی شدید کمی ہو رہی ہے۔

یہ کتنی عظیم ترقی ہے! اس منصوبہ کی مشینری حیران کن ہے۔ یہ اسٹیشن کے تریسٹھ ایکڑ کے رقبہ میں نصب کی گئی ہے، جس میں انجینئروں کے لیے مکانات بھی شامل ہیں۔ یہ زلزلہ کا علاقہ ہے لیکن اب اسے مکمل طور پر زلزلہ سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ رہائشی علاقہ میں تمام جدید سہولتیں موجود ہیں۔ تھرمل اسٹیشن بیسویں صدی کی سائنس کا کرشمہ ہے۔ اس کا ڈھانچہ فولاد کے فریم سے گھرا ہوا ہے، بیرونی دیواریں کوئٹہ کی سردی کی شدت برداشت کر سکتی ہیں کیونکہ یہ سیمنٹ کے کھوکھلے بلاکوں سے بنی ہوئی ہیں اور لوہے سے جکڑی ہوئی ہیں۔

سیمنٹ اور بجری سے بنی ہوئی ایسی چھتیں اور کہاں ملیں گی۔ جنہیں پانی سے محفوظ کرنے کے لیے (Bilumen) کی موٹی تہوں سے ڈھکا گیا ہے۔ اس بجلی گھر کو دیکھ کر آپ کہہ اٹھیں گے کہ اسے نہایت فراخدلی سے تعمیر کیا گیا ہے۔ پلانٹ کی بھٹی باہر ہے اس کا دروازہ اندر کی طرف ہے، جو پوری طرح ڈھکا ہوا ہے۔ یہاں بھاپ پیدا کرنے کی مشینیں ہیں (جو شکاگو کی رلی سٹوکر اینڈ کمپنی کی بنی ہوئی ہیں) جو ایک گھنٹہ میں اسی ہزار پاؤنڈ بھاپ پیدا کرتی ہیں توبہ، توبہ، بھاپ کس قدر گرم ہے اس کا کامیابی کے ساتھ معائنہ کر لیا گیا ہے اور بجلی کا نرخ اس نرخ سے بہت کم ہے جو واپڈا کے انتظام سے پہلے لیا جاتا تھا۔

نیا تھرمل اسٹیشن قومی ترقی کے لیے واپڈا کی عظیم ترین خدمات میں سے ہے اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ صدر ایوب نے نہایت فخر سے اس کا افتتاح کیا۔ سیاح بھی اس عظیم عمارت کو دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑتے ہیں۔

کوئٹہ میں زندگی ذاتی دلچسپیوں اور دوستی سے رقم ہے۔ اگر اتفاق سے پاس پیسے نہ ہوں تو بھی دکان پر پانچ روپیہ قیمت کی چیز پکڑا دی جاتی ہے ایسی مہمان نوازی آپ کو ہر شہر میں نہیں مل سکتی۔ کوئٹہ زیادہ بھیڑ بھڑ کے والا شہر نہیں۔ مرکزی سڑک کو چھوڑ کر فی مربع میل بارہ لوگ بستے ہیں۔ خواہ آپ صاف ستھرے بازار اور چھوٹے چھوٹے قریوں میں سیر کر رہے ہوں یا چنار کے درختوں کے سایہ میں پہاڑیوں کے دامن میں تنہائی کا لطف اٹھا رہے ہوں، سیاحوں کو ہمیشہ خوش آمدید کہا جاتا ہے اور ان کی طرف خاص توجہ دی جاتی ہے۔

مجھے دو کہاوتیں بے حد پسند ہیں جو کوئٹہ اور اس کے لوگوں پر پوری اترتی ہیں۔ میکسیکو میں کہا جاتا ہے ''یہ آپ ہی کا گھر ہے۔'' دوسری کہاوت ان الفاظ کی خوبصورتی کو عظمت عطا کرتی ہے، یہ ان مقامات پر کہی جاتی ہے جہاں بہت سے لوگ جمع ہوں۔ یہ کوئٹہ میں بھی مشہور ہے۔ ''مہمان ہمیشہ درست کہتا ہے۔''

ملتان میں قیام

قدیم ملتان ایک حیرت انگیز شہر ہے، یہ خودرو پھولوں، تاریخ قدیم اور عہد نو کا ملجا و ماویٰ ہے، اس کے آس پاس مختلف الاصل پاکستانی آباد ہیں جو علم و دولت کے ذریعے فولاد، تانبا اور برقی طاقت حاصل کرنے میں سرگرم عمل ہیں تا کہ انہیں اپنی روزمرہ زندگی کی مشکلات کے چکر سے رہائی نصیب ہو۔

پچھلے کئی سالوں سے سیاح حضرات ملتان کے قریب سے گزر جاتے تھے، ان کا خیال تھا کہ ملتان ایک فرسودہ سی جگہ ہے اور یہاں جدید قسم کے آرام و آسائش کی کوئی گنجائش نہیں، اسی طرح اور بھی کئی قسم کے خیالات تھے جن کے باعث سیاح دنیائے قدیم کے اس خطے کی سیر سے کما حقہ لطف اندوز نہ ہوتے تھے، اگر ریل کے ذریعے سفر کیا جائے تو آپ ایک دن میں یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ البتہ موٹر کے سفر میں زیادہ دن لگتے ہیں لیکن اب ملتان میں پی آئی اے کی روزانہ فضائی سروس ہوگئی ہے آپ ایک ہفتے میں چار مرتبہ بذریعہ ہوائی جہاز چار گھنٹوں سے بھی کم مدت میں ملتان پہنچ سکتے ہیں، باقی تین دن کوئٹہ کے راستے فضائی سفر کر سکتے ہیں، آپ کسی راستے سے آئیں آپ کی یہ پرواز پُر منظر اور دلکش ہوگی ملتان تاریخی لحاظ سے کبھی بڑی طاقت و اہمیت کا حامل تھا۔ صدیاں گزریں برطانیہ کے زیرِ نگیں ہونے سے پہلے یہ عربی سلطنت کا ایک صوبہ تھا نوجوان مسلم سپہ سالار محمد بن قاسم نے اسے 712ء میں فتح کیا تھا، اس کے بعد 1005ء میں محمود غزنوی نے اس پر قبضہ جمایا، پھر امیر تیمور نے اسے زیر کیا اور 1398ء تک اس پر حکومت کی بعدازاں یہ مغلیہ سلطنت کا حصہ بن گیا۔ ان تمام فاتحین کے اسلاف نے اس کے آباد کرنے میں حصہ لیا۔ قدیم کتبوں اور دفینوں سے جواب دریافت ہوئے ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی تہذیب مصر اور چین کی تہذیبوں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ طاقتور اور سرکش دریائے سندھ نے اس وادی کو قابل کاشت اور زرخیز بنا دیا تھا لیکن اسی دریا نے اپنے مسلسل سیلابوں کی وجہ سے اسے تباہ و برباد بھی کیا جن سے اس میں جغرافیائی تبدیلیاں ہوئیں اور اس کے گردونواح کے علاقوں میں بھی، چنانچہ اس کی نصف آبادی ان سیلابوں کی نذر ہوگئی بعد میں آنے والی نسلوں نے اسے دوبارہ آباد کیا لیکن اب کی بار اسے آب و ہوا کی تبدیلیوں نے پریشان کر دیا جن کے باعث دریا خشک ہوگئے اور زمین ریتلی بن گئی، اس زمانے میں ملتان کو دریائے سندھ سے دس میل پرے آباد کیا گیا جس کے سرکش پانی کو آج سائنسی علوم کی بدولت زیر کر لیا گیا ہے اور اب وہ اس کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے انسانی دسترس میں ہے، میں کئی دنوں تک حیرت و استعجاب سے ملتان اور اس کے باشندوں کے متعلق معلومات فراہم کرتی رہیں، میں کئی ایسے راستوں پر سے گزری، جن میں مختلف قوموں کے باشندے آباد تھے جو دنیا کے مختلف ممالک سے یہاں آئے تھے برطانوی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی، سیویس، لبنانی اور امریکی، میں حیران تھی کہ وہ کس جذبہ محرکہ سے متاثر ہو کر یہاں آگئے ہیں۔ ملتان پاکستان کے دلکش اور دلفریب شہر لاہور سے 209 میل دور ہے، موسم گرما میں اس کی گرمی منطقہ حارہ سے بھی تجاوز کر جاتی ہے جو مسلسل بارشوں اور طوفانوں میں تحلیل ہو جاتی ہے، پرانے لوگوں نے اس کی تعریف یوں کی ہے ۔

چار چیز است تحفۂ ملتان
گرد و گرما، گدا و گورستان

لیکن میرے خیال میں یہ شعر کسی سیاح کا نہیں ہو سکتا کیونکہ خوش قسمتی سے میں ملتان میں موسم بہار کے اواخر میں وارد ہوئی تھی۔ جب میں یہاں آئی تو موسم میں خنکی تھی اور فضا سورج کی ملائم روشنی میں شرابور تھی، یہ ایک ایسا شہر تھا جو جھلسی ہوئی زمین میں سے اوپر اٹھتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ یہ وہ شہر تھا جس کے سامنے ایک درخشندہ مستقبل تھا جو شاندار منصوبوں کے شور سے گونج رہا تھا۔ متذکرہ بالا غیر ملکی لوگ بڑے اطمینان قلب کے ساتھ مغربی پاکستان کی فلاح و بہبود کے لیے سرگرم عمل تھے فرانسیسی کھاد کا پلانٹ تعمیر کر رہے تھے، امریکی پاکستانیوں کے دوش بدوش ایک اعلیٰ

درجے کا فضائی اڈہ مکمل کر رہے تھے اور جرمن، لبنانی، سیوس، اطالوی اور برطانوی باشندے واٹر اینڈ پاور ڈیویلپمنٹ اتھارٹی کی زیرِ نگرانی کام میں مصروف تھے اس اتھارٹی کو پیار سے واپڈا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

واپڈا میں ایک خاص خصوصیت ہے۔ وہ اپنی آغوش وا کیے کئی مسائل کا خیر مقدم کر رہی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ کولمبو کے تحت تیار ہونے والا منصوبہ ملتان سے جانب مغرب 300 میل دور ورسک میں واقع ہے، جس کا کام صرف دریائے کابل کے نیچے کی مٹی کھودنا اور زمین دوز سُرنگیں تعمیر کرنا ہے لیکن اس کے مقابلے میں واپڈا اہم خصوصیت کی حامل ہے۔ اس کے کنٹرول روموں میں ایسی لیبارٹریاں ہیں جن میں ایسے سوئچ اور چمکدار بٹن لگے ہیں کہ انہیں آہستہ سے دبانے سے گیس کی مشینیں چلنے لگتی ہیں، برقی طاقت پیدا ہونے لگتی ہے اور پانی ٹھاٹھیں مارتا ہوا مطلوبہ مقامات پر پہنچنے لگتا ہے۔ واپڈا کے طفیل جو کامیابی ملتان کو نصیب ہوئی ہے وہ اس کے باشندوں کی انتھک محنت اور جانفشانی کی مرہون منت ہے جنھوں نے وہ تھرمل سٹیم پیدا کر لیا ہے جس کی وجہ سے سوئی گیس کو دور دراز مقامات سے پائپ لائنوں کے ذریعے سارے علاقے میں لایا جاتا ہے۔

سیاح جن کو ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، عظیم الشان ملتان پاور ہاؤس کے مناظر اور شور کو سن کر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اس پاور ہاؤس میں جدید ترین آلات نصب کیے گئے ہیں شیشے سے ڈھکی ہوئی میزوں کی قطاریں تاروں کے تانے بانے کا عجیب و غریب منظر پیش کرتی ہیں، صرف انگلی سے ایک بٹن دبانے سے مشینیں ورسک سے بجلی فراہم کرنے لگتی ہیں، یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیچھے کوئی جن کھڑا ہے جو الہ دین کے چراغ میں سے مسکرا رہا ہے میں نے ایک کمرے میں جا کر دیکھا کہ دیوار میں فریجد یٹر سے ملتی جلتی ایک چیز دیوار میں نصب ہے، جس میں متعدد ٹیوبیں اور چمکدار چیزیں لگی ہوئی ہیں غور کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ ٹیلی فون کا نیا طاقتور شعبہ ہے جو پشاور میں واقع ورسک کے سرکلر سرکٹ کو لاہور سے ملاتا ہے یہ شعبہ اب سرگرم ِعمل ہے اور ٹیلی فون کا نیا ڈائلنگ سسٹم از حد مقبول ہو رہا ہے انجینئروں کو اکثر اس سے حیات بخش نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ یہ منصوبہ اطالوی، امریکی، یوگوسلاوی باشندوں اور پاکستانیوں نے تیار کیا ہے اور ان کی مشترکہ کوششیں بڑی نتیجہ خیز ثابت ہوئی ہیں۔ اب اس پر واپڈا کا مکمل کنٹرول ہے اور اسے

اقوام متحدہ کی ایک کامیابی سمجھا جاتا ہے۔

واپڈا کی دوسری کامیابی ملتان تھرمل پاور سٹیشن ہے جو برصغیر پاک و ہند میں اپنی قسم کا سب سے بڑا اسٹیشن ہے جو سوئی گیس سے 350000 کلوواٹ بجلی پیدا کرتا ہے اس کی پائپ لائن دریائے سندھ کو عبور کرتی ہے اور تین سو میلوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ پائپ دو ملین مکعب فٹ گیس مہیا کرتی ہے جس سے تیز رفتار ٹرینیں چلتی ہیں اس میں حیرانگی کی کوئی بات نہیں کہ سندھ طاس متبادل سکیم کی بلین ڈالر کی عمارت کے سوا یہ پاور ہاؤس واپڈا کا محبوب ترین منصوبہ ہے واپڈا کے پہلے صاحب فہم چیئرمین مسٹر غلام فاروق کی حالت بلاشبہ یہ تھی کہ وہ اسی منصوبے کی دُھن میں جیتے تھے اسی کے خیال میں سوتے اور اسی کے خواب دیکھتے تھے غرضیکہ وہ روز و شب اسی منصوبے کے متعلق سوچا کرتے تھے یہ اُنہی کا مشورہ تھا جس کے باعث دوسرے ممالک کے ماہرین اور مشیران پاکستان آئے تا کہ وہ پاکستانیوں کو انجینئری اور سائنسی کاموں کی تربیت دیں، جو واپڈا کے پلانٹ کو چلانے میں از حد ضروری تھے، پہلے سال غلام فاروق نے امریکہ کا دورہ کیا، وہ اس کے لیے بڑے پُر جوش تھے، آپ نے وہاں کے لوگوں کے سامنے گلوگیر لہجے میں اس معاملے کو پیش کیا اور انہیں سمجھایا کہ میرے ہموطن بنجر زمین میں زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں ان کے چاروں طرف خشک ریتلی زمین ہے جو کوشش اور امداد سے زرخیز بن سکتی ہے آپ نے یہ بھی بتایا کہ ہم نے واپڈا کی بنیاد رکھ دی ہے لیکن ہمارے نوزائیدہ ملک میں سرمائے کی کمی ہے، آپ نے جوانوں کی طاقت کے ضائع ہونے اور بیکاروں کے لیے روزگار کی ضرورت کی نشاندہی بھی کی، تا کہ وہ لوگ اپنی زمینیں کاشت کریں، خوراک پیدا کریں اور اپنی روزی کمائیں، آپ نے دنیا کے بینکروں کو دعوت دی کہ وہ اس کام میں سرمایہ لگائیں اور ہمارے ملک آ کر ہماری سرگرمیاں اور جدوجہد ملاحظہ کریں اور ہمارے مسائل پر ہمدردی سے سوچیں، آپ نے کہا ''آپ دیکھ لیں گے کہ اس امداد کی وجہ سے ہم خود کفیل ہو جائیں گے۔''

غیر ملکی آئے اور انہوں نے بچشم خود ان باتوں کا مشاہدہ کر کے امداد کی تجویز منظور کر لی۔ یہ لوگ جنگ سے نہیں بلکہ پاکستانیوں کی محنت شاقہ اور جدوجہد سے مفتوح ہو گئے۔

میں کوئی انجینئر نہیں، نہ میں کسی انجینئر کی رشتہ دار ہوں، میں تو ایک کیل بھی سیدھی نہیں کر سکتی کوئی معمہ حل نہیں کر سکتی لیکن واپڈا کی یہ کارکردگی مجھے اتنی پیاری لگی کہ آج میں دل و جان سے

سفارش کرتی ہوں کہ ملتان پاور ہاؤس کی سیر ضرور کرنی چاہیے۔ اس پاور ہاؤس کے قریب ایک خوبصورت ریسٹ ہاؤس بھی ہے، جہاں صرف پانچ روپے کے عوض بستر اور بہترین ناشتہ مل جاتا ہے۔ باورچی بھی بہت اچھا ہے۔

اس کے علاوہ ملتان میں اور کیا ہے؟ ملتان شہر کے چھ دروازے ہیں جو مختلف سمتوں کو جاتے ہیں دہلی دروازے کا رُخ قدرتی طور پر دہلی کی طرف ہے، حرم دروازہ اس جگہ واقع ہے جہاں مغل شہنشاہ اپنی حسین و جمیل خواتین کو رکھا کرتے تھے (اب ان کی تلاش فضول ہوگی)۔ پاک دروازہ قلعے کی جانب ہے جہاں گذشتہ جنگوں کے بعد امن و امان کا دور شروع ہوا تھا۔ خونی برج دروازہ اس مقام پر واقع ہے جہاں کبھی بڑے قتل ہوتے تھے، اور بوہڑ دروازہ ایک دیو قامت بڑ کے گرد بنایا گیا ہے۔ آخر میں لاہوری دروازہ ہے جو لاہور کو جانے والی شاہراہ پر واقع ہے۔ ایک خوبصورت منڈی ہے، جو تجارتی اشیاء سے بھری پڑی ہے، یہ ایشیا کی بڑی منڈیوں میں شمار ہوتی ہے۔ لاہوری بازار میں آپ ادنیٰ سے اعلیٰ اشیاء تک خرید سکتے ہیں میں نے گائے کے گلے میں ڈالے جانے والے پیتل کے گھنگرو دو آنے فی گھنگرو کے حساب سے خریدے تھے ایک اور عمدہ سودا بھی خریدا جا سکتا ہے جو کمرے کی زیبائش کے کام بھی آ سکتا ہے یہ ہے تانبے کی استری جس میں کوئلہ جلایا جاتا ہے میں کوئی قنوطی نہیں ہوں، لیکن بعض دفعہ بجلی فیل ہو جاتی ہے اور پرانے فیشن کی استری سے بخوبی کام چل سکتا ہے۔ یہ منڈی بڑی اہم ہے، لوگوں کو اس کا چکر کاٹنے میں کافی ہمت سے کام لینا پڑتا ہے کم از کم دو دن تو لگ جاتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کبھی ختم ہونے کا نام نہ لے گی۔ اس منڈی میں آپ کو اونٹ کی کھال کے بنے ہوئے لیمپ ملیں گے، اس قدیم شہر میں جہاں اونٹ کثرت سے ہیں مشہور ہے کہ ایک شتربان اپنے اونٹ کی موت سے اتنا غمزدہ ہوا کہ وہ اس کی جدائی برداشت نہ کر سکا، آخر اس نے اونٹ کی کھال اتار کر اپنے پاس رکھ لی اور اس سے گدیاں اور لیمپ تیار کر لیے تاکہ یہ دونوں چیزیں دوست کی یادگار کے طور پر محفوظ رہیں۔ یہ خیال عام ہو گیا اور بات چل نکلی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اونٹ کی کھال کے لیمپ سب کے سب ملتان کے کاریگر ہی تیار کرتے ہیں، ان کے علاوہ اس منڈی میں کامدانی جوتے ہیں جن پر سونے اور چاندی کے تاروں کا کام ہے، برتن ہیں، چینی مٹی کے ظروف ہیں، جن کی خوبصورتی کی تعریف الفاظ میں نہیں ہو سکتی، منڈی کی فضا میں مسالے دار ہوا کی تیز مہک رچی بسی رہتی ہے خوانچہ والے

اپنے خوانچے لیے ادھر اُدھر گھومتے اور آوازیں دیتے رہتے ہیں ایک طرف سنگتراش بیٹھے ہیں جو سفید پتھر کے ٹکڑوں پر مزاروں اور قبروں کی لوحیں تیار کرنے اور ان پر موزوں اشعار کندہ کرتے ہیں۔ ملتان کے باشندوں کو ان لوحوں سے بڑی محبت ہے، ان میں سے اکثر اپنے مزار کے لیے کتبے کا انتخاب کرتے ہیں، حالانکہ ان کی صحت ابھی قابل رشک حد تک اچھی ہوتی ہے۔ کوئی شخص اس کے اس انتخاب پر اعتراض نہیں کرتا۔ بعض دفعہ اس انتخاب میں سارا خاندان شریک ہوتا ہے اور ہر شخص اپنی رائے پیش کرتا ہے۔

شہر کو جانے والی تمام سڑکوں پر دو رویہ پھولوں کے پودے ہیں، قلعے کی سفید اور گلابی دیواریں قدیم شہر کے بازاروں کے دوش بدوش کھڑی ہیں۔ مسجدوں کی دیواروں اور محرابوں میں سرخ قیمتی پتھر جڑے ہوئے ہیں جو روشنی میں چمکتے ہیں، پاک دروازے کے قریب اونچی دیواروں والا ایک باغ ہے۔ اس میں دو برطانوی سپاہیوں کا مقبرہ ہے جو اپنے فوجی دستے کی حفاظت کرتے ہوئے اس مقام پر مارے گئے تھے وہ ایک مزار کے نیچے جو ان کی یاد میں تعمیر کیا گیا ہے آرام کر رہے ہیں۔ انگریز کو یہاں سے رخصت ہوئے مدت ہو گئی ہے لیکن ملتان کے پاکستانی اب بھی اس یادگار کی حفاظت کر رہے ہیں جس پر عشق پیچاں کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں وہاں جو کتبہ نصب ہے اس کے الفاظ آسانی سے پڑھے جا سکتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پیٹرک ویکس ایگینو اور ولیم اینڈرسن کی بہادری کو ایک دوست ملک میں آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر لیا گیا ہے تاکہ سب لوگ اسے دیکھنے کے لیے رکیں اور اس پر غور کریں۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ ملتان میں میرا آخری قیام ملتان پاور ہاؤس میں ہوا، میں نے سوچا کہ اس کے اندر جا کر اس پر الوداعی نگاہ کس طرح ڈالوں؟ اس کے پُر پیچ گنبدوں کے قریب کس طرح جھکوں؟ اس کی سیدھی شاہ نشینوں پر کھڑے ہو کر ہلکے نیلے آسمان کے پس منظر میں وہ بالکل نئی وضع کا معلوم ہوتا تھا اس کی پیچدار سیڑھیوں پر اردو، بنگالی اور پنجابی مزدوروں کی ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، یہ ایک اور قسم کا مینارۂ بابل معلوم ہوتا تھا جو اس لیے تعمیر کیا گیا تھا کہ مدت تک قائم رہے اس کا ڈیزائن اور طرز تعمیر بھی مسحور کن ہے۔

میں دو منزل نیچے اتر کر بوائلر روم میں داخل ہو گئی، اس کمرے کے انگریز انجینئر نے ہنس کر کہا، ''یہ بوائلر نہیں ہیں بلکہ ہارٹل پول سے آتے ہوئے گیس آلٹرنیٹرز ہیں'' یہ دیکھنے میں حیرت

انگیز معلوم ہو رہے تھے وہ فولاد کے بنے ہوئے تھے لیکن شیشے سے زیادہ ملائم تھے میں نے دل میں خیال کیا کہ یہ ایک ٹرین، سر کا پچیسویں صدی کی کتنی مکمل تصویر ہیں، بہت تیز رفتار ٹرین کہ جس کی رسی کھینچوا دو وہ جھٹ دوڑنے لگے، لیکن پھر میں نے سوچا مجھ پر کون یقین کرے گا، مجھے تو یہ ابھی تک ریل کی پٹڑی پر پڑے ہوئے بوائکروں کی طرح معلوم ہو رہے تھے، پھر مجھے یاد آ گیا کہ یہ تو ''آلٹرنیٹرز'' ہیں یہ طاقت پیدا کرتے ہیں سٹیم بناتے ہیں اور سٹیم سے اسے برقی طاقت میں تبدیل کر دیتے ہیں، گرم سٹیم اور بہت زیادہ سٹیم ......لیکن یہ سب کچھ ابھی تک میرے لیے فریب نظر تھا، لیکن مجھے اس سے اور اس کی چمکیلی سطح سے پیار تھا میں کبھی خواب میں بھی یہ تصور نہ کر سکتی تھی کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ میں بوائکر روم (معاف کیجیے آلٹرنیٹرز) دیکھنے کے لیے بازار میں سے گزروں گی مگر آخر ایسا ہو کر رہا لیکن ملتان کی بہتر اور روز افزوں بڑی بڑی ترقیات سیٹلائٹ قصبات کے متعلق کیا کہوں ......وہ سب دوش بدوش دوڑ میں شریک ہیں کہ دیکھیں کون اول آتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ واپڈا نے اپنے منتخب کردہ کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا ہے، جن میں ٹیلی فون کا ڈائلنگ سسٹم شامل ہے، جس کے ذریعے پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کے درمیان دور دراز مقامات سے ٹیلی فون کیا جا سکتا ہے......تاہم وہ ان کاموں کو کس طرح ختم کریں گے، واپڈا کے کرتا دھرتا منصوبوں کو پایۂ تکمیل پہنچانے والے دماغ کے مالک ہیں، وہ کون سی بڑی ہستی ہے جو کامیابی حاصل کر کے رُک جاتی ہے؟ واپڈا والے مسلسل کام کرتے رہیں گے تاکہ اپنے ہموطن اہلِ پاکستان کی فلاح و بہبود کے لیے زیادہ سادہ طریقے اور نئی نئی راہیں تلاش کریں۔

ہڑپہ شہرِ خموشاں

اگر آپ مکمل آرام وہ جگہ کی تلاش میں ہیں تو ہڑپہ میں قیام اس کا بہترین جواب ہے۔ اس کے گرد و نواح میں آج بھی وہ بیل گاڑیاں نظر آتی ہیں جو صدیوں پہلے اس دور کے لوگ استعمال کرتے تھے۔ پگڑیاں باندھے ہوئے ان کے مالک چلتے ہوئے تناور جانوروں کی باگیں کھینچتے ہیں یا اپنی بھاری بھرکم گاڑیوں کے پچھلے حصے میں چہرے پر طمانیت کی مسکراہٹ لیے بیٹھ جاتے ہیں یہ سواری کا وہی ذریعہ ہے جو چار ہزار سال پہلے ان کے آباؤ اجداد استعمال کرتے تھے۔

پاکستان میں سردیوں کے ٹھنڈے مہینوں کے بعد جب موسم بہار کسی کی یاد دلاتا ہے۔ ہڑپہ اپنے جوبن پر ہوتا ہے۔ یہ لاہور سے ایک سو اٹھارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ آپ کی کار (یا ریل) سابق پنجاب کے نہری علاقے کے میدانوں سے گزرتی ہے جہاں گندم کے کھیت لہلہاتے ہیں اور خاموش طبع لیکن پُر خلوص پنجابی ہل چلاتے اور زمین سے اپنی روزی پیدا کرتے۔

ان سادہ لوح کسانوں کے لیے زندگی عملاً یکساں رہتی ہے۔ درحقیقت وہ جدید دنیا کے طور طریقوں اور ہمارے لباس کو دیکھ کر ہنستے ہیں۔ ان لوگوں کا لباس کمر کے گرد لپٹی ہوئی چادر اور لمبا کُرتا ہے۔ وہ اپنے کھانے کے لیے اناج اُگاتے ہیں۔ کچھ بڑھئی ہیں جو کرسیاں اور چارپائیاں بناتے ہیں لیکن عموماً یہ لوگ اپنی جھونپڑیوں میں سخت زمین پر کمبل بچھا کر سوتے ہیں۔ گیہوں سے بے تحاشا لدی ہوئی اونٹ گاڑیاں وزن کرنے کے لیے مال خانے لے جاتی ہیں۔ سب کے لیے

کھانا، کپڑے، عورتوں اور بچوں کے لیے جھلمل کرتے زیورات اور چوک میں چائے خانہ پر بڑا سا ریڈیو۔ یہ ان کی زندگی ہے جو برسہا برس سے ایک ہی ڈگر پر چل رہی ہے۔ جب گاؤں کی کوئی دوشیزہ اپنے اَن دیکھے دولہا کے گھر پالکی میں بٹھا کر لے جائی جاتی ہے تو کوئی لمبی چوڑی رسمیں نہیں ہوتیں صرف چند گھنٹے غل غپاڑہ اور بھاگ دوڑ میں گزر جاتے ہیں ۔تمام لوگ تقریبات میں شریک ہوتے ہیں اور اس دن کام بالکل رُک جاتا ہے۔ ایسے وقت ہر کوئی خوش ہوتا ہے اور ان چھوٹے قصبوں میں پیدائش، شادی اور موت ایک عوامی معاملہ ہوتا ہے اور ہر موقعہ پر اس کے مطابق ہمدردی یا مبارکباد دی جاتی ہے۔

ہڑپہ تین ہزار قبل مسیح میں عروج پر تھا۔ اپنے مشترکہ دارالحکومت موہنجوڈارو سے اس کا گہرا تعلق تھا اور دونوں شہروں کے درمیان وسیع پیمانے پر تجارت ہوتی تھی۔ یہاں کے کھنڈرات سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے لوگ مالدار تاجر تھے جو شاہانہ عظمت کے بغیر بڑی منضبط روایتی زندگی بسر کرتے تھے۔ کسی بادشاہ نے ٹھاٹھ باٹھ کی اجازت نہیں دی۔ یہاں بتوں کی پوجا نہیں ہوتی تھی۔ یہاں سادہ اور باوقار خودکار حکومت تھی جس میں ہر شہری کو مساوی حقوق حاصل تھے ان کی تہذیب کوئی خاص عظمت حاصل کیے بغیر مر گئی۔ تمام چیزوں میں یکسانیت بنیادی اصول تھا۔ لوگوں کا رجحان زراعت کی طرف تھا۔ جن علاقوں میں کھدائی ہوئی ہے اس سے بڑے بڑے ہوا دار گوداموں اور اناج گھروں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک قلعہ کے کھنڈرات کے نشانات اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ پرانا شہر دریائے راوی کی دو شاخوں کے درمیان تعمیر ہوا تھا۔ ایک بڑی فصیل کے نشان بھی ملتے ہیں جو سیلاب کا پانی روکنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ پانی کے نکاس کے عمدہ طریقہ سے ان کی فہم و فراست کی تصدیق ہوتی ہے۔ رہائش کے علاقہ سے دور اور باہر اینٹوں کے بھٹے سے یہ یقین ہوتا ہے کہ ہڑپہ کے لوگ اپنے آس پاس دھواں پسند نہیں کرتے تھے۔ کھدی ہوئی مہریں جو مختلف کھدائیوں سے ملی ہیں قیمتی قسم کی ہیں اور یقیناً عام لوگوں کی ملکیت تھیں۔

زیورات، بازو بند، سونے کی تختیاں اور کم قیمتی پتھر جو کھنڈرات سے ملے ہیں۔ ہڑپہ کے

تاجروں کے تبت، ایران، میسوپوٹیمیا اور شمالی برما سے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے ڈیزائن پیچیدہ اور باریک ہیں اور ان کے بنانے میں بڑی محنت صرف ہوتی ہو گی۔ ان کے برتن بالکل سادہ اور بغیر کسی کام کے ہیں۔ ہڑپہ کی ہر چیز، معہ ان کی روزمرہ کی زندگی کے انتہائی سادگی کی نشاندہی کرتی ہے۔ بہرحال اس سادگی میں بھی وقار تھا۔ بربروں کے آنے اور اُن کی فتح سے پہلے تک ان کی حکومت کا تسلسل برقرار رہا۔

ہڑپہ کے کھنڈرات سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی سادہ تہذیب کے اندر نیک دل دھڑکتے تھے۔ ان کے بہت سے خیالات آج کی جدید دنیا کے مقابلے پر اترتے ہیں۔

ان سیاحوں کے لیے جو ہڑپہ کے دور کے متعلق پوری تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ حکومت نے ایک ریسٹ ہاؤس بنوایا ہے جہاں جدید سہولتیں اور اچھا باورچی مہیا ہے اور ماحول میں پُرسکون خاموشی ہے۔

عظمت و وقار کا شہر لاہور

مغل شہنشاہوں کے اس قدیم شہر کا ایک اپنا مقام ہے۔ اس کے گلی کوچوں کی ایک اپنی انفرادیت ہے۔ بازاروں میں بڑی گہما گہمی رہتی ہے گلبرگ کے درختوں سے گھرے ہوئے علاقے میں زندگی بڑی پُرسکون ہے اور شہر کے بڑے بڑے بازاروں میں جہاں نئی اور پرانی دکانیں ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی ہیں ہر وقت رونق رہتی ہے۔ پھیری والے، رس بھرے پھل، کھلونے، چمکتے، دمکتے ہار اور دوسری چیزیں بیچتے پھرتے ہیں۔ یہاں ضرورت کی ہر چیز مل جاتی ہے۔ گلی گلی آلتی پالتی مارے درزی بیٹھے ہیں جو ہر کام کرنے کو تیار ہیں خواہ ٹوٹا ہوا بٹن لگانا ہو یا اچانک پھٹے ہوئے کپڑوں کی مرمت۔

لاہور میں ہر طبقے کے لوگ آباد ہیں۔ باہر سے آنے والوں سے نہایت محبت سے پیش آتے ہیں۔ فطرتاً صاف گو ہیں اور ہر بات پر اپنی رائے کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ یہ لوگ داستانوں کے رسیا ہیں۔ یہاں پرانے دور، خوشیوں، جنگوں اور روحانی کہانیاں آج بھی سننے کو ملتی ہیں۔ اس علاقے کے رومان کو ہمایوں، اقبال اور موجودہ دور کے شاعروں نے شاعری کے روپ میں ڈھالا ہے اور یہ نغمے آج بھی گائے جاتے ہیں۔

سایہ دار درختوں سے ڈھکی، بل کھاتی مال پر دھیمی دھیمی باتوں کی آواز آتی ہے اور ہلکے ہلکے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ صبح نور کے تڑکے سے شام ڈھلنے تک لاہور کی اس سیر گاہ پر رونق رہتی ہے...... یہ سابق پنجاب کا علاقہ ہے اور مغربی پاکستان کا دارالحکومت پنجاب کے لوگ لاہور کو ''پاکستان کا دیوان خانہ'' کہتے ہیں۔

لاہور کے باسیوں کو اپنے شہر سے اس قدر محبت ہے کہ وہ ساری دنیا گھوم آئیں اور دوسرے ملکوں کی خوبصورتی سے متاثر بھی ہوں لیکن واپسی پر یہی کہتے ہیں ''مشرق ہو یا مغرب، لاہور لاہور ہے۔'' شام کو شیزان یا ہیکو (Hico) ریستوران میں چائے پیتے ہوئے آپ پنجاب کے جوانوں، سیاحوں اور پاکستان کے کونے کونے سے آئے ہوئے لوگوں کو شلوار قمیض پہنے دیکھ سکتے ہیں۔ ساڑھیوں میں ملبوس خواتین مغربی لباس پہنے مردوں کے ساتھ آتی ہیں۔ شوٹنگ کا لباس زیب تن کیے فلمی ستارے بڑی بڑی دکانوں میں خرید و فروخت کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ شہر اس قدر خوبصورت ہے کہ وہ سیاح بھی جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے ہر چیز دیکھ رکھی ہے۔ یہاں زیادہ سے زیادہ قیام پسند کرتے ہیں اور اگر موقع مل جائے تو کون نہ ٹھہرے؟ لاہور میں نئی نئی چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ گلیوں میں رہنے والی لڑکیاں پردۂ سیمیں کی شہزادیاں بن جاتی ہیں اور دلفریب ماحول میں اجنبی خود کو بڑا بلند محسوس کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے رات کو معجزے ظہور میں آتے ہیں اور سیر کرنے والا وسیع حال اور ماضی کا حصہ بن جاتا ہے۔ فضا کی سنجیدگی دل اور رُوح پر چھا جاتی ہے۔

کراچی سے سات سو پچاس میل دور لاہور مغربی پاکستان کی سیر کی خصوصیت ہے۔ کراچی سے جدید ایئرکنڈیشنڈ ریلیں چلتی ہیں اور سفر چوبیس گھنٹے سے بھی کم کا ہے۔ راستے میں ٹرین مختلف اسٹیشنوں پر رکتی چلتی ہے جہاں لوگ چوڑیاں، پھل اور نوادرات بیچتے ہیں۔ پی آئی اے کے جہاز سے یہی سفر دو گھنٹہ پچیس منٹ میں طے ہو جاتا ہے۔ جہاز روزانہ صبح چھ بجے روانہ ہوتا ہے اور لاہور پہنچنے سے پہلے بڑا لذیذ ناشتہ دیا جاتا ہے۔

لاہور مغلیہ فنِ تعمیر کا شہر ہے۔ تاریخی طور پر راجہ جے پال کے عہد میں (900ء سے 1002ء تک) یہ طاقت کے مرکز کی حیثیت سے ابھرا۔ بعد میں جے پال کی فوجوں کو شکست ہوگئی اور لاہور فاتحین کا دارالخلافہ بن گیا۔ اگلی پانچ صدیوں میں لاہور پر خاندانِ غلاماں، تغلق، سید اور لودھی بادشاہوں نے باری باری حکومت کی۔ لودھی خاندان کا خاتمہ اس وقت ہوا جب پنجاب میں دولت خاں لودھی نے کابل کے بادشاہ کے خلاف مدد کی درخواست کی۔ ترکستان میں پیدا ہونے والے بابر نے جو چنگیز خاں کے خاندان سے تھا، یہ درخواست قبول کر لی اور دشمن بادشاہ کو شکستِ فاش دی، بابر نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور 1526ء میں سلطنتِ مغلیہ کی بنیاد ڈالی۔ 1530ء میں بابر کے انتقال کے بعد تخت اس کی اولاد کو ملا۔ انہوں نے پنجاب اور کابل پر حکومت کی اور

مشہورِ زمانہ جرنیلی سڑک تعمیر کرائی۔ 1585ء میں مغل شہنشاہ اکبر نے لاہور کو اپنا دارالقام بنایا۔ لاہور کے قلعہ کی مضبوطی اور خوبصورتی اکبر کی مرہونِ منت ہے جس نے مٹی کے قلعہ کی پتھر سے دوبارہ تعمیر کرائی۔ اکبر کے بیٹوں اور پوتوں نے اپنے عہد میں اس کی خوبصورتی میں اضافہ کیا۔ سیاح قلعہ میں شیش محل کی صناعی دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ محدب شیشوں کے ٹکڑے آج بھی صدیوں پہلے کی طرح جگمگاتے ہیں قلعہ میں ایک قابلِ ذکر چیز شاہ برج دروازہ ہے جس کی دیواروں میں تصویریں بنی ہوتی ہیں۔ پلاسٹر پر بنی ہوئی یہ تصویریں مغلوں کے کھیلوں کی تفصیل بیان کرتی ہیں۔

اکبر کے عہد میں ایک رقاصہ انارکلی اس کے بیٹے شہزادہ سلیم جو بعد میں جہانگیر کے نام سے مشہور ہوا کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ شہزادہ نے بھی محبت کا جواب محبت سے دیا۔ اکبر نے ایک دن جب انارکلی اور شہزادہ کو ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے دیکھا تو اسے ان کی محبت کا علم ہو گیا۔ اکبر کو یہ دیکھ کر سخت طیش آیا کہ ایک کنیز اس کے بیٹے سے محبت کرنے کی جرات کرسکتی ہے۔ اس نے انارکلی کو سزائے موت دی اور حکم دیا کہ اسے دیوار میں زندہ چنوادیا جائے۔ اس افسوسناک واقعہ سے شہزادہ سلیم کا دل ٹوٹ گیا۔ کئی سال بعد جب وہ بادشاہ بنا تو اس نے مقبرہ پر نہایت خوبصورت سفید اور قرمزی گنبد تعمیر کروایا۔ یہ یادگارِ لاہور کے وسط میں آج بھی قائم ہے اور انارکلی کے مقبرہ کے نام سے مشہور ہے۔ ہزاروں سیاح اسے دیکھنے آتے ہیں۔ مقبرہ کے ایک طرف خدا کے ننانوے صفاتی نام لکھے ہوئے ہیں اور دوسری طرف جہانگیر کے اشعار ہیں جو اس کے دُکھی دل کی پکار ہیں............

"آہ، اگر ایک بار میں اپنی محبوبہ کا چہرہ اور دیکھ سکتا تو قیامت تک خدا کا
شکرادا کرتا۔"

وقت گزر گیا ہے لیکن انارکلی کی یاد آج بھی باقی ہے ایک بڑا بازار اس کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں امیر و غریب سب ہی آتے ہیں اور صبح سے شام تک خرید وفروخت ہوتی ہے۔

جہانگیر کا مقبرہ، جو 1637ء میں اس کے بیٹے شاہجہاں نے تعمیر کرایا، وسیع باغوں کے درمیان واقع ہے جو روایتی مغلیہ انداز میں بچھائے گئے ہیں۔ روزانہ یہاں سینکڑوں لوگ آ کر دعا مانگتے ہیں اور سرسبز میدانوں میں پکنک مناتے ہیں۔

لاہور کی عظمت کا اندازہ خوبصورت شالامار باغ کو دیکھ کر ہوتا ہے جو شہر کے مشرق میں تین میل دور جرنیلی سڑک پر واقع ہے۔ یہ شاہی باغ بادشاہوں کی لاہور میں آمد کے موقعہ پر رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اسے 1667ء میں شہنشاہ شاجہاں نے تعمیر کرایا۔ یہ ایرانی انداز میں بنا ہوا ہے۔ باغ کے چاروں طرف پختہ دیوار ہے جس کے کونوں پر گنبد بنے ہوئے ہیں۔

خوبصورت نہروں کے درمیان سنگِ مرمر کا پویلین ہے جگہ جگہ فوارے لگے ہیں اور چاروں طرف سرو کے درخت ہیں۔ اس باغ کا نقشہ مشہور انجینئر علی مردان خاں نے بنایا تھا جسے پنجاب کا مغل وائسرائے مقرر کیا گیا تھا۔ باغ میں سات تختے تعمیر کیے گئے تھے جن میں سے چالیس ایکڑ کے رقبہ میں تین تختے آج بھی باقی ہیں۔ چار تباہ ہوگئے ہیں۔ شالامار باغ سترہ مہینہ اور چار روز میں تعمیر ہوا اور اس پر چھ لاکھ روپے صرف ہوئے۔

یہ مستطیل نما باغ مربعوں میں بٹا ہوا ہے۔ درمیان میں پانی کا تالاب ہے جس کے چاروں طرف کنگورے دار حاشیہ ہے اور جابجا فوارے لگے ہوئے ہیں۔ پانی آبشار کی صورت میں سنگِ مرمر کے ٹکڑوں پر سے بہتا ہے جن کے پیچھے بلب لگا کر روشنی کی جاتی ہے۔ باغ کی فقید المثال خوبصورتی سے متاثر ہوکر شہنشاہ اورنگ زیب کی شاعرہ بیٹی زیب النسا نے لکھا!

"اے آبشار! تو کس کی یاد میں آنسو بہاتی ہے؟
کس کی یاد نے تیرے ماتھے پر بل ڈال دیئے ہیں؟
وہ کیا درد ہے جس سے تو میری طرح مجبور ہو کر تمام رات پتھر سے اپنا سر
پٹکتی ہے اور آنسو بہاتی ہے؟"

شالامار میں ہر سال مارچ میں میلہ چراغاں منعقد ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر بھانت بھانت کے لوگ نظر آتے ہیں۔ غریب اور امیر سب ہی تفریح کے لیے آتے ہیں۔ میلہ میں داخلہ کا کوئی ٹکٹ نہیں ہوتا۔ مغل بادشاہوں کی بنوائی ہوئی عمارات قیمتی ورثہ ہیں۔ آخری عظیم مغل شہنشاہ اورنگ زیب کی بنوائی ہوئی بادشاہی مسجد عظمت کا مرقع ہے۔ سرخ پتھر سے بنے ہوئے اس کے چار بلند مینار سنگ مرمر کے تین گنبدوں کے مقابلے میں بڑا خوبصورت تضاد پیش کرتے ہیں۔ مسجد کی بائیں جانب فلسفی شاعر علامہ اقبالؒ کا مزار ہے جس نے سب سے پہلے پاکستان کا نظریہ پیش کیا۔ لاہور میں بے شمار مساجد ہیں۔ اسی دور سے تعلق رکھنے والی دائی انگا کی مسجد اور چوبرجی اپنے

خوبصورت فن تعمیر کے لیے مشہور ہیں۔ غالب نے اس سے متاثر ہو کر لکھا تھا: "مسجد کے سائے میں محبت، جذبات اور گناہ کو بھی پروان چڑھنا چاہیے تاکہ زندگی کے پلڑے برابر ہو سکیں۔" انگریز شاعر ملٹن نے کافی وقت لاہور میں گزارا اور اپنی تحریروں میں اس کی تعریف کی۔ رڈیارڈ کپلنگ لاہور کے مشہور اخبار سول ملٹری گزٹ کا ایڈیٹر تھا۔ اب یہ اخبار مالک اور کارکنوں کے تنازعہ کی وجہ سے بند ہو چکا ہے۔ مالک نے ان کے حقوق پر پیسے بچانے کو ترجیح دی۔ بہر حال دروازے پر اب بھی ایک تختی لگی ہے جس پر لکھا ہے۔ "یہاں رڈیارڈ کپلنگ نے کام کیا۔"

پرانی چیزوں کی جگہ نئی چیزوں نے لے لی ہے۔ 26 نومبر 1964ء کو لاہور میں ٹیلی ویژن شروع ہو گیا۔ اس سے اب لوگوں کی معلومات اور سمجھ بوجھ میں اضافہ ہوگا۔ پروگراموں کا انتخاب نہایت احتیاط سے کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی یہاں دلچسپی کی بے شمار چیزیں ہیں۔ چیکوسلاواکیہ کی حکومت نے کٹھ پتلیوں کی نمائش کی ہے۔ یہ مظاہرہ مال روڈ پر پاکستان آرٹس کونسل میں مفت کیا گیا تھا۔

لاہور کے لوگ، خواہ وہ جواں ہوں یا بوڑھے، بسنت پنچھمی کے زمانے میں، جو جنوری کے ختم پر ہوتا ہے پتنگ اڑاتے ہیں۔ اس موقعہ پر جوش وخروش دیکھنے والا ہوتا ہے لوگوں کے گروہ مقابلوں میں حصہ لینے کے لیے منٹو پارک، بھاٹی اور موچی دروازہ پر جمع ہو جاتے ہیں یہ مقابلے اتنے مقبول ہیں کہ صرف ایک دن میں پچیس ہزار لوگوں نے بیس ہزار روپیہ داخلے کے ٹکٹوں پر صرف کیا۔ ہر سال زیادہ سے زیادہ لوگ اس تہوار میں شرکت کرتے ہیں، جس کی ابتدا انیسویں صدی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں ہوئی تھی۔ ایک اور مقبول مشغلہ دریائے راوی میں کشتی رانی ہے۔ یہ دریا میلوں بل کھاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ دریا میں جگہ جگہ کشتیاں رکھی ہوئی ہیں۔ دسمبر سے مارچ تک لاہور میں اچھی خاصی سردی پڑتی ہے۔ موسم بہار کی گرم گرم دھوپ میں سارا شہر نہا جاتا ہے اور سردیوں میں بھی روز دھوپ چمکتی ہے اپریل کے بعد موسم گرم ہو جاتا ہے لیکن یہ گرمی بھی صحت بخش ہے جولائی اور اگست میں بارش ہوتی ہے۔

فروری میں لاہور میں ہارس شو ہوتا ہے جو دنیا بھر میں مشہور ہے اس موقعہ پر ہمیشہ بڑے بڑے لوگ آتے ہیں۔ افتتاح کے وقت عظیم الشان بینڈ دھنیں بکھیرتا ہے اور سارا منظر اس قدر پر سکون ہوتا ہے گویا مغل شہنشاہ زمین پر اتر آئے ہوں دوسرے سازوں کے ساتھ بیگ پائپ (Beg Pipe) بھی ہوتے ہیں اور گھڑسواروں کی وردی ایسی ہوتی ہے گویا کوئی رسم تاجپوشی ہو رہی ہو۔ بہترین بیلوں، گھوڑوں اور گائیوں کے انتخاب کے علاوہ رقص کرتے ہوئے اونٹ، پھولدار چادروں سے ڈھکی ہوئی گھوڑیاں اور سفید عربی گھوڑے بھی دیکھنے کی چیز ہیں۔

گلستان فاطمہ کے اوپن ایئر تھیٹر میں منعقد ہونے والے ڈرامے اور موسیقی کے مقابلے بھی دلچسپی کے مواقع مہیا کرتے ہیں۔ لاہور جمخانہ کا ماحول بڑا دوستانہ ہے اور مہمانوں کا ہمیشہ خیر مقدم کیا جاتا ہے یہاں اکثر باہر سے آنے والے طائفے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں عجائب گھر اور آرٹس کونسل کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں یہاں ہر ہفتہ نمائشیں ہوتی ہیں۔ حکومت کی کھولی ہوئی دست کاری کی دکانیں بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں، ایک اور قابل دید جگہ پنجاب پبلک لائبریری ہے جو 1884ء میں قائم ہوئی تھی۔ یہ تاریخی عمارت وزیر خاں نے تعمیر کرائی تھی جس نے مشہور مسجد وزیر خان بھی بنوائی تھی۔ لائبریری میں مشرقی علوم پر کتابیں ہیں جن میں عربی فارسی، ترکی اور اردو کی کتابیں شامل ہیں ان کے علاوہ برطانوی عہد کی بے شمار کتابیں ہیں اور اس دور کے متعلق سرکاری گزٹ ہیں عربی کی چار ہزار کتابوں کے علاوہ محققوں کے لیے سنسکرت، بدھ مت اور عیسائیت پر نایاب نسخے ہیں، تقریباً آدھی کتابیں قرآن حکیم کی تفسیریں ہیں۔

لاہور اپنی تعلیمی سہولتوں کے لیے مشہور ہے اور یہاں دور دور سے طالب علم آتے ہیں لاہور میں پنجاب یونیورسٹی، ایڈورڈ میڈیکل کالج، لڑکیوں کے لیے کوئین میری کالج، لا کالج، اورینٹل کالج، انجینئرنگ کالج اور لاتعداد سکول ہیں۔ فنی تعلیم کے لیے بہت سے ادارے، ریڈیو انسٹی ٹیوٹ اور نیشنل آرٹس کالج ہے۔ تعلیم کے معاملے میں لاہور تمام شہروں پر فوقیت رکھتا ہے۔

لاہور کا ماحول ثقافتی ہے اور پاکستان میں کوئی دوسرا ضلع ایسا نہیں جو سیاسی اور روشن خیالی کے اعتبار سے اس سے لگا کھاتا ہو۔ لاہور ہی میں 23 مارچ 1940ء کو قائد اعظم محمد علی جناح نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں پاکستان کی تاریخی قرار داد اختیار کی تھی۔ لاہور ہی وہ شہر ہے جہاں سب سے پہلے ہندوستان کے ظلم وستم کے ستائے ہوئے مہاجرین آئے اور ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ 1955ء کے بعد سے لاہور، جو پہلے پنجاب کا دارالخلافہ تھا، مغربی پاکستان کا سرکاری دارالحکومت بن گیا۔ یہاں گورنر رہتا ہے جو کمشنروں اور دوسرے قابل افسروں کے ساتھ تمام انتظام سنبھالتا ہے۔

لاہور میں بے شمار اچھے ہوٹل ہیں اور بہت سے نئے بن رہے ہیں۔ پارک لگژری (جو کراچی کے مشہور ہوٹل بیچ لگژری کے مالک مسٹر اوبری کی ملکیت ہے) وسیع باغات سے گھرا ہوا ہے اور اس کے کمرے چھوٹی چھوٹی کٹیاؤں کی طرح ہیں۔

مشہور قدیم ہوٹل فلیٹیز میں ہر طرح کے لوگ آتے ہیں۔ یہاں ہر رات کیبر ے ہوتا ہے۔ نوجوان فنکاروں پر مشتمل بڑا عمدہ آرکسٹرا ہے جو بلیونوٹس (Blue Notes) کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی یادداشت بے حد تیز ہے۔ جب کبھی کراچی یا دنیا کے کسی حصہ سے آیا ہوا مہمان کھانے کے کمرے میں داخل ہوتا ہے تو سوچتا ہے! ''میں تو یہاں کسی کو نہیں جانتا، میں اس کونے میں بیٹھ جاؤں گا۔'' اچانک اس کا محبوب نغمہ فضا میں گونجتا ہے۔ ''یہ میرا نغمہ ہے'' وہ خود سے سرگوشی کرتا ہے۔ ''انہیں اس کا علم کیسے ہو گیا؟''

یہ لوگ صرف مہمان کو پہچانتے ہی نہیں بلکہ اس کی پسند بھی یاد رکھتے ہیں۔ ہوٹل کے وسیع میدانوں اور صاف ستھرے کمرے دیکھ کر بڑا سکون ہوتا ہے۔ فلیٹیز میں ہی لوگ اپنے دوستوں سے ملنے کا پروگرام بناتے ہیں۔

ہوٹل کے برآمدے میں نوادرات کی دکان ہے جس کا نام اورینٹل سٹورز ہے۔ اس کے خوش مزاج بوڑھے مالک کو اس بات کی پرواہ نہیں کہ آیا آپ کچھ خریدتے ہیں یا نہیں۔ وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ آپ دکان میں گھومیں، چیزوں کو چھو کر دیکھیں، انہیں پرکھیں اور خریدنے سے پہلے انہیں پسند کریں۔ وہ تو کہتا ہے ''اگر اس وقت آپ کے پاس پیسے نہیں تو کوئی حرج نہیں آپ چیز لے جائیے۔'' اسے معلوم ہے کہ دوبارہ آنے پر آپ حساب چکا دیں گے۔ جب میں آخری بار وہاں گئی تو اس کا نوجوان بھانجا ان تمام خوبیوں کے ساتھ دکان چلا رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا میں اپنے پرانے گھر لوٹ آئی ہوں لیکن بوڑھا مالک جنت کو سدھار چکا تھا۔ مجھے یہ جان کر بے حد افسوس ہوا لیکن اس کا جذبہ اور خیالات آج بھی موجود ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ دکان میں موجود ہے جس سے اسے بے حد محبت تھی۔

نئے ایمبسڈر ہوٹل میں کرایہ چالیس روپیہ یومیہ ہے۔ یہ ایئر کنڈیشنڈ ہے اور تمام سہولتیں میسر ہیں۔ ہوائی اڈہ کے نزدیک زنوبی کا ماحول بڑا مانوس ہے اور امپریل اور والڈورف میں کرایہ پچیس روپیہ یومیہ ہے جس میں ناشتہ بھی شامل ہے۔

خوشنما انڈس ہوٹل میں ساڑھے تیئس روپیہ میں کمرہ مل جاتا ہے جس میں سروس کے علاوہ ناشتہ بھی شامل ہے اس کا ماحول بڑا عمدہ ہے اور ان کے گیلکسی (Galaxy) ریسٹورنٹ میں مشرقی اور مغربی طرز کے لذیذ کھانے ملتے ہیں یہاں فلمی دنیا کے تمام لوگ آتے ہیں۔ انڈس مال روڈ کے وسط میں واقع ہے اور یہاں سے ہر جگہ نزدیک ہے اس کے خوش مزاج منیجر سردار طفیل ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ مہمانوں کو ہر قسم کا آرام میسر ہو۔

کم خرچ کے لیے، برگینزا اور رینٹ میں بالترتیب بارہ اور تیرہ روپے لیے جاتے ہیں۔ یہ کشادہ ہوٹل ہیں اور کمرے آرام دہ ہیں۔ مناسب ہوگا کہ آپ کمرے پہلے سے مخصوص کرا لیں۔ اوپر دیئے ہوئے کرائے غیر ایئر کنڈیشنڈ کمروں کے لیے ہیں۔ اچھے ہوٹلوں میں ایئر کنڈیشنڈ کمرے دس روپیہ زیادہ پر مل جاتے ہیں۔

سواری کے لیے لاہور میں رکشہ اور ٹیکسیاں ہیں جن کا فی میل کرایہ بے حد سستا ہے۔ انتیس راستوں پر ساڑھے تین سو بسیں چلتی ہیں اور سارے شہر کا چکر لگاتی ہیں۔

لاہور سے بے شمار اخبارات نکلتے ہیں۔ انگریزی کے روزنامہ پاکستان ٹائمز میں تمام تازہ خبریں اور بیرونی نمائندوں کی بھیجی ہوئی خبریں ہوتی ہیں۔ نوائے وقت اور اردو کے دوسرے اخبارات صبح اور شام شائع ہوتے ہیں ان کے علاوہ اردو، پنجابی، پشتو اور انگریزی کے پچاس کے لگ بھگ ماہنامے بھی نکلتے ہیں۔ لاہور میں ستر چھاپہ خانے ہیں جن میں پیکجز لمیٹڈ، فیروز سنز، مکتبہ جدید پریس اور گورنمنٹ پرنٹنگ پریس شامل ہیں۔ یہاں پاکستان کے تمام مشہور ناشروں کے صدر دفتر بھی ہیں چالیس کے قریب نئے اور پرانے سینما گھروں میں تازہ ترین فلموں کی نمائش ہوتی ہے۔

لاہور میں ہر سیاح کی دلچسپی کا سامان موجود ہے انہیں فلمی نگار خانوں کی سیر بھی کرائی جاتی ہے یہاں ہالی ووڈ کی طرح تمام ساز و سامان موجود ہے گو اتنے بڑے پیمانے پر کام نہیں ہوتا۔ لاہور میں سیاحوں کے لیے نگار خانوں کی سیر کرنا اور فلمیں بنتے دیکھنا برطانیہ اور امریکہ کی نسبت بے حد آسان ہے۔ پنجابی بڑے یار باش اور دوست نواز لوگ ہیں اور آپ کی دلچسپی کو اپنی دلچسپی سمجھتے ہیں۔

یہ دلچسپی بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک روز میں پی آئی اے (PIA) کے دفتر سے نکل رہی تھی کہ میری جیکٹ دروازے میں اٹک گئی توبہ، توبہ، کس بری طرح پھٹی ہے! میں اس حلیے میں

عجب ہی دکھائی دیتی تھی اوراب آگے سیر کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔اچانک میری نظر ایک درزی پر پڑی جو شاہ دین بلڈنگ کے دروازے میں قالین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔اس نے میری پریشانی بھانپ لی اور چند ہی منٹ میں اس نے کھونچ کو نہایت نفاست سے سی دیا۔میں قسم کھاتی ہوں کہ اس کے ہر ٹانکے میں خلوص پرویا ہوا تھا۔وہ اس کام کے پیسے بھی نہیں لینا چاہتا تھا اس کا نام ویرتھا۔اس کا تلفظ ڈیر (dear) سے ملتا ہے اور میں بھی اسے ایسا ہی محسوس کرتی ہوں۔چند روز بعد میں اس کی چھوٹی سی دکان میں گئی اور اپنے لیے بہت سے کپڑے سلوائے۔دوسرے ممالک میں یہ بات یقیناً اتنی آسان نہیں تھی۔تمام سیاحوں کے لیے خواہ وہ پاکستانی ہوں یا غیر ملکی یہ درزی نہایت عمدہ کام کرتے ہیں۔

جب آپ لاہور آتے ہیں اور ہوٹل کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تو اس بات کا اطمینان کر لیجیے کہ آپ کے پاس یوتھ ہوسٹل کا کارڈ موجود ہے (یہ کارڈ ساری دنیا میں کارآمد ہے) اکیس سال تک کے لوگوں سے ایک روپیہ، چوبیس سال تک کے لیے دو روپیہ اور اس سے زیادہ عمر کے لوگوں سے ممبر بننے کے پانچ روپے لیے جاتے ہیں۔آپ ساٹھ سال کے ہی کیوں نہ ہوں پھر بھی یوتھ ہوسٹل میں شامل ہو سکتے ہیں اور اس کارڈ کے ذریعہ تمام یورپ، امریکہ، مشرق بعید، برطانیہ، متحدہ عرب جمہوریہ اور بہت سے ممالک کے علاوہ آپ تمام پاکستان میں کسی بھی یوتھ ہوسٹل میں ٹھہر سکتے ہیں۔میرے خیال میں یہ بڑا سستا سودا ہے اور اس میں لطف بھی بے حد آتا ہے۔ہر عمر کے لوگوں سے ملنا ہو جاتا ہے اور مختلف اقوام کے لوگوں سے واقفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔اس کا صدر دفتر لاہور میں ہے پتہ کے لیے صرف سیکرٹری پاکستان یوتھ ہوسٹلز ایسوسی ایشن لاہور لکھ دینا کافی ہے یا 68805 پر فون کر لیجیے اور آپ کو تمام معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ابتدا میں یوتھ ہوسٹل صرف طالب علموں کے لیے شروع کیا گیا تھا، لیکن اگر آپ کی امنگیں جوان ہیں تو یہ آپ کے لیے بھی حاضر ہے۔

خوبصورت بازار لاہور کی بے شمار دلچسپیوں میں سے ایک ہیں۔زیورات، عمارتی لکڑی، برتن، مشینری اور بہت سی چیزوں کے علیحدہ علیحدہ بازار ہیں۔دہلی دروازے کے باہر کھالوں اور چرم کا بہت بڑا بازار ہے جس کے گرد بیٹھے ہوئے سبزی اور پھل فروش بالکل الف لیلوی ماحول پیش کرتے ہیں۔خرید و فروخت کرتے ہوئے سیاح سیخ کباب کی چھوٹی چھوٹی دکانوں میں دہکتے

ہوئے انگاروں پر دنبہ بھنتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں گرم گرم روٹیوں کے ساتھ اس کا بہت لطف آتا ہے۔اس کے ساتھ دہی بھی دی جاتی ہے جو اس مشرقی کھانے کی لذت کو دوبالا کر دیتی ہے۔

لاہور کے گردونواح میں چمڑے اور جوتے بنانے کے باٹا اور سروس کے بڑے بڑے کارخانے ہیں باٹا کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے شہر سے دس میل دور باٹا پور ہے جسے عمدہ جوتوں کا شہر کہا جاتا ہے یہ شہر سارے پاکستان کے لیے جوتے مہیا کرتا ہے پچیس سال پہلے اس کا نام ونشان بھی نہ تھا یہ سارا قطعہ بالکل بنجر تھا اور گھاس کی ایک پتی تک نہ اگتی تھی چند غریب دیہاتی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں میں رہتے تھے اور آس پاس کا علاقہ اس قدر ویران تھا کہ یقین نہیں آتا کہ زندگی سے بھرپور یہ شہر کس طرح ابھر آیا۔کہانیوں میں پنوکیو (pin - nochio) کا دادا جو موچی تھا، جوتے بناتے وقت ہزاروں لوگوں کو مسحور کر دیتا تھا۔اب باٹا کے لاتعداد کام کرنے والے اپنی مشینوں کے استعمال سے ہزاروں دیکھنے والوں کو مسحور کرتے ہیں۔

باٹا کا ادارہ، جو اپنے ترقی پسند نظریہ کی بنا پر ساری دنیا میں مشہور ہے۔ہندوستان اور مشرق بعید کے ممالک کو جوتوں کی اہمیت کا احساس دلانا چاہتا تھا۔چنانچہ 1930ء کے عشرے کے آخر میں ہندوستان میں کارخانہ شروع کیا گیا۔اس کے جوتوں کو فوری مقبولیت حاصل ہوئی اور 1942ء میں لاہور کے باہر ایک گودام قائم کیا گیا۔آزادی کے بعد اس کی توسیع کی گئی جو آج بھی جاری ہے۔

اس زمانے میں اس کے ڈائریکٹر نوجوان اور پر جوش مسٹر ڈولیزل تھے جو چیکوسلاواکی نژاد پاکستانی شہری ہیں باٹا فیکٹری قائم کرنے کی راہ میں بے شمار دشواریاں تھیں لیکن چند یورپی ماہروں کی مدد سے انہوں نے ان تمام مشکلات پر قابو پالیا جنہیں دیکھ کر بہت سے لوگ ہمت ہار بیٹھتے۔جلد ہی اس ملک میں مشینوں سے آراستہ پہلی جوتوں کی فیکٹری قائم ہوگئی اور گاؤں کے لوگوں کے لیے ملازمت کے دروازے کھل گئے۔ڈولیزل کو معلوم تھا کہ اگر کارکنوں کو خوش رکھا گیا تو پیداوار بہت بڑھ جائے گی۔انہوں نے بچوں کے لیے سکول تعمیر کرائے اور جلد ہی برادری کا ماحول پیدا ہوگیا کچھ عرصہ بعد مسجد، ڈاکخانہ اور ہسپتال تعمیر کیے گئے۔کھیلوں اور تفریح کے لیے میدان بنائے گئے اور لاہور کے اس نواحی ویران علاقہ میں زندگی پیدا ہوگئی اور اس کا نام باٹا پور پڑ گیا۔لوگوں کی زندگی پرسکون اور سودمند ہے اس کے تین ہزار چھ سو ملازم پاکستان کے دونوں صوبوں سے تعلق رکھتے ہیں یہ لوگ بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر باٹا پور کے بیس ہزار مکینوں کی مدد کرتے ہیں جن میں

سے بہت سے دکاندار ہیں۔ان کی دکانوں میں روزمرہ کے استعمال کا تمام سامان موجود ہے۔ باٹا کے کارکنوں کے چار سو بچے جدید طرز کے باٹا مڈل سکول میں پڑھتے ہیں تمام بچے جوتے پہنتے ہیں جس کی کسی زمانے میں انہیں عادت نہیں تھی۔

نوّے ایکڑ کے علاقے میں، جو ہندوستان کی سرحد سے صرف چار میل دور ہے، خوبصورت مکانات بنے ہوئے ہیں، عملہ کے پچاس فیصد لوگ کمپنی کے گھروں میں رہتے ہیں۔گھروں کے گرد پھول لہلہاتے ہیں۔ پچھلے صحن میں مرغیاں اور بکریاں پالی جاتی ہیں اور پھولوں کے ساتھ ساتھ سبزیاں اُگی ہوئی ہیں۔تمام ملازمین کمپنی کی کواپریٹو سوسائٹی کے منافع میں حصہ دار ہیں۔ باٹا پورا ایک بڑے خاندان کی طرح ہے۔تعلیم مفت ہے، طبی امداد بھی مفت ہے اور انتظامیہ ہر کام میں والدین کی طرح ذاتی دلچسپی لیتی ہے۔ باٹا کے ڈائریکٹروں نے باہمی مشاورتی ادارہ قائم کیا ہے جس کے تحت مجلس عمل، سپورٹس کلب، سکول اور باٹا کے ملازمین کی بیماروں کی بہبود کی سوسائٹی (Sickness Benefit Society) کام کرتے ہیں۔ ان اداروں کے زیر نگرانی مزدوروں کی شکایات، تعلیم اور دوسری سہولتوں کا خیال رکھا جاتا ہے جو باٹا جیسے بڑے ادارے میں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔کارکنوں کے معاملات سے یہ دلچسپی باٹا کے انتظام اور ترقی میں بڑی مددو معاون ثابت ہوئی ہے ماہرین ملازمین کو ہر کام خود کر کے سمجھاتے ہیں باٹا پور کا اپنا ٹریننگ سکول ہے جہاں ٹیلیفون ایکسچینج کو سنبھالنے سے لیکر جوتے بنانے تک کی تعلیم دی جاتی ہے۔

1950ء میں باٹا نے سائیکل کے ٹایئر اور ٹیوب بنا کر مقامی صنعت کی تاریخ میں نیا مقام حاصل کیا۔ یہ شعبہ کمپنی اور پاکستان دونوں کے لیے بیش قیمت اثاثہ ہے کیونکہ اس کی برآمد سے کثیر زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے گزشتہ دو سالوں میں یہاں بالترتیب دس لاکھ ٹائر اور بیس لاکھ ٹیوبیں ہر سال تیار ہوئیں ہر ہفتہ یہاں دو لاکھ سے اوپر ربڑ اور چمڑے کے دیدہ زیب جوتوں کے جوڑے تیار ہوتے ہیں ان کا ایک حصہ برآمد کیا جاتا ہے جس سے ملک کی معیشت کے لیے روپیہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ اس کمپنی کا حیران کن کارنامہ ہے جس کا کچھ عرصہ پہلے اس ملک میں نام ونشان تک نہ تھا۔

کمپنی کے موجودہ ڈائریکٹر جناب جے۔ بیرک (J-BericK) انتھک ہمت کے مالک ہیں۔ وہ نہایت جوش سے ان دکانوں، ایجنسیوں اور تقسیم کاروں کا ذکر کرتے ہیں جو باٹا نے پاکستان میں قائم کی ہیں انہیں وہ لوگ چلاتے ہیں جن کا کسی زمانے میں خیال تھا کہ ننگے پیروں

سے صحت قائم رہتی ہے۔ بیرک صاحب ان دکانوں کا بھی تذکرہ کرتے ہیں جو نئی آبادیاں قائم ہونے پر کھولی جائیں گی۔ وہ کارکنوں سے مشورہ طلب کرتے ہیں اور ہر ایک کو باہم موقع دیتے ہیں خواہ وہ معمولی مزدور ہو یا بڑا افسر مزدوروں کو ترقیاں دی جاتی ہیں اور عملہ کے پرانے لوگ نئے مزدوروں کو اپنے شعبہ میں لے لیتے ہیں۔کام کے بعد مزدوروں کی تفریح کے لیے کھیلوں کے میدان ہیں صحت مند مزدوروں کو کام کے ساتھ ساتھ کھیل میں بھی حصہ لینا چاہیے۔ عام تعطیلات کے علاوہ ہفتہ اور اتوار کی چھٹی ہوتی ہے ان دنوں میں لائبریری کینٹین اور باٹا سینما لوگوں سے کھچا کھچ بھرے ہوتے ہیں معقول تنخواہ پانے کی وجہ سے ہر شخص اپنی پسند کی تفریح کا انتخاب کرسکتا ہے۔اس معاوضہ سے مزدور لوگ اپنے مستقبل کے انتظام کے لیے جائداد بھی خرید سکتے ہیں باٹا پور کے آس پاس کے علاقوں میں پکنک منائی جاتی ہے غیر شادی شدہ مردوں کے لیے الگ جگہ ہے اکثر اس کا کوئی نہ کوئی فرد کم ہو جاتا ہے اور باٹا کے کارکنوں کے خاندانوں کے درمیان شادیاں بڑی پرلطف ہوتی ہیں لاہور اور دوسرے مقامات سے آنے والے لوگوں کو خوش آمدید کہا جاتا ہے ایک آدمی ان کا خیر مقدم کرتا ہے اور تمام جگہوں کی سیر کراتا ہے دروازے پر میلہ کا سا سماں ہوتا ہے اور دیواروں پر یہ فقرے لکھے ہوتے ہیں:۔

”آپ عمدہ جوتوں کے شہر میں داخل ہو رہے ہیں۔کیا یہ ایک حقیقت ہے؟“

کیا یہ سب کے ساتھ یکساں ہے؟ کیا یہ خیرسگالی پیدا کرے گی؟“

اندر ایک کھڑکی میں باٹا کے تمام جوتے نمائش کے لیے رکھے گئے ہیں۔ مشرقی، مغربی اور تمام نئے ڈیزائن موجود ہیں۔ دیکھنے کی سب سے بڑی چیز وہ سنجیدگی ہے جو سارے ماحول پر چھائی ہوئی ہے۔

بیس ہزار لوگوں کا یہ شہر انسانی دلچسپی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے جو دو ہزار سال پرانے ”پاکستان کے دیوان خانہ“ میں نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے۔ لاہور اس مہمان نواز خاتون کی طرح ہے۔جس کے خاندان کے افراد خود کو سب کے برابر سمجھتے ہیں اور جن کا خلوص تمام آنے والوں کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔

راولپنڈی اور اسلام آباد

راولپنڈی مسجدوں، گرجاؤں، کلبوں، پارکوں اور گلیوں کا شہر ہے۔ یہ تمام چیزیں سیاحوں اور تاجروں کے آرام اور لطف میں اضافہ کرتی ہیں۔ اکتوبر 1959ء میں دارالخلافہ کی منتقلی کے بعد سے اس شہر کا اپنا مخصوص اور انفرادی رنگ ہو گیا ہے۔ یہاں زندگی کی گہما گہمی میں اضافہ اور صنعتی اور سماجی زندگی میں ترقی ہو رہی ہے۔

اپنے جاندار حال کے علاوہ راولپنڈی کا مستقبل بھی درخشاں ہے اپنی پرانی خوبصورتی کھوئے بغیر یہ شہر روز بروز صاف ستھرا، جدید اور آرام دہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہوٹلوں کے کمرے از سرِ نو آراستہ کیے جا رہے ہیں اور چاق و چوبند کانداراب سوسائٹی میں شمار ہوتے ہیں۔ عبوری دارالحکومت ہونے کی وجہ سے راولپنڈی بذاتِ خود ملکہ کی حیثیت رکھتا ہے......اور جب تک ہتھوڑوں، رندوں، بل ڈوزروں اور دوسری چیزوں کی آواز بند نہیں ہو جاتی پر جوش توقع کا جذبہ بیان سے باہر ہے۔

گو فوجی پس منظر اور برطانوی دور کا ہلکا سا رنگ یہاں اب بھی عیاں ہے، پاکستان کے بیشتر لوگ راولپنڈی کو ایک آرام دہ شہر یا ایک اچھے پڑوسی یا مالدار غیر شادی شدہ خالہ کی طرح دوست نواز سمجھتے ہیں چونکہ راولپنڈی کو مقامی لوگ پیار سے پنڈی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس لیے سارے ملک میں یہی نام مشہور ہو گیا ہے مغربی پاکستان میں یہ تیسرا بڑا شہر ہے۔ اس کی آبادی دو لاکھ ہے اور لوگوں کا خلوص ہر جگہ عیاں ہے۔ یہاں بیشمار بسیں ہیں جو دوسرے شہروں کو جانے والی بسوں سے ملاتی ہیں۔ پنڈی، مری بس، پنڈی لاہور بس اور بیشمار دوسری بسیں، یہ تمام بسیں بغیر کسی استثنا کے مقامی لوگوں اور اجنبیوں سے ملنے اور راستے میں رک کر پ... پینے والے سفر کے شوقین

سیاحوں سے بھری ہوئی صبح سے شام تک چلتی رہتی ہیں۔

راولپنڈی کو تاریخی شہرت اس وقت حاصل ہوئی جب دارالحکومت کو پر ہجوم کراچی سے منتقل کرنے کا آخری فیصلہ کیا گیا۔ یہ اعلان دنیا کے تمام اخبارات میں پہلے صفحہ پر شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوا۔ پنڈی کے خوش باش عوام کی خوشی اور بڑھ گئی۔ ان کا شہر اب پاکستان کا اہم ترین علاقہ بن گیا۔ پر سکون ماحول میں جوش کی لہر دوڑ گئی۔ لوگ خوشی کے جذبہ سے مغلوب ہو گئے۔

اسلام آباد...... پاکستان کا زیرِ تعمیر نیا دارالحکومت خوبصورت علاقہ میں واقع ہے ہمالیہ کی سی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے گھرا ہوا اسلام آباد ایسے ابتدائی کیمپ کی طرح ہے جو ہمالیہ کی کسی چوٹی کی تسخیر کے لیے لگایا گیا ہو۔ نئے دارالحکومت کا علاقہ پوٹھوار پلیٹو میں واقع ہے جہاں زندگی کے آثار آج سے پانچ لاکھ سال پہلے نمودار ہوئے۔

یہ منصوبہ جون 1959ء میں وجود میں آیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس طرح کراچی پر بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ کراچی میں صنعت، سیاحی، تجارت اور بیشمار دوسری چیزیں اس طرح گڈمڈ ہو گئی تھیں کہ جگہ بالکل باقی نہ رہی تھی۔ صدر ایوب نے فرمایا: ''دارالحکومت کو تجارتی یا صنعتی مرکز نہیں ہونا چاہیے۔ اس کو صرف دارالحکومت ہونا چاہیے جہاں عوام کی بہبود کے لیے ملک کی انتظامیہ کام سنبھالے۔'' اس بات پر پوری طرح عمل ہوا ہے۔

کام شروع ہونے کے بعد چار سال سے کم عرصہ میں مری کی پہاڑیوں کے دامن میں ایک نیا شہر ابھر آیا ہے آج اسلام آباد زندگی سے بھرپور ہے۔ جہاں تعمیر کا کام زور شور سے جاری ہے اور یہ شہر اس ترقی پذیر ملک کے نئے دارالحکومت کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔

کسی بھی نظریہ سے جانچیے، جتنا ترقیاتی کام ہو چکا ہے حیران کن ہے خوبصورت نئی سڑکیں بچھائی گئی ہیں سرکاری ملازمین کے لیے مکانات بنائے گئے ہیں اور انہوں نے اپنے نئے ماحول میں گھر بسا لیا ہے بیشتر دفاتر کی عمارتیں مکمل ہو چکی ہیں اور باقی تکمیل کے مختلف مراحل میں ہیں۔ ان میں قابلِ ذکر پاکستان ہاؤس ہے۔ اس عظیم الشان سہ منزلہ عمارت کے آگے وسیع میدان پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ سیاحوں کے لیے جدید طرز کا ہوٹل ہے جہاں اس کے لیے تمام آسائشیں اور سہولتیں موجود ہیں۔ پاکستان ہاؤس سے وسیع میدانی علاقہ راول جھیل اور راول ڈیم کا دلفریب نظارہ دکھائی دیتا ہے یہ ہوٹل ائر کنڈیشنڈ ہے اور ہر کمرہ میں ریڈیو اور ٹیلیفون موجود ہے۔

اسلام آباد میں پارک، تفریح گاہیں، سکول، لائبریریاں، مساجد، بازار اور نئی شاہراہیں بن چکی ہیں اور پنڈی سے دارالحکومت تک لمبا راستہ بے حد خوشگوار ہے پہاڑیوں کے پس منظر نے اس نئے شہر کو ملکوتی حسن بخش دیا ہے۔ کچھ عرصہ میں ہسپتال اور دوسرے بہبودی مراکز قائم ہو جائیں گے۔ سیکرٹریٹ کے بڑے بڑے بلاکوں کا منصوبہ تیار کیا گیا ہے جن میں سے کچھ تعمیر ہو چکے ہیں۔

خوبصورت ترین عمارات میں سے ایک ایٹمی سائنس کا مرکز (Nuclear Science Centre) ہے جو امریکی امداد سے تعمیر کیا گیا ہے یہ عمارت ہر دور میں قومی افتخار، اتحاد اور انسانیت کی خدمت کا مظہر رہے گی۔

نئے دارالحکومت کا پلان یونان کی مشہور فرم ڈوکیا ڈیز نے تیار کیا ہے جنہوں نے کراچی میں بنجر زمین پر کورنگی تعمیر کی ہے۔ راولپنڈی کے لوگوں کو اپنے گرد ابھرتا ہوا یہ علاقہ پریوں کی کہانی کی طرح معلوم ہوتا ہے اور ابتدائی رسمی باتوں کی جگہ اب ان جملوں نے لے لی ہے "ہماری عزت کتنی بڑھ گئی ہے؟" "کیا یہ اعزاز نہیں ہے؟ ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں۔ جس روز پاکستان کے صدر سرکاری طور پر کراچی (وہاں وہ پاکستانی فوج کے سپہ سالار کی حیثیت سے رہتے تھے) سے واپس لوٹے تو سڑکوں کو جھنڈیوں، پھولوں اور رنگ برنگی روشنیوں سے سجایا گیا، فضا پر تہوار کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ شہر میں اس وقت پہنچنے والے مسافر بھی خوشی کی رو میں بہہ رہے تھے۔ سیاح ہر حال میں ایک مہمان ہے اور لوگ اسے دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ ریلوے سٹیشن ہر وقت کھچا کھچ بھرا رہتا ہے اور آدمی سوچتا ہے "کیا یہ سب لوگ مجھے خوش آمدید کہنے آئے ہیں؟"

راولپنڈی کے فضائی مستقر پر پی آئی اے (P.I.A) کا سٹیشن منیجر ہر وقت موجود رہنے کے لیے تیار رہتا ہے وہ آنے والے مسافروں کا خیال رکھتا ہے اور اگر ان کے ٹھہرنے کا انتظام پہلے سے نہ ہو تو ہوٹل میں جگہ کا بندوبست کرتا ہے۔ چائے اور مشروبات کے لیے انہیں مستقر کے آرام دہ ریسٹورنٹ میں لے جاتا ہے۔ خواہ آپ پی۔ آئی۔ اے کے جہاز پر کتنا ہی کھا کر کیوں نہ آئے ہوں، سٹیشن منیجر ان باتوں کو رد کر دیتا اور کہتا ہے "روئے زمین پر جمے ہوئے قدموں سے مضبوط اور کونسی چیز ہے؟" میں ہوائی اڈہ کے کیفے میں لوگوں کی سوالیہ نگاہیں کبھی نہیں بھول سکتی۔ جب میں نے چائے کی جگہ کافی طلب کی۔ ملازمین حیران رہ گئے۔ "کافی"؟ کیفے کے مالک نظیر محمد اور

اس کے دو بھائیوں نے حیرت سے پوچھا۔

ہم ابھی حاضر کرتے ہیں، بالکل آپ کی طرح امریکن۔" انہوں نے کہا "ہم چاہتے ہیں کہ آپ یہاں خوش رہیں۔"

میں مسکرائی اور کافی کا ڈبہ کھولا جو انہوں نے میرے سامنے لا کر رکھا تھا۔ انہوں نے پھر سوالات کی بوچھاڑ کر دی "آپ شاید تلے ہوئے انڈے پسند کرتی ہیں۔" شکریہ ادا کرتے ہوئے جب میں نے بتایا کہ مجھے پاکستانی کھانے بھی مرغوب ہیں تو وہ تشکر سے مغلوب ہو گئے۔ مجھے ان کے آرام دہ ریسٹورنٹ میں بہت لطف آیا۔

سیاحوں کے لیے یہاں چھ اچھے ہوٹل ہیں۔ پنڈی کے بہترین ہوٹل فلشمین میں خوش مزاج منیجر او ہیگن مہمانوں کا خیر مقدم کرتا ہے اور کاٹج نما کمروں کو دیکھ کر سیاحوں کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھر میں ہیں جو خوبصورت باغوں سے گھرا ہوا ہے۔ خوبصورت لاؤنج، بار اور کشادہ فرنیچر سے آراستہ مطالعہ کا کمرہ مشہور "اوبیرائے انداز" کے مظہر ہیں۔ ٹانگوں میں جتے جھومتے ہوئے گھوڑے میدان میں آتے جاتے رہتے ہیں اور روایتی ماحول کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ سیاحوں کو یہاں تمام جدید سہولتیں میسر ہیں۔ یورپی انداز کا کمرہ اٹھائیس روپیہ یومیہ پر مل سکتا ہے۔ نیاریکس ہوٹل صاف ستھری جگہ ہے گو زیادہ بڑا نہیں لیکن آرام دہ ہے اور تمام چیزیں ملا کر یومیہ کرایہ پچیس روپے ہے۔ مسٹر ڈیویز ہوٹل پرانی برطانوی سرائے کی یاد دلاتا ہے اونچی چھتوں والے کمرے اپنا پکانے کا انتظام اور کرایہ بھی نسبتاً کم۔ کشمیر ہوٹل بھی سستی جگہ ہے۔ گیسٹ مال اور کامران ہوٹل میں مختلف کمرے ہیں۔ جن کا کرایہ سات روپے یومیہ سے شروع ہوتا ہے۔

راولپنڈی آنے والے سیاح اپنی ضروریات اور بجٹ کے مطابق جگہ کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ ممتاز ریستورانوں میں شیزان، سلور گرل اور سپر شامل ہیں۔ ایورگرین ہوٹل کا کیفے بہت عمدہ ہے اور میجسٹک، مرینا، پنڈی ہوٹل، مغل سرائے اور میزبان میں کھانے کی اچھی چیزیں ملتی ہیں۔

کراچی اور لاہور کے اخبارات کے علاوہ یہاں سے چھ روزنامے نکلتے ہیں جس میں انگریزی کا پاکستان ٹائمز بھی شامل ہے اس مصروف شہر میں تیرہ چھاپے خانے ہیں۔ سب سے بڑا حکومت کی ملکیت ہے۔ گو پنجابی یہاں کی خالص زبان ہے۔ پھر بھی پنڈی کے بیشتر لوگ انگریزی کے علاوہ جرمن اور فرانسیسی بھی بولتے ہیں۔ اگر آپ بیمار ہو جائیں تو فکر کی بات نہیں یہاں نو اچھے

ہسپتال ہیں جو جدید آلات سے آراستہ ہیں۔

ملاقات کی ایک مشہور جگہ پنڈی کلب ہے جہاں سوئمنگ پول اور ٹینس کورٹ موجود ہیں۔ جھٹپٹا ہوتے ہی پنڈی اور گردونواح کے لوگ چاندنی کا لطف اٹھانے کے لیے اس کے کشادہ سبز لان میں جمع ہو جاتے ہیں اور موسیقی اور رقص سے دل بہلاتے ہیں۔ آپ پنڈی میں زیادہ عرصہ بغیر کہیں مدعو ہوئے نہیں رہ سکتے سیاح اپنے موٹاپے کو گھڑ سواری کی مدد سے دور کر سکتے ہیں جس کے لیے یہاں الگ راستے بنے ہوئے ہیں۔ گھوڑے گھنٹہ کے حساب سے کرایہ پر مل سکتے ہیں۔ ان کیساتھ سائیس بھی ہوتے ہیں۔ خرید و فروخت کا مرکز ایڈورڈز روڈ خوبصورت جگہ ہے۔ مصروف ترین جگہ مشہور لنڈن بک شاپ ہے جہاں پُرخلوص پاکستانی گھریلو طرز پر ملتے ہیں۔ یہاں تمام مشہور امریکی اور برطانوی رسالوں کے علاوہ مختلف زبانوں کے ادب کی کتابیں بھی ملتی ہیں۔ کتابیں اور دوسری چیزیں مہیا کرنے میں انتظامیہ کے کارکن ذاتی دلچسپی لیتے ہیں اور سیاح مستقل دوست بن جاتا ہے۔ آس پاس کی دکانیں' درزیوں، جوتے والوں، قصابوں اور بیکری والوں کی ہیں۔ ان لمبے بازاروں میں مضحکہ خیز چیزوں سے لے کر بہترین قسم کا ہر سامان دستیاب ہے۔ اگلے حصہ میں عموماً پنجابی دہقانوں کی بھیڑ رہتی ہے جو آس پاس کے علاقوں سے روزانہ ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں بیچنے آتے ہیں۔ ان پنجابی تاجروں کی ایک مرغوب چیز چاقو اور بندوقیں ہیں۔ ایک آدمی سے میں نے آٹھ آنے کے حساب سے بے شمار پیتل کے دستے والے جیبی چاقو خریدے۔ میں خوش تھی کہ یہ پاکستانی تحفے اپنے رشتہ دار بچوں کو دوں گی۔ ہر چاقو پر اردو میں خوبصورتی سے کوئی مقولہ (میں نے یہی سوچا تھا) لیکن یہ کچھ ایسی بات نکلی جو لندن کے سیفرج یا نیویارک کے میں ہی کر سکتے ہیں۔ ترجمہ کروانے پر یہ جملہ نکلا......"اگر یہ چاقو کاٹنے کے قابل نہ ہو تو لوٹا کر اپنے دام واپس لے سکتے ہیں"...... یہ دیانت داری اتنی حیران کن تھی کہ میں واپس گئی اور ایک درجن چاقو اور خرید ڈالے۔

آرام اور سکون کے لیے ایوب نیشنل پارک شہریوں اور سیاحوں کے لیے ایک نعمت ہے یہ سوؤان ندی کے نزدیک ہے اور یہاں پھول اور سایہ دار درختوں کی بہتات ہے۔ سات مصنوعی جھیلوں اور باسٹھ ایکڑ میں پھیلے ہوئے پانی میں مچھلیاں پلی ہوئی ہیں۔ اس کے اندر آٹھ میل لمبی سڑکیں اور بارہ میل لمبی فٹ پاتھ ہیں وہ سیاح جنہیں چلنے کا شوق ہے یہاں یقیناً لطف اندوز ہو

سکتے ہیں۔ کشتی رانی ک لیے جھیلیں، پکنک کے میدان، کھانے کی جگہیں اور بچوں کے کھیلنے کے لیے پارک اس کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں روزانہ سینکڑوں لوگ آتے ہیں اور بعض اوقات چھ ہزار چھ سو ستر فٹ لمبی بل کھاتی جھیل کے کنارے پارک میں ساری چھٹی گزار دیتے ہیں۔

پنڈی کے وسط میں بڑا ڈاکخانہ دیکھنے کی چیز ہے اور بنک کی عمارت سے ملتا جلتا ہے۔ یہ کبھی بند نہیں ہوتا اور یہ معلوم ہو کر خوشی ہوتی ہے کہ یہاں کسی وقت بھی خط ڈالا جا سکتا ہے۔

راولپنڈی میں شروع کے دور میں ڈاک کی سہولتیں معدوم تھیں۔ اس تاریخ کے ابتدائی حصے میں اس علاقے میں وادیٔ سندھ کی تہذیب پھولی پھلی۔ پندرھویں صدی قبلِ مسیح میں یہاں آریہ آئے۔ ان کے بعد ٹکا لوگ آئے جو تورانی قوم سے تھے۔ وہ سانپ کی پوجا کرتے تھے۔ انہوں نے ٹیکسلا آباد کیا۔ ان کے ایک سردار راجہ گاجی نے گاجی پور کی بنیاد رکھی جہاں اب راولپنڈی واقع ہے۔ چھٹی صدی قبل مسیح کے اوائل میں دارا نے اس علاقے کو ایرانی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے سپاہی ایرانی فوج کے ساتھ یونانیوں کے خلاف لڑے تھے۔ سکندر نے 326 قبل مسیح میں ایران فتح کیا اور ٹیکسلا کی طرف بڑھا جو اس زمانہ میں اماند کہلاتا تھا۔ بابل میں سکندر کی موت کے بعد غیر ملکیوں کے خلاف بغاوت ہو گئی۔

262 قبل مسیح کے لگ بھگ اشوک نے بدھ مت کو سرکاری مذہب بنایا۔ لیکن یہ مذہب ہندوستان میں زیادہ نہ پھیل سکا۔ البتہ اسے اس خطہ کی زمین راس آ گئی ایک صدی سے زیادہ یونانی حکومت کرتے رہے لیکن انہیں ساقہ اور یارتھیا کے لوگوں کے حق میں دستبردار ہونا پڑا۔ ان کے بعد کُش آئے اور اپنے ساتھ زندگی اور خوشحالی لائے اس کے ساتھ ہی گندھارا آرٹ کا دور شروع ہوا۔ سو سالہ ترقی کے دور کے بعد یہاں جنگجو سفید فام ہُن آئے۔ وہ جہاں گئے ہر چیز کو تہس نہس کر دیا وہ بدھ مت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ہن قوم کے بعد راجپوت پھیلے اور ٹیکسلا اور گندھارا کی عظیم عظمت کا خاتمہ ہو گیا...... براہمیت اس زمانہ میں اپنے ابتدائی دور میں تھی جب یہ ضلع کشمیر کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ گیارہویں صدی کے شروع میں مسلمانوں نے اس شہر کو فتح کیا اب تک اس شہر پر حملوں اور جنگوں کی چھاپ ہے۔ 1008ء میں محمود غزنوی نے دریائے سندھ کو عبور کر کے بقایا دشمنوں کو بھی زیرنگیں کر لیا۔ اس نے یہ علاقہ گکھڑ شاہ کو بخش دیا۔ جس کی اولاد یہاں آٹھ

صدیوں تک حکومت کرتی رہی۔ راولپنڈی میں گکھڑوں اور شیر شاہ سوری کی لڑائی ہوئی۔ شیر شاہ سوری کی فتح انتہائی زبردست تھی اور اس کی تعمیرات کے نشانات آج تک باقی ہیں۔ اس نے مشہور جرنیلی سڑک (Grand Trunr Road) بنوائی جو کلکتہ سے پشاور تک پھیلی ہوئی ہے۔ پھر سکھوں نے طاقت حاصل کی اور 1765ء سے 1848ء تک سارے پنجاب پر حکومت کرتے رہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں راولپنڈی میں انہوں نے اسلام کے احیاء کی تحریک کو دبانے کی کوشش کی۔ 1858ء میں برطانوی فوجوں نے سکھوں کو شکست دی اور 1947ء میں تقسیم تک علاقے پر حکومت کرتے رہے اس عرصے میں انگریزوں نے عظیم الشان گرجے تعمیر کرائے اور شیر شاہ سوری کی سڑک کو دوبارہ بنوایا۔ لوگوں کو خوش کرنے کے لیے انہوں نے چھاؤنی بنوائی اور آخرکار یہ شہر شمالی علاقہ کا ہیڈ کوارٹر بن گیا۔ ابتدا میں ڈویژن کا صدر مقام جہلم تھا لیکن اسے بعد میں راولپنڈی منتقل کر دیا گیا۔ آجکل یہ پاکستانی فوج کا ہیڈ کوارٹر ہے اور حکومت کے تحت بڑی ترقی کر رہا ہے۔

راولپنڈی ایک بڑا صنعتی اور تجارتی شہر بھی ہے۔ یہاں مشہور مری بریوری (Murree Brewery) کا کارخانہ اور ہیڈ کوارٹرز ہے۔ گردونواح میں اور بہت سی اہم صنعتیں ہیں۔ یہاں ہوزری، گلاس کے کارخانے اور حتیٰ کہ بجلی گھر کے پاس ربڑ کا کارخانہ بھی ہے۔ بے شمار کپڑے کے کارخانے جس میں کوہِ نور، باندے اور ہنزہ شامل ہیں، ہمہ وقت چلتے ہیں۔ دو بڑے اُون کے کارخانے ہیں جو ہوزری کے کارخانوں کو اُون مہیا کرتے ہیں۔ وطن وولن ملز میں دو ہزار پانچ سو اور راحت وولن ملز میں ایک ہزار چھ سو کرگھے ہیں۔

ان بڑی صنعتوں کے علاوہ یہاں چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں بھی ہیں جہاں ٹوکریاں لکڑی کا کام، دیسی جوتے، سوٹ کیس اور خوبصورت کشیدہ کاری کی شالیں بنتی ہیں۔ اس شہر کے خوشگوار ماحول میں اجنبی جلد ہی مانوس ہو جاتے ہیں۔ بے شمار بازار نہایت خوبصورت ہیں۔ کم از کم ان میں سے نو بازاروں میں خریداروں کی پسند کی تمام چیزیں ملتی ہیں۔ راجہ بازار جانا ہرگز نہ بھولیے۔ جہاں ہر چیز ملتی ہے۔ صرافہ بازار میں خوبصورت زیورات اور عطریات نمائش کے لیے رکھے رہتے ہیں۔ بوہڑ بازار میں دوائیوں کی بیشمار دکانیں ہیں۔ سبزی منڈی میں گھس کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ کسی لامتناہی باغ میں آ گئے ہیں...... راولپنڈی میں بے شمار بینک ہیں جن میں اسٹیٹ بنک بھی شامل ہے یہاں آپ کسی ریسٹ ہاؤس میں بھی ٹھہر سکتے ہیں اور مقامی ماحول کی زندگی کے عادی

ہو سکتے ہیں۔ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کے علاوہ یہاں میو روڈ پر مغربی پاکستان ہاؤس، پشاور روڈ پر مشرقی پاکستان ہاؤس اور سیٹلائٹ ٹاؤن میں سرکاری گیسٹ ہاؤس ہے۔

راولپنڈی میں تفریح کے مقامات بے شمار ہیں۔ بارہ سینما گھر ہیں، فلیشمین کے سامنے کرکٹ کا میدان ہے۔ پانچ مشہور کلب ہیں جن کے دروازے سیاحوں کے لیے ہمیشہ کھلے ہیں۔ پنڈی کلب کے علاوہ یہاں ڈیپارٹمنٹل کلب اور ٹاؤن کلب اور سوئمنگ پول بھی ہیں۔ چھاؤنی کے علاقہ میں آرمی میوزیم، مچھلی گھر، آرمی سپورٹس سٹیڈیم اور ریس کورس ہیں سیاحوں کے لیے دوسری دلچسپیوں کے علاوہ یہاں بھاروالہ ہے جہاں قدیم قلعہ کے کھنڈرات ہیں جو گکھڑوں کے زمانہ میں صدر مقام تھا۔ گکھڑ قوم کے کچھ افراد آج بھی یہاں رہتے ہیں یہ قلعہ دریا سوواں کے قریب چٹیل ڈھلان پر واقع ہے۔ جنرل جان نکلسن کی یادگار راولپنڈی سے پندرہ میل دور حسن ابدال جانے والی سڑک پر ہے۔ یہاں ایک صاف شفاف پینے کے پانی کا تالاب ہے۔ سڑک کے شمال میں پہاڑیوں کو کاٹ کر نو سو فٹ لمبی سرنگ بنائی گئی ہے۔ مرگلہ میں شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانہ کا راستہ ہے منقش پتھروں کے نشانات لگے ہیں۔ ایک تاریخ بھی کھدی ہے جو 1672ء کے مطابق ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اورنگ زیب نے شہزادہ سلطان کو قبیلہ خٹک اور دریائے سندھ کے پار رہنے والے قبائل کے خلاف لڑنے بھیجا تھا۔

راولپنڈی سے چودہ اور ریوات سے تین میل کے فاصلہ پر مانکیالہ کے کھنڈرات ہیں۔ رسالو کی کہانی اسی شہر سے منطبق ہے کہا جاتا ہے کہ سیالکوٹ کے راجہ سالیوواہنا کا بیٹا رسالو سات راکھشسوں کا دشمن تھا جو مانک پور مانکیا نوالہ کا پہلا نام میں رہتے تھے۔ یہ راکھشس روز ایک آدمی کھاتے تھے جس کا انتخاب قرعہ کے ذریعے ہوتا تھا۔ ایک دن رسالو نے ایک عورت کو کھانا پکاتے وقت روتے اور گاتے ہوئے دیکھا رسالو کو اس پر تعجب ہوا اور اس نے عورت سے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ عورت نے جواب دیا۔ ’’میں خوشی میں گا رہی ہوں کہ آج میرے اکلوتے بیٹے کی شادی ہے، روتی اس لیے ہوں کہ قرعہ میں آج اس کا نام نکلا ہے اور وہ راکھشسوں کی خوراک بنے گا۔‘‘

’’رونا بند کرو اور لڑکے کو اپنے پاس رکھو۔ میں ساتوں راکھشسوں کا مقابلہ کروں گا اور تمہارے لڑکے کی جگہ خود جاؤں گا۔ اس کے بعد وہ مانکپور گیا اور بہادری کے ساتھ سوائے ایک

کے سب راکھشسوں کو قتل کر ڈالا۔ بچنے والا راکھشس جس کا نام ٹھیرا تھا کہا جاتا ہے آج بھی گندگارتھ کے ایک غار میں رہتا ہے۔ یہ پرانی کہانی سیکائے سے متعلق بدھوؤں کی روایت سے ملتی جلتی ہے جس نے اپنا جسم سات شیروں کے حوالے کر دیا تھا۔

راولپنڈی کی پرسکون ترقی کا اس کی اہم جغرافیائی حیثیت سے گہرا تعلق ہے۔ قدیم تاریخی حملوں کے راستے پر واقع یہ شہر صوبہ سرحد سے سڑک کے ذریعے براہ راست ملا ہوا ہے اور یہاں سے خوبصورت وادی کاغان جانے کے لیے ایبٹ آباد سے گزرتا ہوا جیپ کا راستہ ہے۔ صاف موسم میں روزانہ طیارے گلگت یا سکردو کے لیے پرواز کرتے ہیں۔ ان پہاڑی مقامات کے لیے اجازت نامے پنڈی میں وزیرِ امور کشمیر سے براہِ راست مل سکتے ہیں۔ راولپنڈی سے پشاور یا لاہور آپ ہوائی جہاز، ریل یا کار کے ذریعہ جا سکتے ہیں۔ ٹیکسلا اور ہزارہ نزدیک ہی ہیں۔ مری صرف اڑتیس میل دور ہے۔

گیارہ لاکھ سینتیس ہزار پچاسی افراد کی آبادی والے اس شہر میں تعلیمی سہولتیں بیشمار ہیں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے بیس ہائی سکول، تین ڈگری کالج اور لاتعداد ابتدائی سکول ہیں آس پاس کے دیہاتوں میں بھی سکول ہیں۔

راولپنڈی کو ہر دور میں مجاہدین اور شہدا نے پاک رکھا ہے۔ اکتوبر 1953ء میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں ایک جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے یہیں شہید ہوئے تھے۔ آج کل اس شہر کو پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی ذات نے متبرک بنا دیا ہے جو اپنے رفقاء کے ساتھ ملک کی معاشی، سماجی اور تعلیمی ترقی کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔

پنڈی میں شروع میں آباد ہونے والوں میں ریلوے ملازمین کے خاندان ہیں۔ ریلوے کے سابق ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ جناب ایف، ایم خاں راولپنڈی میں میرے میزبانوں میں سے ایک تھے۔ اس دوران میں روز صبح ناشتہ کے میز پر نہایت عمدہ دودھ موجود ہوتا تھا۔ یہ اتنا لذیذ اور کراچی کے دودھ سے اتنا مختلف تھا کہ میں نے بیگم خان سے پوچھ ہی لیا کہ وہ دودھ کہاں سے حاصل کرتی ہیں وہ مسکرائیں اور جواب دیا۔ ”آپ دیکھتی نہیں کہ میں نے اپنے باغ میں بھینس پال رکھی ہے۔“ کتنی سیدھی بات ہے۔

پنڈی کے لوگ بھینس پالتے ہیں اور اپنے مہمانوں کو خوش اور صحت مند رکھتے ہیں۔

راولپنڈی میں آج کل چھٹیوں میں آنے والے لوگوں کے علاوہ اکثریت تجارتی وفود کی ہوتی ہے جو ہر ایشائی ملک سے یہ دیکھنے آتے ہیں کہ پاکستان میں کیا مل سکتا ہے۔ کچھ ہی عرصہ کی بات ہے یہاں چینی وفد آیا ہوا تھا اور ایک معاہدے پر دستخط ہوئے جس کے بعد چینی حکومت نے مغربی پاکستان کے کارخانوں سے ہزاروں ٹن روئی خریدنی شروع کر دی۔ اس سے پہلے جرمنی ترکی، عراق اور مشرق قریب سے وفود آئے۔ یہ لوگ یہاں اجنبیوں کی طرح آئے۔ تجارتی حیثیت سے ٹھہرے اور دوستوں کی طرح واپس گئے۔ راولپنڈی میں ان پر نوازشات کی بوچھاڑ ہوتی گو آمد پر ان کا استقبال کراچی میں گرم جوشی سے کیا جاتا ہے۔ ایسی فراخدلی انہیں دوسرے ممالک میں کم ملے گی۔ درحقیقت وہ ان نوازشات سے مغلوب ہو جاتے ہیں یہی تجارتی لوگ ایک دن اپنے خاندانوں کے ساتھ جمہوریہ پاکستان کے قلب، عبوری دارالحکومت راولپنڈی میں لطف اٹھانے کے لیے سیاحوں کی حیثیت سے آئیں گے۔

منگلا ڈیم عظیم منصوبہ

عظیم منگلا ڈیم...... جہاں تاریخ جنم لے رہی ہے۔ مسحور کن الفاظ جو ایسی خوش آئند زندگی کا پتہ دیتے ہیں جس کا قدیم لوگوں نے تصور بھی نہ کیا تھا...... ایک حقیقت ہے جو سچائی کا روپ دھار رہی ہے۔ پاکستان کا یہ علاقہ پانی کے ساتھ ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

حکومتِ پاکستان کی زیرِ نگرانی امریکیوں نے اپنے وطن سے دوڑ دھوپ کی سرزمین میں اپنا گھر بسا لیا ہے اور اس خوش باش چھوٹی سی دنیا میں ہر طرف سکون اور طمانیت کا راج ہے۔ امریکی لوگ مختلف مذاہب اور اقوام کے ساتھ رہنا سیکھ رہے ہیں اور ان کے بچے پاکستانی، فرانسیسی اور جاپانی بچوں کے ساتھ پڑھائی، کام اور کھیل کود میں لگے ہیں۔ اس وقت کتنی خوشی منائی گئی۔ جب منگلا میں سوویں بچے کی پیدائش کا اعلان کیا گیا۔ یہ ایک پاکستانی بچہ تھا جس کی ولادت امریکی ڈاکٹر اور موٹی تازی ہنس مکھ نرس کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ یہ خیر سگالی کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ سفارتی حلقہ کے لوگ ہر ممکن طریقے سے لوگوں میں اپنائیت کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

بین الاقوامی منصوبوں میں منگلا نے جو چند سال پہلے ایک غیر معروف مقام تھا۔ اب حقیقی بین الاقوامی حیثیت حاصل کر لی ہے اور مختلف ممالک کے لوگ شانہ بشانہ نہایت جوش و خروش اور تعاون کے ساتھ محنت میں مصروف ہیں۔ اس منصوبہ کے لیے مقام کے انتخاب سے پہلے کئی سال تحقیقات اور اراضیاتی تجربوں میں صرف ہوئے۔ یہ تمام کام پاکستان کے پانی اور بجلی کے ترقیاتی ادارہ (WAPDA) نے اپنی اور پارٹنرز کے اشتراک سے کیا تھا جو 1958ء سے اس ادارہ کے مشیر ہیں۔ تکمیل کے بعد ڈیم کے ایک طرف بہت بڑا بجلی گھر ہوگا اور دوسری طرف فالتو پانی کے نکاس کا راستہ بجلی گھر کے لیے پانچ میں سے تین نہروں سے کام لیا جائے گا جہاں کھدائی کا کام جاری ہے نہروں کی تکمیل سے پہلے تقریباً ایک کروڑ مکعب گز مٹی کھود کر دوسری جگہ منتقل کی جائے گی۔

جب بھی اس منصوبہ کا کوئی حصہ مکمل ہوتا ہے اور دوسرے پر کام شروع ہوتا ہے تو پاکستانی مزدور خوشی سے ناچنے لگتے ہیں۔ انہیں یہ جان کر بڑی طمانیت ہوتی ہے کہ ان کا کام تیزی سے ختم ہو رہا ہے ان کی نظر میں پانی وسیلۂ خوشحالی ہے اور منگلا میں یہ بات پورے طور پر نمایاں ہے۔

پاکستانیوں کے لیے منگلا طلسماتی اثر رکھتا ہے اور اس کا نام آتے ہی ذہن میں اس کا ماضی اور درخشاں مستقبل گھومنے لگتا ہے۔ یہ سیارہ مریخ کا نام ہے اور رومان اس کا حصہ رہا ہے۔ داستانوں سے پتہ چلتا ہے کہ ایک زمانہ میں یہاں راجہ سرکپ کا قلعہ تھا جس کو اس نے جنگ میں داؤ پر لگا دیا۔ جب وہ ہار گیا تو اس نے اپنی خوبصورت بیٹی کو پیش کیا۔ وہ اس قدر خوبصورت تھی کہ جیتنے والے خوش قسمت راجہ رسالو نے اس سے شادی کر لی۔ ان کا عروسی بجرا دریائے جہلم کے دائیں کنارے نہر میں برل گاؤں کے پاس سے گزرا تھا جہاں آجکل ڈیم پر کام کرنے والے امریکی رہتے ہیں۔

منگلا نے جو کسی زمانے میں لڑائیوں، خوشیوں اور فتوحات کا مقام تھا، اب سودمندی کا روپ دھار لیا ہے اور اس کا پانی مغربی پاکستان کی خشک زمین کی پیاس بُجھائے گا۔ شروع میں دس ہزار مزدوروں کے لیے کیمپ اور دو سو گھر بنائے گئے جو مزدوروں کے اپنے مکانات سے بہت بہتر ہیں اور جہاں رہ کر وہ بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اس کے بعد اسی بستروں والا ہسپتال بنا اور پھر پاکستانی علاقہ میں دو عمدہ شفا خانے قائم کیے گئے۔ دو سکول جن میں سے ایک یورپی طرز کا ہے اور دوسرا پاکستانی بڑی عمدگی سے چل رہے ہیں۔ ان کے کمرے شوخ رنگوں کے ہیں اور کھیلنے کے لیے بڑے بڑے میدان ہیں۔

یہاں سیر کرنے اور استادوں کو لڑکوں کو پڑھاتے دیکھ کر بہت لطف آتا ہے۔ پھلوں کا رس دودھ اور کھانا تمام بچوں کو ملتا ہے اور ان کی اس طرح حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ سکول جانا ان کے لیے باعثِ مسرت ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر ان کے والدین بہت مطمئن رہتے ہیں خواہ باپ ڈیم پر کام کرنے والا مزدور ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کے بچے کو وہ تمام تعلیمی سہولتیں ملتی ہیں جو کسی فورمین کے بچے کو۔ ہزاروں مزدوروں کو خاص طور پر تیار کیا ہوا دوپہر کا کھانا ملتا ہے۔

بازار پُر رونق ہیں اور تجارتی مرکز میں خوبصورت دکانیں بنائی گئی ہیں تا کہ عورتوں کو روزمرہ کی چیزیں خریدنے کے لیے دور نہ جانا پڑے۔ تازہ چیزیں اتنی عمدہ ہوتی ہیں کہ امریکی بھی انہیں خریدنے کے لیے آتے ہیں اور بہت سے تو انہیں ڈبوں میں بند چیزوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ پاکستانی علاقے میں درزی اور موچی نہایت ارزاں قیمت پر بڑا عمدہ کام کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ یہاں ڈیم بننے سے پہلے بھی رہتے تھے لیکن ان میں بیشتر کسان تھے جن کے پاس گائیں، بھینسیں، بیل اور اپنی زمین تھی۔ انہیں اپنی جگہ سے اکھاڑنا کوئی آسان کام نہیں تھا اور پھر پاکستانی کسان تو اپنے آخری سانس تک کسان ہی رہتا ہے۔

اچھی اُجرت اور حالات میں اچانک تبدیلی بھی کسان کو متاثر نہ کر سکی۔ وہ تو اپنے جانور، گھوڑے اور زمین چاہتا تھا۔ آخر اس نے جگہ چھوڑنے کا معاوضہ قبول کر لیا اور منگلا ڈیم محکمہ آباد کاری کی مدد سے اپنے خاندان اور جانوروں سمیت نئے مکان اور نئی زمین پر بخوشی منتقل ہو گیا۔ اس منصوبہ کی وجہ سے اٹھارہ ہزار پانچ سو خاندان متاثر ہوئے جن میں سے تین ہزار جگہ چھوڑنے پر خوش تھے باقیوں کو دو لاکھ تینتیس ہزار نو سو تینتیس ایکڑ زمین الاٹ کی گئی اور پانچ کروڑ پچپن لاکھ روپیہ دیا گیا اس کے علاوہ نو کروڑ چالیس لاکھ روپیہ معاوضہ کے طور پر ادا کیا جا رہا ہے۔ اب وہ لوگ بالکل مطمئن ہیں جنہیں اپنے گھر چھوڑنے پڑے۔ نئی جگہ ملنے کے علاوہ ان کے پاس بہت سی چیزیں خریدنے کے لیے پیسہ بھی تھا جو وہ پہلے نہیں خرید سکتے تھے۔ منگلا کے پرانے اور نئے لوگ اب بالکل مطمئن ہیں پچیس ایکڑ میں پھیلے ہوئے فارم سے انہیں سبزیاں، مرغیاں اور انڈوں کے علاوہ پھول بھی ملتے ہیں جو پاکستانیوں کو بے حد بھاتے ہیں۔

تمام ضروری سامان کی دیکھ بھال کے لیے ایک ورکشاپ قائم کی گئی ہے چھ ایکڑ کے رقبہ میں سپلائی ڈپو بھی کھولا گیا ہے۔ یہ تمام کام واپڈا نے کیا ہے جو ہر طرح کا آرام مہیا کرنے میں کوشاں ہے۔ آٹھ ہزار مزدوروں نے منصوبہ کی آدھے سے زیادہ علاقہ میں کھدائی کر ڈالی ہے۔ اس میں خاص ڈیم کے ایک کروڑ بیس لاکھ مکعب گز کے علاقہ میں سے ایک کروڑ دس لاکھ مکعب گز کا حصہ بھی شامل ہے۔ یہ کام بہت زیادہ ہے۔ منگلا پہاڑی جو اس علاقے میں سب سے اونچی جگہ ہے اور جس پر تین لاکھ کلوواٹ کا بجلی گھر قائم کیا جا رہا ہے کی شکل بالکل بدل چکی ہے۔ ڈیم کے باقی حصوں پر بھی کافی کام ہو چکا ہے اور یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ ہر مزدور اپنی پوری کوشش کر رہا ہے۔

بیشتر پاکستانی تعلیم یافتہ انجینئر، ڈرافٹسمین اور ماہرِ ارضیات ہیں جنہوں نے انگلینڈ، جرمنی اور امریکہ میں تعلیم پائی ہے اور اب انہی کمپنیوں کے ملازم ہیں جہاں انہوں نے واپڈا اور بنی (Wapda and Binnie) کے زیرِ نگرانی تعلیم پائی ہے جو واپڈا کے برطانوی مشیر ہیں۔ منصوبہ کے سربراہ مشہور انجینئر میاں بشیر تمام کام کرنے والوں کو اپنے خاندان کا فرد سمجھتے ہیں اور اگر کوئی کام خراب ہو جائے تو وہ سب ٹھیک ٹھاک کر دیتے ہیں۔

اپنے دفتر اور واپڈا ریسٹ ہاؤس میں جہاں معزز مہمان ڈیم دیکھنے آتے ہیں وہ بے حد مصروف رہتے ہیں۔ اکثر اپنے گھر وہ رات گئے پہنچتے ہیں کیونکہ ان کی نظر میں منصوبہ سب سے مقدم ہے میاں بشیر تمام لوگوں کو جو بارہ ہزار سے اوپر ہیں، خوش رکھنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے دن رات کوشاں رہتے ہیں۔

برل کالونی میں میاں بشیر کا خیر مقدم کیا جاتا ہے اور وہ امریکہ کے یوم آزادی کی تقریبات میں حصہ لیتے ہیں۔ چودہ اگست کو پاکستانی علاقہ میں انہوں نے امریکنوں کی میزبانی کی اور اس بات کا خاص خیال رکھا کہ وہ تمام تقریبات سے لطف اندوز ہو سکیں۔ میاں بشیر ہر وقت امریکی ٹھیکہ داروں سے بات چیت کے لیے تیار رہتے ہیں اور اس طرح تمام معاملات نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام پاتے ہیں۔ یہ لوگ آپس میں اس وقت کا تذکرہ کرتے ہیں جب ڈیم مکمل ہو جائے گا۔ پانی کو مقررہ مدت میں موڑنے کے علاوہ یہاں سو مربع میل لمبی جھیل ہو گی جو سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہو گی۔ یہاں کشتی رانی، تیراکی اور مچھلیاں پکڑنے کا انتظام ہو گا۔ امریکی اور پاکستانی ڈائریکٹروں کے باہمی تعاون کی وجہ سے تعمیر کا کام نہایت تیزی سے مکمل پا رہا ہے۔

پاکستانی مزدوروں کے لیے صرف کام ہی سب کچھ نہیں ہے۔ ان کے لیے مفت سینما، کھیل اور تیراکی کے مواقع حاصل ہیں۔ اس علاقہ میں مساجد، گرجا اور چھوٹے چھوٹے کیفے ہیں جہاں وہ حقہ اور پائپ کا لطف اٹھاتے ہیں اور آرام کرتے ہیں۔ ان کے لیے نمائشیں اور تقریبات منعقد کی جاتی ہیں گو بیشتر مزدور اپنے گھر جا کر آرام کرنا پسند کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ جنہیں پڑھنے لکھنے کا شوق ہے۔ منگلا میں رات کے سکول جاتے ہیں۔ وہ پاکستانی لوک ناچوں سے محظوظ ہوتے ہیں جو ان کی تفریح کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ برل کالونی میں امریکیوں کے لیے یہ گروہ رقص کرتے ہیں۔

یہاں تخلیقی سرگرمیوں اور دوسرے مشاغل کی طرف بھی توجہ دی جاتی ہے۔ یہ ان پاکستانی

مزدوروں کی زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس سے پہلے اپنے علاقہ سے باہر نہیں نکلے، اب انہیں معلوم ہے کہ محنت سے وہ ہر کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ ہمت اور شجاعت نے مختلف روپ دھار لیے ہیں۔ پاکستانیوں نے جو پہلے کام میں ماہر نہیں تھے اب مختلف شعبوں میں تربیت حاصل کر لی ہے۔ ایسی تربیت جو آئندہ ان کے ذریعہ معاش کا کام دے گی۔ ان کی زندگی میں روحانی اور اخلاقی پختگی آ گئی ہے۔ اب ان کے کلب میں جن کے بارے میں انہوں نے پہلے سُنا تک نہ تھا۔ ان کے اپنے سربراہ ہیں جو قبیلہ کے سردار نہیں بلکہ اپنی اہمیت کی وجہ سے سربراہ بنے ہیں۔ اب یہ لوگ اپنے ماضی کی کوتاہیوں سے آگاہ ہیں جو حکمت حاصل کرنے کی طرف پہلا قدم ہے۔ منگلا میں پاکستانیوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ انسانی محنت کوئی بازار میں ملنے والی جنس نہیں۔ محنت اور شوق سے کام کرنے میں عزت اور وقار ہے۔ عزت محنت سے ملتی ہے اور دنیا کے سب سے بڑے منصوبے منگلا ڈیم...... پر مزدور کی حیثیت سے کام کرنے میں ان کے پیشے میں خوشی ہی خوشی ہے۔

برل کالونی جہاں امریکی رہتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی لیگ آف نیشنز (League of Nations) کی طرح ہے جہاں تمام لوگ برابر ہیں۔

شام کو آرام کے بعد لوگ سیر اور سینما دیکھنے نکلتے ہیں جو امریکیوں اور پاکستانیوں سب کے لیے کھلے ہیں اس طرح چھٹی کا دن گزر جاتا ہے۔

ڈیم پر کام کسی وقت بند نہیں ہوتا۔ دن رات چوبیس گھنٹے برل کالونی کے تین سو جوان اور بوڑھے دھوپ اور بارش کی پرواہ کیے بغیر مختلف کاموں میں جٹے رہتے ہیں۔ پاکستانی انجینئر بھی ان کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں اور ان کی زیرِ نگرانی ہزاروں مزدور کام میں لگے رہتے ہیں۔ تعاون بے پناہ ہے اور مشترکہ کوششوں کے نتیجہ میں ہر طرف دوستی ہی دوستی ہے۔ ہر روز یہ لوگ نئی معلومات کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں گویا وہ کسی سکول کے طالب علم ہوں۔

منگلا ڈیم کی تعمیر ملک کی عظمت میں اضافہ کرے گی علاقہ کے لوگوں کے لیے ترقی کی راہیں کھولے گی اور وہ اس خوشحالی سے فیضیاب ہوں گے جو انہیں پہلے میسر نہیں تھی۔ بالائی جہلم نہر کے ہیڈ ورکس کے نزدیک امریکی زمین اور سرنگوں کے نیچے گیارہ ہزار فٹ لمبائی اور تین سو اسی فٹ کی بلندی پر پھرتے نظر آتے ہیں۔ انہیں دنیا کے سب سے بڑے ڈیم کی تکمیل میں حصہ لینے پر فخر ہے۔ انہیں منگلا ڈیم کے ان فوائد کا احساس ہے جو کسانوں کو معاہدہ قرطاس سندھ کے تحت

ہندوستان کے تین دریاؤں کا پانی بند ہونے کے بعد حاصل ہوں گے۔ منگلا ڈیم میں سیلاب کے زمانے میں پچاس لاکھ دس ہزار ایکڑ فٹ پانی اکٹھا کر کے سردیوں میں پانی کی کمی کے زمانے میں چھوڑا جائے گا۔ منگلا ڈیم کا مقصد دریائے جہلم کے پانی کو محفوظ کرنا ہے اور یہ قرطاس سندھ کے بڑے منصوبوں میں سے ایک ہے۔

اس عظیم منصوبہ کی سب سے پہلی ضرورت مزدوروں کے لیے رہائش کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ شہر تعمیر کیا گیا۔ خاندانوں کے لیے مکانات اور کنواروں کے لیے خوبصورت کمرے بنائے گئے لازمی چیزوں سے آراستہ ہسپتال خوبصورت باغ میں نہانے کا تالاب، قہوہ خانہ، آرام دہ بار اور ریسٹورنٹ، ٹینس کورٹ، والی بال کے میدان اور دوسری تمام تفریحی سہولتیں مہیا کی گئیں، یہاں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک گرجا گھر ہیں۔ مکمل ائیر کنڈیشنڈ بازار ہے خوبصورت سپر مارکیٹ ہے اور ایک آرائش خانہ (Beauty Saloon) ہے جسے امریکی عورتیں چلاتی ہیں جو صبح سے شام تک مصروف رہتی ہیں۔ چھوٹی سی خوبصورت لائبریری میں صنعت و حرفت کی کلاسیں ہوتی ہیں۔ امریکی عورتیں اپنے فالتو وقت میں جو سلائی بُنائی اور دوسرے تعمیری کام کرتی ہیں وہ یقیناً قابلِ تعریف ہے۔ منگلا میں سکول بھی تعمیر کیے گئے ہیں جہاں تین سو بچے تعلیم پا سکتے ہیں۔

پہلے سال کے اختتام پر پاکستان میں امریکی سفیر والٹر میکنا گھی، عالمی بنک کے انجینئرنگ کے مشیر جنرل وہیلر اور واپڈا کے انجینئرنگ کے مشیر جنرل اچز نے منصوبہ کا معائنہ کیا۔

ایک اخباری انٹرویو میں امریکی سفیر نے منصوبہ کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا: ''میں نے اندازہ کیا ہے کہ کام کی رفتار بے حد تیز ہے۔ بہت سا کام تکمیل پا چکا ہے پیچیدہ مشینوں پر پاکستانی مزدوروں کی کارگزاری دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ امریکی اور پاکستانی کارکنوں کے لیے سہولتیں نہایت عمدہ ہیں۔ میں لوگوں میں کام کا شوق اور ٹھیکہ داروں، انجینئروں اور واپڈا کے درمیان اچھے تعلقات اور تعاون سے بھی بے حد متاثر ہوا ہوں۔ میرے لیے یہ بہت خوش کن تجربہ ہے۔''

برل کالونی امریکی شہر کا خوبصورت نقشہ ہے جہاں پانچ سو خاندان رہتے ہیں جن میں سے بہت سے واپڈا کے انجینئر اور برطانوی اور بیرونی مشیر ہیں۔ بھاری مشینوں، ٹریکٹروں اور مٹی کھودنے والے انجنوں کے ساتھ زندگی اپنے ڈھرے پر چل رہی ہے۔

امریکی اور دوسری عورتیں مل کر دفاعی کاموں میں حصہ لیتی ہیں جو ان کی نیک دلی کی علامت ہے۔ بہت سی عورتیں رضاکارانہ طور پر دوستیاں کے لیے دوکان ٹی۔ ایس۔ اے (T.S.A. SHOP) میں کام کرتی ہیں۔ یہ دوکان غریب لیکن ذہین پاکستانیوں کی بہبودی کے لیے کھولی گئی ہے۔ جن کا کام اس دوکان سے چلتا ہے اور جنہیں فروخت سے حاصل ہونے والی تمام آمدنی ملتی ہے۔ ''دوستیاں'' ان عورتوں کی محفل ہے جو رفاعی کاموں کے لیے اپنی خدمات پیش کرتی ہیں اور میزبان ملک میں خیر سگالی کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ ٹی ایس اے جس سے مراد ٹیکنیکل سروس ایسوسی ایشن ہے عورتوں اور لڑکیوں کو کام مہیا کرنے کے لیے لاہور میں قائم ہوئی تھی تاکہ معیار زندگی بلند کیا جاسکے۔ انہیں کشیدہ کاری کا کام سکھایا جاتا ہے اور مال مہیا کیا جاتا ہے۔ کام کا اچھا معاوضہ ملتا ہے۔ اس کے نتائج حیران کن ہیں۔ یہاں کشیدہ کاری کی ہوئی ساڑھیاں، بچوں کے خوبصورت کپڑے اور ہاتھ کی بُنی ہوئی دوسری چیزیں ملتی ہیں۔ پھر دُوستیاں، منگلا منتقل ہوگئی اور بہت سی عورتیں اس کی ممبر بن گئیں۔ ان خواتین کو اس غیر منافع بخش ادارہ کی رکنیت پر فخر ہے جس کے تحت ریڈ کراس اور زچہ و بچہ کی بہبود کا مرکز بھی چل رہا ہے۔ تحائف اور ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں کی دکانیں برل کالونی میں خوب چلتی ہیں۔ فیروزسنز کی چھوٹی سی دکان بھی مقبول جگہ ہے۔ فوٹوگرافک کلب تعلیمی موضوعات پر فلمیں دکھاتا ہے جن سے برل کالونی کے لوگ خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔

کالونی کے لوگ بچوں اور والدین کی محفل: سکاؤٹوں کا کیمپ 4 جولائی کو امریکہ کے یوم آزادی کی تقریبات، بنگو، رقص، تیراکی کے مقابلے، برج کی کلاسیں، ڈرامے اور ہر طرح کی محفلیں منعقد کرتے ہیں جن میں تمام لوگ ہنسی خوشی حصہ لیتے ہیں۔ انفرادی طور پر یہاں لوگوں کی بہبود کے لیے اور بھی بہت سی چیزیں ہیں۔ منگلا میں ایک امریکی عورت نے ٹائپ رائٹر خرید کر طالب علموں کو کام میں مدد دینے کے لیے مستعار دے دیئے ہیں۔ میرے خیال میں سب سے اثر انگیز وہ دن تھا۔ جب منگلا کی پنک لیڈیز (Pink Ladies) ایک امریکی خیراتی ادارہ نے برل ہسپتال میں پیدا ہونے والے سوویں بچے کو تحائف سے لاد دیا۔ یہ خوبصورت پاکستانی بچہ واپڈا کے انجینئر کا تیرہواں بچہ تھا جو خوش قسمتی سے اپنے ملک کے یوم آزادی 14 اگست کو پیدا ہوا تھا۔
ں بچہ کی پیدائش پر شوروغوغا کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ پاکستانی امریکی کالونی میں پیدا ہوا تھا۔

آر جی بالڈ کو بھی اس کی فوراً اطلاع دی گئی اور وہ بے حد خوش ہوئے۔

برل کالونی کی ایک اور خاص چیز چھوٹا سا اخبار برل ٹاؤن کرائیر (Baral Town Crier) ہے۔ جس کو منگلا ڈیم ٹھیکہ داروں کا محکمہ تفریح چھاپتا ہے۔ اس میں تمام خبریں اور عورتوں کی پسند کے لطیفے ہوتے ہیں۔ مختلف اطلاعات، اسکول کی خبریں، سفر کے بارے میں اطلاعات (منگلا میں پان امریکن اور پی آئی اے کے دفاتر موجود ہیں) منگلا آنے والے لوگوں اور مشہور صحافیوں اور ان کے اپنے محکمہ تعلقات عامہ کے مضامین بھی چھاپے جاتے ہیں۔ برل کالونی میں ٹاؤن کرائیر کی حیثیت بالکل روزنامہ اخبار کی سی ہے۔

گو برل میں امریکی اور یورپی گروہ اونچے درجے کے پاکستانیوں سے مختلف تقریبات اور کام پر ہر وقت ہی ملتے ہیں لیکن برل بذاتِ خود ایک چھوٹا سا محدود علاقہ ہے۔ ہر امریکی دوسرے سے واقف ہے۔ امریکہ کی طرح ایک دوسرے کی خدمت کے جذبہ نے انہیں یکجا کر رکھا ہے۔ یہاں پانچ سو خوبصورت مکانات، دو منزلہ فلیٹ اور کنواروں کے لیے ایک سو دس کوارٹر ہیں جو باغات اور ہرے بھرے میدانوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ اس علاقہ میں طمانیت ہی ہے جن کے پاس اپنی کاریں ہیں ان کے لیے بسیں مفت چلتی ہیں (گو تقریباً ہر ایک کے پاس جیپ یا کار موجود ہے) منڈامکو (Mandamco) اور دوسرے کلب اور سینما سب کے لیے کھلے ہیں۔ آپ کا ذوق کچھ ہی کیوں نہ ہو یہاں تفریح کے تمام ذرائع موجود ہیں۔ کوئی خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا۔ ایلکس (Elks) ایسٹرن اسٹار جوبز ڈاٹرز (Jobs Daughters) رینبو گرلز (Rainbow Girls) انڈس ٹوسٹ ماسٹرز کلب اور وائیوز لنچیون (Wives Luncheon) اور دوسرے ادارے ہر ہفتہ میل ملاپ کی محفلیں منعقد کرتے ہیں۔ گاف اور کنٹری کلب میں ہر طرح کی تفریح کے مواقع ہیں۔ ہر چھٹی کے روز محفلیں ہوتی ہیں اور منگلا انٹرنیشنل سکول بچوں کے لیے تقریبات منعقد کرنے میں خاص مقام رکھتا ہے۔ تصاویر کی نمائش اور تقاریر فرصت کے لمحات کو چار چاند لگا دیتی ہیں۔ برل کالونی کے ایک ہزار سات سو چالیس مکینوں میں سے ہر ایک کے لیے کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ یہاں گوشے گوشے سے مسرت پھوٹتی ہے۔

مشہور ٹیکسلا

پرانی اور نئی کھدائیوں تک پہنچنے کے لیے ایک بار پھر راولپنڈی کی جرنیلی سڑک پر واپس آنا پڑتا ہے جو درحقیقت ٹیکسلا کے عظیم الشان آثارِ قدیمہ کی ابتدا ہے کیونکہ یہاں فضا پر ایک پُر اسرار خاموشی طاری ہے۔

راستے کے ساتھ ہرے بھرے کھیت ہیں۔ دیہقانی کپڑوں میں ملبوس گاؤں کے لوگ شرماتے ہوئے آنے والوں کو عجیب نگاہوں سے دیکھتے ہیں جن سے دوستی جھلکتی ہے اناج سے لدی ہوئی بیل گاڑی کار کو راستہ دینے کے لیے رک جاتی ہے۔ زندگی بذاتِ خود پرسکون ہے۔ پتوں سے بھری شاخوں سے لدے پھندے درخت ہوا میں جھومتے ہیں گویا پرانے زمانے کے بارے میں سرگوشیاں کر رہے ہوں۔ اس دور کی باتیں جب خانقاہوں میں رہنے والے راہب علم کا منبع سمجھے جاتے تھے جو لوگوں کے لیے وقت کی ہر چیز کا تعین کرتے تھے۔ دور فاصلہ پر پہاڑیاں نظر آتی ہیں اور سٹوپوں اور ٹیلوں کے کھنڈرات سنہرے آسمان کے سائے میں نظر آتے ہیں۔

ٹیکسلا کے عجائب گھر پہنچنے سے پہلے ذرا سے فاصلہ پر ایک خوشگوار اچنبھا آنے والوں کا خیر مقدم کرتا ہے۔ ماحول سے لگا کھاتا ہوا ہلکی اینٹوں سے بنا ہوسٹل طالبعلموں اور نوجوانوں کے لیے حاضر ہے جو یہاں کچھ روز رہ کر پرانے عہد کی عظمت کے بارے میں کچھ سیکھنا چاہتے ہیں "کتنی خوشی کی بات ہے" میں نے نئی نسل کے بارے میں سوچا حکومت پاکستان نے یہ جدید مقام صرف بارہ آنے روز کے کرایہ پر ان لوگوں کے لیے بنایا ہے جو بستر، پلیٹیں اور دوسری چیزیں اپنے ہمراہ لاتے ہیں۔

عجائب گھر جو خوبصورت باغ میں واقع ہے ایک عظیم خاموشی میں تخیلی جنت کی طرح لگتا ہے۔ کھپریل سے بنی ہوئی یہ عمارت اپنے دامن میں قدیم دور کے خزانے لیے پرشکوہ انداز میں کھڑی ہے۔ دروازہ عمدہ پتھروں کو جوڑ کر بنایا گیا ہے۔ بیضوی شکل کے دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی گلاب کی پتیوں سے منقش محراب آنکھوں کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ محراب ایک سامنے کے دروازے سے نظر آتی ہے جو پھولوں، درختوں اور جھاڑیوں سے بھرے وسیع میدان کو جاتا ہے۔ عجائب گھر کے مہتمم ریاض حسین پُرفخر انداز میں سیاحوں کو چیزیں دکھانے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ ٹیکسلا سے ان کی گہری دلچسپی ان تفصیلات سے ٹپکتی ہے جو وہ آنے والوں کو بتاتے ہیں۔ ان کی باتوں سے احساس ہوتا ہے کہ یہ کوئی عام عجائب گھر نہیں بلکہ مختلف ادوار کی دنیا ہے جو ایک مختلف طرزِ زندگی کی عکاسی کرتی ہے جب وقت کو پر نہیں لگے تھے اور ہر شخص اور ہر شے کو اس کا مناسب مقام ملتا تھا ہماری بیسویں صدی کے اس ہنگامہ خیز دور میں جبکہ تباہی کے ہتھیاروں کی زیادہ اور بہتر تیاری اتنی ہی اہم ہے جتنی قوموں کے درمیان امن قائم رکھنے کے لیے مذاکرات۔ ٹیکسلا کے عجائب گھر اور اس کے تین شہروں میں رکھے ہوئے نوادرات اور فن پارے اصول کی سادگی اور انسانی زندگی کی متبرک قدر و قیمت کا درس دیتے ہیں۔

گندھارا مجسموں کے بہترین نمونوں میں خالص ہندوستانی اور یونانی رنگ نمایاں ہے۔ پتھروں میں کپڑوں کی سلوٹیں، خواب آلود مسکراہٹیں اور پاکیزہ نقوش یونانی مکتب کے مظہر ہیں۔ ان کی صناع کاری اس دور میں مفقود ہے۔ عمدہ پتھر کے بنے ہوئے بے شمار مجسمے اور گل دان چھٹی صدی قبل مسیح سے لے کر پانچویں صدی عیسوی تک موجود ہیں۔ ابھی تک چمکتے ہوئے پیتل کے پیالوں کے کناروں پر ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ مٹی کے برتن، سکّوں اور ہیروں سے ان لوگوں کا عہد ظاہر ہوتا ہے جو انہیں استعمال کرتے تھے۔ خاص کمروں میں خوبصورت الماریوں میں شہزادوں اور بادشاہوں کے جواہرات و زیورات نمائش کے لیے محفوظ رکھے ہیں۔ ہزاروں سال پرانے ہیرے، یاقوت، نیلم اور لعل آج بھی قیمتی ڈبوں میں لگے ہوئے اتنے ہی خوبصورت لگتے ہیں جتنے عرصہ دراز پہلے عورتوں پر سجے ہوئے لگتے ہوں گے۔ چھوٹی چھوٹی انگوٹھیاں اور کنگن ان کی محبت کی نشانیوں کی غمازی کرتے ہیں جو یونانی اور بدھ اپنے بچوں کی پیدائش سے لے کر بڑے ہونے تک استعمال کرتے تھے۔

ان بیش قیمت زیورات پر نادرالوجود صناع کاری کی تفصیل دیکھنے میں ہفتے گزر سکتے ہیں۔ ٹیکسلا کے فن کار غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ جس عہد سے وہ تعلق رکھتے تھے وہ پارسائی، صبر و تحمل اور آشتی کا دور تھا۔ یہ چیزیں عالموں، تعلیم یافتہ لوگوں اور اس دور کا پتہ دیتی ہیں جب صناع کاری تمام پیشوں سے مقدم سمجھی جاتی تھی۔

عجائب گھر کے ٹھنڈے ماحول میں قدیم عہد کی چیزوں کی تعریف کرتے ہوئے انسان خود کو بھول جاتا ہے۔ پھر چائے کا وقت ہو گیا اور مہتمم نے مجھے ٹیکسلا کے مہمان خانہ میں چائے کی دعوت دی۔ میں یہاں کے تکلفات کو دیکھ کر تعریف کیے بغیر نہ رہ سکی کیونکہ تمام انتظامات کسی اول درجہ کے ہوٹل جیسے تھے۔ مجھے افسوس ہوتا تھا کہ یہاں کتنے کم لوگ آ کر ٹھہرتے ہیں۔ مجھے رونا آتا تھا کہ مغربی پاکستان کا محکمہ سیر و سیاحت اپنے کتابچوں میں صرف اتنا بتاتا ہے کہ ٹیکسلا کے ریسٹ ہاؤس میں صرف دو ڈبل اور دو سنگل کمرے، ملحقہ غسل خانے، ڈرائنگ روم اور کھانے کا کمرہ ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ان کتابچوں میں یہاں کی پرانے دور کی دلچسپیوں، باغ اور اس کے گرد دالانوں کا ذکر نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ان پر خلوص پٹھان ملازموں کا بھی نہیں جو آپکی تمام ضروریات پوری کرتے ہیں اور آپ کی منشا کے مطابق کھانے پکاتے ہیں ان کتابچوں میں باہر کے پرسکون ماحول میں سرو کے درختوں کا بھی ذکر نہیں ہے اور نہ یہ ذکر ہے کہ اس مسحور کن خاموشی میں جہاں صرف فطرت کی آواز ہے اور رات کو پتوں کے سَرسَرانے کی آواز آتی ہے ٹھہرنے کا کرایہ کھانے کے علاوہ صرف تین روپیہ یومیہ ہے......

میں نے دنیا بھر کی عظیم الشان اقامت گاہوں کے بارے میں لکھا ہے۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں دریائے چین سے لے کر بحر اوقیانوس تک اور بحر الکاہل سے لے کر ہمالیہ تک ریسٹ ہاؤس نکرا میں بھی ہے جو جولیاں سے صرف ایک میل دور ہے۔ جولیاں ماہرینِ آثار قدیمہ کی جنت ہے جس کے بارے میں اوسط درجے کے سیّاح بہت کم جانتے ہیں۔

ٹیکسلا کی تاریخ اس وقت شروع ہوئی جب دنیا اپنے ابتدائی دور میں تھی۔ اس کا ذکر مہابھارت میں بھی آتا ہے۔ ٹیکسلا کا پہلا نام ٹکشیلا تھا جس کے معنی پتھروں کے شہر کے ہیں۔ اس نام کو بعد میں یونانیوں نے مختصر کر دیا۔ ٹیکسلا پر ایرانیوں نے حملہ کیا اور اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ سات عہدوں کے عروج و زوال کے دور تک، جس میں سکندر اعظم، کنشک، پارتھیائی، چینی،

اشوک اور جنگجو سفید فام ہُن شامل ہیں، ٹیکسلا ترقی کرتا رہا یہ تمام فاتحین اس شہر کو ترقی دیتے رہے حتیٰ کہ یہ امیر ترین شہر کہلانے لگا۔ پارسا لوگ اس کے گرد و نواح میں آ کر عبادت کرتے تھے۔ کاریگر اپنے پیشوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ اس کی شہرت پھیلتی گئی اور دور دور یہ علم کا مرکز سمجھا جانے لگا۔ عالم اور فلسفہ دان اس کی یونیورسٹی میں آتے تھے۔ سکندر کے بیان کے مطابق ٹیکسلا آباد اور متمول شہر تھا اور یہاں دانا گورنر حکومت کرتے تھے۔

اس صدی کے شروع میں ہونے والی کھدائیوں سے علم کے اس مرکز کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ یونیورسٹی میں بڑے بڑے کمرے، تالاب اور مکانات تھے۔ پاس کی پہاڑیوں پر تنہائی اور عبادت کے لیے خانقاہیں بنائی گئی ہیں۔ خوبصورت اور ہوادار سفیدی شدہ اینٹوں سے بنے ہوئے انتیس چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں جن میں چمنیاں ہیں اور دیواروں میں الماریاں بنی ہوئی ہیں۔ یہ طالب علموں اور راہبوں کے کمرے ہیں ان کے فرشوں میں اب بھی مٹی کے برتن دبے پڑے ہیں۔ نیچے اتر کر حکمرانوں کے اسٹوپے ہیں جو گندھارا فنِ تعمیر کے شاہکار ہیں۔ یہ پاس پاس بنے ہوئے ہیں۔ بڑے اسٹوپوں کے گرد چھوٹے اسٹوپے ہیں جو لازماً خاندانوں کے لیے ہیں۔ کنال کے اسٹوپے سے ایک المیہ کہانی وابستہ ہے۔ یہ شہزادہ کنال کی یاد میں تعمیر کیا گیا جس کی آنکھیں اس کی سوتیلی ماں کے حکم سے نکلوا دی گئی تھیں جو بدکار عورت تھی......اشوک کے عہد میں بصیر پہاڑی جو پانچ شہروں میں سے پہلی ہے۔ سنگھا بدھوں کے تربیتی مرکز کا کام دیتی تھی۔ اس کے کھنڈرات میں جو نایاب چیزیں ملی ہیں ان میں سونے اور چاندی کے سکے، لوحیں، ہاتھی دانت اور پیتل کے برتن اور منقش کھلونے شامل ہیں۔ آثار سے مکانات کی قابل تعریف ترتیب کا پتہ چلتا ہے مکانات کو چوڑی سڑکوں اور پھر زیادہ چوڑی شاہراہوں کے ذریعے جدا کیا گیا ہے۔

دوسرا شہر سرکپ یونانی، سیتھی، کشن، پارتھیائی اور کمشکا عہد میں ہمیشہ دارالخلافہ رہا۔ اس کی دیواریں پتھر کی تھیں جن میں سے چار باقی ہیں۔ مکانوں کے بلاک بالکل ترتیب میں ہیں اور اس کے اپسیدال مندر میں دو سر والی چیلوں کی خانقاہ ہے۔ جس پر آرامی زبان کی عبارتیں صاف نظر آتی ہیں۔ سرکپ کے محل میں بے شمار کمرے ہیں یہاں سے قیمتی اشیاء جن میں قیمتی پتھر بھی شامل ہیں دستیاب ہوئی ہیں۔ کمروں کے اندر انسان گندھارا فنِ تعمیر کے نمونوں کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے جن کے ڈیزائن یونانی اور ہندو طرز کے ہیں۔ پانچویں صدی عیسوی کے کچھ مجسمے اور پتھر اور

سنگ مرمر کے برتن آج بھی محفوظ ہیں۔

اسی دور کا تیسرا شہر سرو کا کنشک نے آباد کیا تھا۔ اس کا بہت کم حصہ کھودا گیا ہے لیکن اس سے اس کی چوکور شکل کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس کی خانقاہ میں آواز گونجتی ہے خواہ کتنی دُور سے کوئی آواز دے اس کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔

بازگشت اور عمارات باقی ہیں لیکن ٹیکسلا کی عظمت اسی وقت معدوم ہو گئی جب پانچویں صدی عیسوی میں سفید فام ہُن لوگوں نے اس پر حملہ کیا اور پانچ سو سالہ کشن دور کا خاتمہ کر دیا۔ ٹیکسلا میں کھدے ہوئے کھنڈرات اور خانقاہیں اس کی عظمت اور قوت کا پتہ دیتی ہیں۔ شاید یہ بھی آنے والے وقتوں کے بارے میں فہمائش ہے۔

شاہ بلوط کا مرکز نتھیا گلی

پاکستان کی گلیاں ملکوتی مری سے اوپر ایبٹ آباد سے تقریباً بیس میل کے فاصلہ پر ہیں۔ یہ گلیاں صنوبروں کی سرزمین ہیں جن سے برف کے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کے نیچے بھینی بھینی خوشبو نکلتی ہے جہاں تیز جانفزا، تازہ، معطر اور ٹھنڈی ہوا چلتی ہے اور صنوبر کے درخت ہر موسم میں اپنی خوشبو پھیلاتے ہیں۔

بہت سے لوگ نتھیا گلی نہیں جاتے جو تمام گلیوں سے زیادہ مشہور اور پسندیدہ جگہ ہے۔ قدیم پہاڑی سڑک سے نہ تو راولپنڈی سے اٹھاون میل کا راستہ آسان ہے نہ ایبٹ آباد سے اکیس میل کا راستہ لیکن جو لوگ ماحول، تفریح اور قدرت کے مناظر میں تنوع چاہتے ہیں یہاں پہنچ ہی جاتے ہیں۔ سرسبز زمین اور پتوں سے ڈھکی ہوئی راستہ میں ہر کٹیا شہر سے آنے والے تھکے ہارے مسافروں کا خیر مقدم کرتی ہے۔ یہ گہری شاموں، صحتمند لوگوں، سردیوں میں برف اور گرمیوں میں ٹھنڈی ہوا کا علاقہ ہے۔ صنوبروں کی سرزمین نتھیا گلی میں یکم مئی سے 20 ستمبر تک مسحور کن اور دلکش دنوں اور راتوں کا زمانہ ہے۔ اس سفر کا عوضانہ مادی چیزوں سے نہیں تولا جا سکتا۔ پہاڑوں کی تازہ ہوا شہر کی دلچسپیوں کی عدم موجودگی اور سنتریوں کی مانند لمبے درختوں کی خاموش عظمت تمام چیزوں سے فرار کا جذبہ پیدا کرتی ہیں جس سے روحانی مسرت میں اضافہ ہوتا ہے۔

یکا یک یوں محسوس ہوتا ہے گویا ہم نے دوبارہ جنم لیا ہو۔ معمر، لیکن نوزائیدہ بچوں کی طرح بیماریوں سے پاک لوگوں میں نئی قسم کی توانائی لیے ہوئے...... پھر ہم خود سے پوچھتے ہیں وہ کونسی چیز ہے جو ایسے محسوسات کی جگہ لے سکے...... کونسی چیز! ہم پوچھتے ہیں جبکہ چاروں طرف سے فطرت

کی رعنائیاں ہمیں ایسے سکون میں لپیٹے ہوں جو قلبی اطمینان کا اور بھی ارفع ہوتا ہے۔ ساری گلیوں میں ایسا ہی ماحول ہوتا ہے جہاں ریڈیو کے علاوہ انسان کا بنایا ہوا کوئی ذریعہ تفریح نہیں۔ سوائے ان الاؤں کے جو شام کو غروب آفتاب کے وقت سردی سے بچاؤ کے لیے جلائے جاتے ہیں لیکن اس وقت تک روشن نہیں کیے جاتے جب تک تیسرے پہر کے سورج کی آخری کرن تک رخصت نہیں ہو جاتی۔

نتھیا گلی میں غروب آفتاب کا منظر دیکھنے والے کو مبہوت کر دیتا ہے۔ اگست میں سورج دیر سے غروب ہوتا ہے۔ مجھے آج بھی اونچی پہاڑیوں پر اپنے ہوٹل سے ایک راستہ پر چلنا یاد ہے جو یوں محسوس ہوتا تھا گویا سیدھا آسمان کی طرف جاتا ہے۔

"وہ دیکھیے" میرے ساتھی نے کہا، "سورج کو دیکھیے ...... دن کے اس وقت بھی یہ آگ کا گولا نظر آتا ہے" میں نے اس طرف دیکھا...... اور گلیوں نے مجھے ہمیشہ کے لیے اپنا مطیع کر لیا۔ صنوبر کے لمبے درخت شان سے دمک رہے تھے اور وادیاں چھاؤں اور روشنی سے بنائی ہوئی تھیں۔

میں دنگ رہ گئی۔ یہ موسم گرما کی شام میں فطرت کی آتشبازی تھی۔ یہ قوس قزح کے تمام رنگوں کا مرقع تھا جو نہایت لطیف انداز میں مدغم تھے اور ایک آرٹسٹ کو وجد میں لا سکتے تھے ایک ایسے شخص کو جو جمالیاتی ذوق سے بے حس ہو تصویر کشی پر مجبور کر سکتے تھے۔ ساڑھے سات بجے آگ کا گولہ پہاڑوں کے پیچھے سے بلند ہوا۔ اس کی چمک اتنی تھی کہ میں اور میرا ساتھی دم بخود رہ گئے اور خاموشی نے ہماری خوشی پر مہر لگا دی۔

مجھے یاد ہے کہ کسی نے کہا تھا کہ گرم خطوں میں سورج مدھم پڑ جاتا ہے۔ شاید دنیا کے دوسرے حصوں کے بارے میں یہ درست ہو لیکن نتھیا گلی اور پاکستان میں نہیں۔ سورج آگ کی طرح دہکتا ہے اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ اگست کے آخری دنوں میں میں روزانہ شام کو یہ منظر دیکھا کرتی تھی اور اس کا سحر مجھے آج بھی مسحور کرتا ہے۔

آٹھ ہزار دو سو فٹ کی بلندی پر واقع نتھیا گلی پاکستان کے تمام پہاڑی مقامات میں سب سے خوبصورت خیال کیا جاتا ہے۔ یہاں سے کوہستان اور کشمیر کی برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کا حیران کن منظر بھی دکھائی دیتا ہے۔

نو ہزار سات سو ترانوے (9793) فٹ کی بلندی پر میرا جانی کی سنگلاخ سبز ڈھلانیں پلیٹ

فارم کا کام دیتی ہیں جہاں سے صبح کی دھند چھٹنے کے بعد ایبٹ آباد اور ننگا پربت نظر آتے ہیں۔ یہاں سے موشی پوری اور لالہ زار جہاں بڑا خوبصورت باغ ہے بھی جا سکتے ہیں۔ ڈونگا گلی میں جس کا پیدل راستہ ہے تالاب ہیں۔ سترہ قدرتی چشمے ہیں جن کا پانی اکٹھا کر کے مری کو مہیا کیا جاتا ہے۔

دنیا کی سادہ ترین مسرت نتھیا گلی میں پیدل چلنا ہے۔ پاکستان کے معزز لوگ یہاں ہر سال آتے ہیں۔ نتھیا گلی گرمیوں میں مغربی پاکستان کے گورنر کا صدر مقام ہونے کی وجہ سے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ پہلے اس کی حیثیت گرمیوں میں صدر کی سرکاری رہائش گاہ کی تھی۔ آج کل صدر اپنے گرمیوں کے کیمپ مری سے کبھی کبھار یہاں چلے آتے ہیں۔

یہاں کی صحت افزا آب و ہوا اور خنکی جب کہ کراچی اور لاہور گرمی سے بھاڑ کی طرح جھلس رہے ہوتے ہیں، ان لوگوں کو کھینچ لاتی ہے جو گلیوں کی سادہ زندگی میں مطمئن رہتے ہیں۔ نجی مکانات کے علاوہ یہاں دو ہوٹل ہیں۔ ایک پرانے طرز کا گرینز ہوٹل ہے جہاں قیام و طعام کا کرایہ پندرہ روپے یومیہ سے شروع ہوتا ہے۔ دوسرا پائینز ہوٹل (Pines Hotal) ہے۔ جو بہت مشہور ہے اور نتھیا گلی کا قدیم ترین ہوٹل ہے۔ حال ہی میں اس کی مویشی خانہ نما (Ranch) ہیئت کو نئی تزئین سے دوبالا کیا گیا اور تمام جدید اور ضروری سہولتیں مہیا کی گئیں۔ آپ کار جیپ یا بس: آمدورفت کے تمام ذرائع اس کے دروازے تک آتے ہیں کسی بھی ذریعہ سے تھکے ماندے گرد میں اٹے اور بھوک سے بے حال پہنچیں پائینز میں آپ کا استقبال یوں ہوتا ہے گویا آپ اپنے گھر آئے ہیں...... گرم پانی کے غسل سے پہلے گرم چائے پیش کی جاتی ہے اگر رات ہو تو آگ جلا دی جاتی ہے کیونکہ اس وقت کافی ٹھنڈ ہو جاتی ہے۔ پھر رات کو اچھے ہم جولیوں کے ساتھ عمدہ کھانا کھاتے ہیں آپ کو تعجب ہوتا ہے کہ ہم پہلے پائنز کیوں نہ آئے۔ ان تمام آسائشوں کا عوضانہ ایک آدمی کے لیے اٹھائیس روپیہ روزانہ ہے۔ مالکان یہ کس طرح کرتے ہیں اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اتنے مناسب خرچ پر تمام آسائشیں مہیا کرنے کے لیے یقیناً ان میں علاقہ کی محبت اور گہرا اُنس ہوگا۔

ہاں نتھیا گلی میں کبھی کبھی بارش بھی ہوتی ہے۔ مدھم مدھم بارش ہوتی ہے لیکن ہوٹل کی لائبریری میں اندرون خانہ کھیل (Indoor Games) اور دوسری دلچسپیاں سیاحوں کو مطمئن رکھتی

ہیں۔ بارش رکنے پر گرم سنہری دھوپ ہر شے پر پھیل جاتی ہے اور نتھیا گلی میں موجودگی کی خوشی از سر نو جنم لیتی ہے۔

یہاں ہوائی ڈاک، ٹیلی فون اور تار کی سہولتیں حاصل ہیں لہٰذا اگر کوئی مصروف سیاح باہر کی دنیا سے رابطہ قائم کرنا چاہے تو خود کو کٹا ہوا محسوس نہیں کرتا۔ یہاں ٹینس اور دوسرے کھیل مقبول ہیں۔ دوسری دلچسپیاں لمبی سیر اور اجنبیوں سے ملاقاتیں ہیں جو ہوٹل کی میزوں پر دوست بن جاتے ہیں۔ بعض اوقات بش شرٹوں میں ملبوس تندو تیز مزاج تجارتی لوگوں سے بھی ملنا ہو جاتا ہے۔ یہاں انوکھے طرز کی مسجدیں اور ایک پرانا اور خوبصورت گرجا بھی موجود ہے...... یہ تمام روحانی اور مادی آرام ہر اس شخص کے لیے ہے جو وہ خوبصورت نتھیا گلی میں چاہتا ہے۔

نتھیا گلی میں پہاڑی راستہ پر چلنا جو سر سبز قد آور صنوبر کے درختوں سے گھرا ہوا ہے اور جہاں سڑک قوس قزح کے رنگوں والے پھولوں کی شاخوں سے ڈھکی ہے، ہر اٹھنے والے قدم کے ساتھ ایک مہم بن جاتا ہے۔

کہسارِ دلفزا مری

مری جو پاکستان کے اہم پہاڑی مقامات میں سے ایک ہے، قراقرم کی فلک بوس چوٹیوں کے دامن میں واقع ہے۔ اس کی پہاڑیاں نیچی اور چڑھنے میں آسان ہیں۔ نیم خوابیدہ یا جاگنے کی حالت میں ان پہاڑیوں پر آرام کرنا ایک انمول تجربہ ہے۔ اوپر نیلا چمکدار آسمان ہے کبھی کبھار ریشم کی طرح مہین بادل اڑتے چلے آتے ہیں۔ زمین پر چھوٹے چھوٹے پھولوں کا فرش بچھا ہے جن کی خوشبو فضا کو معطر کرتی ہے اور روزمرہ کی پریشانیاں دھو ڈالتی ہے۔

یہاں چنار اور شاہ بلوط کے درخت بے شمار ہیں۔ چڑیوں کے نغموں کی آواز ندیوں کی لہروں کے مدھم شور میں مدغم ہو جاتی ہے۔ فضا میں نیا پن اور تازگی ہے جو سیاحوں میں جوش پیدا کر دیتی ہے اور انہیں یوں محسوس ہوتا ہے گویا نئی قوت کے ساتھ انہوں نے دوبارہ جنم لیا ہو۔ خواہ آپ شہر کی زندگی یا سفر سے کتنے ہی تھک گئے ہوں دلپذیر مری میں چند ہی دن زندگی کے متعلق آپ کا سارا نظریہ بدل ڈالیں گے۔ رگ رگ میں خوشی کی لہر دوڑ جائے گی۔ گھنے جنگلات سے گھرا ہوا وادیٔ کشمیر سے اوپر مری ایک خاص انفرادیت کا حامل ہے یہاں شاعر اور آرٹسٹ شعر موزوں کرنے گانوں کی طرزیں تیار کرنے، قدرتی مناظر' تہذیب اور سادگی کی جو مری کا خاصہ ہے، تصویر کشی کرنے آتے ہیں اور وجدان پاتے ہیں۔ اس کے دروازے ایک ایسے شہر پر کھلتے ہیں جہاں طرز زندگی دیہاتی ہے اور جہاں اطمینان ہی اطمینان ہے۔ ہر سال اپریل میں جب کراچی اور لاہور میں گرمی زور پکڑنے لگتی ہے تو مری میں زندگی کا دھارا پورے شباب پر آتا ہے۔ ان تپتے ہوئے شہروں سے آرام کی خاطر لوگ یہاں کھنچے چلے آتے ہیں۔ آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع مری

میں صنوبر کے درختوں سے ڈھکے ہوئے کشمیر پوائنٹ سے لے کر پانچ ہزار فٹ پر سنی بنک تک ٹھنڈی فضا ہے اور تیز بھینی بھینی اور تازہ ہوا چلتی ہے۔

دسمبر، جنوری اور فروری کے سرد مہینوں میں جب یہاں برفباری ہوتی ہے، جانفزا ہوائیں چلتی ہیں اور انسان کو باہر نکلنے پر اکساتی ہیں۔

سال کے باقی حصے میں مری ازلی بہار کی سرزمین بنی رہتی ہے جہاں گلاب کے پھولوں کے ساتھ ساتھ خودرو ڈیزی اور دوسرے طرح طرح کے پھولوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ سنبل، شاہ بلوط اور چیری کے درخت اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں اور درختوں میں گھونسلہ بناتے ہوئے کوئل کے کوکنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اگر آپ کو یہ نہ معلوم ہو کہ درحقیقت آپ مری میں ہیں تو یوں محسوس ہوگا گویا انگلستان کے کسی خوبصورت باغ میں کھڑے ہیں۔ ڈھلوان سڑکیں اور ان کے گرد پتھر کے فٹ پاتھ انگلستان کے دیہاتوں سے مشابہ ہیں۔

مری میں ہر طرح کے واقعات رونما ہو سکتے ہیں۔ اس کی فضا میں رومان بسا ہوا ہے ہوا میں آشنائی کی مہک پھیلی ہوئی ہے اور کیوپڈ کا یہاں سارے سال بسیرا رہتا ہے۔ چھٹیاں گزارنے کے اس خوش باش مقام کو آنے والی سڑکیں زمین اور آسمان دونوں سے ہمکنار ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ غیر شادی شدہ لڑکے اور لڑکیاں اس کے سحر کو محسوس کرتے ہیں۔ مری میں محبت میں گرفتار ہونا نہایت آسان ہے۔

ذرائع آمدورفت اتنے ہی متنوع ہیں جتنی خود مری کی خوشنمایاں اور سیاح اپنے بجٹ کے مطابق کم یا زیادہ خرچ کر سکتے ہیں۔ نزدیک ترین ریلوے سٹیشن راولپنڈی ہے جو چھتیس میل نیچے مغربی پاکستان کی شاہراہ پر جو کراچی سے پشاور تک جاتی ہے واقع ہے۔ پنڈی کراچی سے آٹھ سو چھتیس میل لاہور سے ایک سو کی اور پشاور سے ایک سو میل ہے۔ بسیں اور ایکسپریس ٹرینیں تیز رفتار ور قابل اعتماد ہیں۔ سیزن کے زمانہ میں پنڈی سے ہر آدھے گھنٹے کے بعد ٹیکسیاں اور بسیں چلتی ہیں جو دو گھنٹے کے اندر مری پہنچا دیتی ہیں۔

پنڈی سے مری تک بس کا سفر دنیا کے دلچسپ ترین سفروں میں سے ہے یہ بسیں مقامی لوگوں اور سیاحوں سے بھری رہتی ہیں جو راستے میں دوست بن جاتے ہیں۔ مری آنے کے لیے عمدہ ترین ذریعہ پی آئی اے کے ہوائی جہاز سے پنڈی پہنچنا ہے جو کراچی سے صبح ناشتے کے وقت روانہ ہوتا ہے اور دوپہر کے کھانے کے وقت پنڈی پہنچ جاتا ہے۔ بل کھاتے ہوئے پہاڑوں کا آخری حصہ ایک خوشنما منظر پیش کرتا ہے جو میکسیکو کی خوبصورت شاہراہ اکاپلکو کی یاد دلاتا ہے۔ سبز وردی میں ملبوس سنتریوں کی طرح درختوں سے ڈھکی ہوئی بے شمار گھاٹیاں ہیں۔ مری سے سات میل پہلے سواریاں رک جاتی ہیں، لوگ اتر پڑتے ہیں اور پہاڑ کے نیچے سے نکلنے والے قدرتی چشمے کا ٹھنڈا اور بلور کی طرح شفاف پانی پی کر لطف اٹھاتے ہیں یہاں کے مناظر کی خوبصورتی، پرندوں کے نغمے، ہر وقت کھلی ہوئی دھوپ اور ہوا کی تازگی پانی کو آب حیات کی طرح بنا دیتی ہیں۔

مری میں پچاس ہزار لوگ آباد ہیں اور ان میں سے بیشتر مال پر مل جاتے ہیں مری کی مال تمام متوقع اور غیر متوقع لوگوں سے ملنے کی جگہ ہے۔ خواتین دن میں کئی بار اپنی ہم جولیاں بدلتی ہیں اور دوبارہ باہر نکل آتی ہیں۔ اوپر کی چوٹی سے سنی بنک تک تین میل لمبی سڑک پر سیر ایک فیشن کی نمائش کی حیثیت رکھتی ہے۔ بڑے ڈاکخانہ سے (جسے غیر سرکاری مرکزِ اطلاعات کی حیثیت حاصل ہے) مال کے خاتم تک پاؤ میل کے ٹکڑے میں ہجوم کا اژدہام رہتا ہے، تحفے تحائف کی دکانیں سیاحوں سے بھری رہتی ہیں اور دو مشہور چائے خانوں سمیرا اور لنٹوٹس میں مقامی لوگوں، سیاحوں اور ماہ عسل منانے والوں سے بھرے رہتے ہیں جو یہاں کھانے کی چیزوں کا لطف اٹھاتے ہیں اور بھولے بھالے انداز میں خوش گپیاں کرتے رہتے ہیں۔ بہت سے شادی شدہ جوڑے جو یہاں پہلی بار ایک دوسرے سے ملے تھے۔ ہمیشہ آتے ہیں..... اور اگر آپ کسی ایسے شخص سے ملنا چاہتے ہیں جس کی یاد ڈاکخانہ بھی نہ دلا سکے تو ان چائے خانوں کے بیرے آپ کو بتا دیتے ہیں کہ وہ کہاں ہیں، کیسے ہیں اور کس حال میں ہیں۔ گو یہاں کھانے کی چیزیں ملتی ہیں لیکن ماحول میں خوش گپیوں کی وجہ سے تو پھیکا بھی لگتا ہے۔ نیا منظر نیو پارک کے پلازہ میں اتوار کی شام کو ہوتا ہے لیکن یہ مری میں پسند کی بات ہے۔

بڑے ہوٹلوں میں محفل کا وقت تقریباً ایک سا ہے سیسل میں جو نئی دہلی کے اوبیرائے کی ملکیت ہے، پاکستانی خواتین رسمی لباس جس میں روایتی لہراتی شلوار اور قمیض رنگ برنگی ریشمی ساڑھیاں اور غرارہ شامل ہیں پہن کر آتی ہیں۔ بیرونی ممالک سے آئی ہوئی عورتیں یورپی لباس پہنتی ہیں اور تمام مرد خواہ وہ پاکستانی ہوں یا سیاح سفید ڈنر جیکٹ اور کالے پتلون پہنتے ہیں۔

امریکی لب ولہجہ نمایاں طور پر برطانوی لہجہ میں مدغم ہوتے ہیں۔دوسرے عمدہ ہوٹلوں برائٹ لینڈ اور لوک ووڈ میں بھی یہی ہنگامہ رہتا ہے لیکن وہ لوگ جو سادہ لیکن آرام دہ مقامات مثلاً برنز (Byrns) مسز ڈیویز، کیز اور میٹروپول میں رہتے ہیں عموماً نیلی جینز استعمال کرتے ہیں۔

مری میں تعلیمی ترقی کے بھی بہت سے مواقع ہیں۔یہاں کی سالانہ ثقافتی محفل میں جو اگست کے دوسرے ہفتہ میں ہوتی ہے مشہور شعراء' مصنف اور آرٹسٹ شرکت کرتے ہیں۔پروگرام کے موسیقی کے حصہ میں گلوکاروں کو بھی اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقع ملتا ہے۔یہاں میلے کی سی کیفیت رہتی ہے اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی لگن عموماً بہت سے حصہ لینے والوں کے لیے شاندار مستقبل کی راہیں کھول دیتی ہے۔

پُرفضا مقام ہونے کی وجہ سے مری کے گردونواح میں بہت سے سکول ہیں۔سارے پاکستان سے مسلمان اور عیسائی بچے یہاں آ کر جیزس اینڈ میری کانونٹ میں داخلہ لیتے ہیں۔گھوڑا گلی میں لارنس کالج اپنی تعلیمی روایات کے لیے مشہور ہے۔دوسرے اداروں میں سروے ہیڈ کوارٹرز، آرمی ٹریننگ سکول، سگنل سکول اور بیجوں کی پیداوار کا سینٹر شامل ہیں۔ملٹری ڈیری فارم جراثیم سے پاک دودھ مہیا کرتا ہے اور پینے کا پانی ہمیشہ صاف ملتا ہے۔عمدہ جدید ہسپتال اور لائیڈز بنک کی شاخ شہری ضرورتوں کو مکمل کرتے ہیں۔نوجوانوں کے لیے ہوسٹل ہیں۔غرضیکہ مری میں ہر طبقہ کی ضروریات کا انتظام ہے۔

عبوری دارالخلافہ راولپنڈی نزدیک ہونے کی وجہ سے مری میں بے شمار سفارت خانے ہیں جہاں سفراء گرمیوں میں آ کر رہتے ہیں یہ کونسلٹ کی خدمات سرانجام دیتے ہیں لہٰذا اگر آپ چھٹی پر بھی ہوں تو یہاں سے دور دراز ممالک کے لیے ویزا حاصل کرنا آسان ہے۔

مری میں پیدل چلنا دلچسپ مشغلہ ہے۔آپ مال سے کشمیر پوائنٹ تک ایک لمبی سیر کر سکتے ہیں۔لارنس کالج کے نزدیک ایک پرانے محل کے کھنڈرات ہیں۔جہاں آج کل سکاؤٹوں کے لیے کیمپ بنا ہوا ہے۔سیاح پوسٹ آفس روڈ پر چھانگلا گلی کی طرف جاتے ہوئے لطف محسوس کرتے ہیں۔یہاں چنار کے اونچے اونچے درخت ہیں اور سڑک خوبصورت نمبل وادی کو جاتی ہے۔چھانگلا گلی کے چھوٹے سے بازار میں پھلوں کی دوکانیں اور چائے خانے ہیں اور تھوڑی دیر رک کر کچھ کھانے پینے کے لیے اچھی جگہ ہے۔یہاں سے پتھریلی سڑک کے راستے گاف کلب ہوکر جایا جاسکتا ہے۔اس کی ڈھلوان پر بنے ہوئے مکانات بالکل کشمیر کے مکانوں کی طرح ہیں۔اس سے نیچے اتر کر سرسبز جنگل ہیں جہاں پرندوں کے نغموں اور ندیوں کے بہنے کی آواز کے علاوہ خاموشی چھائی رہتی ہے۔

مری 1849ء سے جب انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کیا، مشہور ہل سٹیشن کی حیثیت رکھتا ہے۔انگریزوں کے جنرل کمانڈنگ آفیسر نے مری میں اپنا مکان بنایا اور فوج کے یونٹوں نے اپر اور لوئر ٹوپہ کے علاقوں کو ترقی دی۔گرمیوں میں برطانوی فوجیں یہیں رہتی تھی۔آزادی کے بعد مری کی شہرت اور بڑھ گئی اور اب یہ پاکستان کا سب سے بڑا اور عمدہ ہل سٹیشن ہے۔

مری دھوئیں سے پاک ہے یہاں نہ صنعتی کارخانے ہیں اور نہ شہری زندگی رائج کرنے کا کوئی منصوبہ۔اس کی شاہراہوں پر کاروں کی ممانعت ہے۔روزانہ شام کو پانچ بجے سے سات بجے تک سوائے رکشوں کے دوسرا ٹریفک بند رہتا ہے۔رکشوں کو چار آدمی آج بھی اسی طرح کھینچتے ہیں جیسے سو سال پہلے۔پالکی کی طرح دو آدمی آگے ہوتے ہیں اور دو پیچھے۔سڑکوں پر ٹریفک بند رہتا ہے تاکہ لوگ مزے مزے ٹہل سکیں۔رکشوں کی سست رفتار بالکل مری کے دنوں کی طرح ہے۔کسی کو جلدی نہیں ہوتی، کوئی بھاگتا دوڑتا نظر نہیں آتا۔یہاں تو وقت ہنسنے ہنسانے، آرام اور کھیل کے لیے ہے۔ہمالیہ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کے بالمقابل مری کو مغربی پاکستان میں چھٹیوں کے مقامات کی ملکہ کی حیثیت حاصل ہے۔یہاں زندگی میں نئی لہر دوڑ جاتی ہے۔یہاں کا پرسکون ماحول نزدیکی دارالخلافہ سے بہت مختلف ہے۔مری میں سردیوں کے کھیلوں میں "اس کی انگ" اور سکیٹنگ شامل ہیں۔مری سے صرف چودہ میل دور سطح سمندر سے آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر سلسلہ ہمالیہ کے ساتھ ایوبیہ میں رہائشی مکانات کی تعمیر جاری ہے۔ایوبیہ کو ایک عمدہ سڑک جاتی ہے اور سیاح مستقبل کی خوبصورتی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔دو ہزار سات سو پچاس مربع فٹ کے دو علاقوں کو تفریحی مقام کی حیثیت سے مزید ترقی کے لیے چنا گیا ہے اور بجلی، پانی اور ٹیلی فون کی سہولتیں مہیا کردی گئی ہیں۔

ایوبیہ کو مشرق کا سوئٹزر لینڈ بنانے کے منصوبے زیر عمل ہیں۔اس کے علاوہ ڈھلانوں پر مبتدی اور ماہر اس کی انگ کرنے والے لطف اٹھا سکیں گے۔آٹھ سو فٹ کی بلندی پر پلیٹو پر سیاحوں کو لے جانے کے لیے نئی چیئر لفٹ (Chair Lift) استعمال کی جائے گی۔یہاں دم بخود

کرنے والے خوبصورت ماحول میں ''اسی کی انگ'' سیکھنے والوں کو تربیت دی جائے گی نیچے بنیادی سٹیشن (Base Station) جانے سے پہلے ''اسکی انگ'' کے ماہر اور دوسرے شوقین لوگ بھی یہاں رک کر لطف اٹھا سکیں گے۔ ماہرین تین ہزار فٹ سے زیادہ لمبا راستہ طے کریں گے اور دوسرے لوگ آرام دہ لفٹ کے ذریعے نیچے اتریں گے اس علاقہ میں مبتدیوں کے لیے تین ڈھلانیں اور بھی ہیں جن کی لمبائی تقریباً ایک ہزار دو سو فٹ ہے۔

گرمیوں میں سیاحوں کے لیے ایوبیہ میں بہت سی دلچسپیاں ہیں۔ پیدل چلنے والوں، کوہ پیاؤں اور سیر کرنے والوں کی ضروریات کے لیے ریسٹ ہاؤس موجود ہیں۔ مری آنے والے سیاحوں کے لیے ایوبیہ ایک انعام کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا مستقبل بہت درخشاں اور امید افزا ہے۔ سیاح اس شہر میں آگ کے گرد بیٹھ کر محظوظ ہوں گے اور پاکستان کے نئے دریافت شدہ الپائن کی ڈھلوانوں کا لطف اٹھائیں گے جن پر ہر وقت دھوپ چھائی رہتی ہے اور جو دو میل تک آسمان میں اُٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔

کاغان میں چھٹی

اگر آپ افسانوں، محیر العقل کہانیوں اور قدیم مضافات میں مناظر کا لطف اٹھانے میں یقین رکھتے ہیں...... تو وادی کاغان آپ کو خوش آمدید کہتی ہے پاکستان میں اپنی سیاحت کے دوران، مرمر کے اونچے طویل وعریض کمروں کے مقابلہ میں جہاں خدام اور بیش قیمت اشیاء کے درمیان میں نے اکثر شب و روز گزارے ایک دن میں آخر کار وادی کاغان پہنچی جہاں نہ خدام تھے اور نہ بیش قیمت سامان۔

کسی زمانہ میں صرف باہمت سیاح ہی وادی کا سفر اختیار کرتے تھے لیکن اب پاکستانی خاندانوں، طلباء اور زندگی کے ہر شعبے میں تعلق رکھنے والوں کے لیے یہ ایک ایسی پرسکون جگہ ہے جہاں ہر ذوق کی تسکین کا سامان مہیا ہے مچھلی پکڑنے، شکار، کوہ پیائی اور پیدل چلنے کے بیشمار مواقع ہیں۔ وادی کا وسیع دامن اونچا اٹھتا چلا گیا ہے، پہاڑوں کی چوٹیوں پر جنگلات ہیں جہاں گھوڑے فاختاؤں کی طرح اڑتے چلتے ہیں اور بچے سڑک پر پڑے ہوئے اخروٹ اکٹھے کرتے ہیں۔ جدید دنیا کی شان وشوکت اور آرام یہاں ناپید ہے ٹیلیفون بہت کم ہیں، سینما کا تو ذکر ہی کیا۔ البتہ گھوڑوں، بیلوں، اونٹوں اور مچھلیوں کی بہتات ہے، اور پرانے دور کی یاد دلانے والے لوگ ان رستوں پر چلتے ہیں جہاں کبھی سکندر اعظم چلا تھا۔

یہاں پہنچتے ہی بیسویں صدی کی گھٹن کافور ہو جاتی ہے اور شاید آپ بھی اس کی سنگلاخ پہاڑیوں اور مقامی باشندوں کے طرز زندگی کو دیکھ کر اتنے ہی محظوظ ہوں گے جتنا لطف میں نے اٹھایا۔ طبیعت کی سستی بالکل دور ہو جاتی ہے اور اس کی گھاٹیوں کو دیکھتے ہوئے گرد و نواح کی

خوبصورتی دل میں گھر کر لیتی ہے۔ میں نے کاغان کے بل کھاتے ہوئے دریائے کنہار کے چھوٹے چھوٹے ندی نالوں میں مچھلی کو اچھل کر شکاری کی بنسی سے پھنستے ہوئے بھی دیکھا۔ میں اطمینان اور سکون سے معمور تھی دور دور پھیلی ہوئی قدرتی خوبصورتی میری امید سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی اور ہوا ٹھنڈی اور نئی روح پھونکنے والی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ساری وادی باتیں کر رہی ہو اور پتوں کی سرسراہٹ خاموشی میں مدھم آواز کی طرح لگتی تھی۔ سنگلاخ لیکن عظیم الشان وادی کاغان، جو کسی زمانے میں دور دراز سمجھی جاتی تھی اور وہاں تک پہنچنے کا راستہ صرف جانوروں کے قافلوں کے ذریعے طے کیا جا سکتا تھا اب وہاں نہایت آسانی سے جیپ کے ذریعے بھی پہنچا جا سکتا ہے۔ جیپ بالاکوٹ سے چلتی ہے جہاں سے ناران کو سیدھا راستہ جاتا ہے۔ بالاکوٹ ضلع ہزارہ میں ہے اور چھوٹے سے خوبصورت گاؤں مانسہرہ اور ایبٹ آباد کے راستہ یہاں پہنچ سکتے ہیں۔

کراچی سے مرکزی مقام راولپنڈی تک ہوائی جہاز کے ذریعے تین گھنٹہ یا ریل کے ذریعے رات بھر کا خوشگوار سفر ہے۔ یہاں سے خوشحال اور چھوٹے سے شہر ایبٹ آباد جانے کے لیے یہ سیاح کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اس تہتر میل عمدہ شاہراہ کو طے کرنے کے لیے کونسی سواری پسند کرتا ہے۔ ایبٹ آباد خوبصورت مقام ہے اور اس کی تاریخی اہمیت کی وجہ سے یہاں رکنا یقیناً سودمند ہے کاکول پاکستان کا مغربی کونہ، ایبٹ آباد سے پانچ میل کے فاصلہ پر ہے جہاں ملٹری اکادمی میں زندگی کے ہر شعبے کے لوگوں کو فوج میں داخل ہونے کے برابر مواقع حاصل ہیں اس علاقہ کا موسم سارا سال معتدل رہتا ہے۔ یہاں پیلس ہوٹل بہت عمدہ ہے اور یومیہ کرایہ صرف بیس روپے ہے ایبٹ آباد میں بھی بہت سے ہوٹل ہیں جنھیں گھریلو طرز پر چلایا جاتا ہے ان میں کرایہ بھی نسبتاً کم ہے۔ پنڈی، ہزارہ ٹرانسپورٹ کمپنی کی بہترین اسٹیشن ویگنیں فی سواری پانچ روپے لیتی ہیں اور ان کی پانچوں سیٹیں مخصوص ہوتی ہیں مسافروں سے لدی پھندی بس کا کرایہ ڈھائی روپیہ ہے یا آپ تیس روپے میں نجی کار بھی لے سکتے ہیں جو راستہ میں خوبصورت اور تاریخی مقام ٹیکسلا بھی ٹھہرتی ہے۔ ٹیکسلا راولپنڈی سے پندرہ میل کے فاصلہ پر ہے۔

کاغان جانے کے لیے جیپ اور ٹھہرنے کے تمام انتظامات پہلے سے ہی ایبٹ آباد میں ٹورسٹ بیورو کی مدد سے کیے جا سکتے ہیں۔ جہاں ریسٹ ہاؤس اور ڈاک بنگلے میں رہائش کے لیے

پاس ملتے ہیں۔ وادی کاغان میں ہوٹل نہیں ہیں لیکن حکومت کی بنائی ہوئی یہ رہائش گاہیں صاف شفاف ہیں اور شام کو جب ٹھنڈ ہو جاتی ہے تو ان کے آتش دانوں میں صنوبر کی تیز خوشبو والی لکڑی جلائی جاتی ہے۔ ایک رات کا کرایہ تین سے پانچ روپے تک ہے اور بنگلوں میں فلش لگا ہوا ہے۔

مفصل معلومات بالاکوٹ پہنچ کر حاصل ہوتی ہیں جہاں سیاح یوں محسوس کرتا ہے جیسے وہ ہزارہ کے کسی خاندان کا ایک فرد ہو، کیونکہ یہاں کے سٹیشن ماسٹر عبدالرحمٰن پدرانہ شفقت سے سب کے آرام کا خیال رکھتے ہیں ان کا جیپوں کا قافلہ، جو صوبائی ٹرانسپورٹ سروس کی ملکیت ہے، مضبوط ''ویلز'' جیپوں پر مشتمل ہے جو خمدار راستوں کے لیے خاص طور پر بنائی گئی ہیں۔ ان کو تربیت یافتہ پہاڑی سڑکوں پر گاڑی چلانے کے ماہر ڈرائیور چلاتے ہیں۔ عبدالرحمان ان مقامات کا پتہ بتاتے ہیں جن کو عام سیاح نظر انداز کر جاتا ہے۔ ان کے مشاہدہ کی وجہ سے وادی کاغان میں قیام انتہائی پر لطف تجربہ بن جاتا ہے اکثر وہ ڈرائیوروں کے ساتھ سڑک پر خود چل پڑتے ہیں اور ان لوگوں میں سے ہیں جو اگر کسی مسافر بچے کو ماں کی گود میں دودھ کے لیے بلکتا دیکھ لیں تو بھینس کا دودھ لانے کے لیے گاڑی میں سے اتر پڑیں گے۔ اپنے صدر مقام پر وہ تعلقات عامہ کے افسر کی طرح معلومات بہم پہنچاتے ہیں بہت سے سیاح بار بار واپس آتے ہیں اور عبدالرحمٰن کے ذاتی تجربہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

کاغان کی عظمت دیکھنے کے لیے پہلا پڑاؤ کوائی ہے جو بالاکوٹ سے پندرہ میل دور ہے۔ کوائی سے شوگران کی خوبصورت مشرقی ڈھلانوں کا آدھ گھنٹہ کا راستہ ہے جہاں اونچے اونچے چیڑ کے درخت بادلوں کو چھوتے نظر آتے ہیں۔ سفید سفید کہران کی ہری بھری شاخوں پر جم جاتی ہے۔ پہاڑیاں نازک جنگلی پھولوں سے بھری ہوئی ہیں۔ گھوڑے گھاس پر کلیلیں کرتے ہیں۔ گویا زندگی کی خوشیوں کا اظہار کر رہے ہیں۔ طالب علم اور نوجوان خوشی اور جوش میں شوگران کے درختوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں پر چڑھ جاتے ہیں شوگران سات ہزار آٹھ سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

پہاڑی پر واقع جھونپڑی نما خوبصورت ریسٹ ہاؤس سیاحوں کو دعوت دیتا ہے جو چند دن نایاب پرسکون ماحول میں گزارنا چاہتے ہیں جہاں جھرنوں کی آواز اور پرندوں کی چہچہاہٹ خاموشی کو توڑتی ہے یہاں سرو کی خوشبو فضا کو معطر کرتی ہے چولہوں سے لکڑی کا دھواں چاندی کی لڑیوں کی طرح لہراتا اٹھتا ہے اور دور دور تک دلفریب منظر پھیلا ہوا ہے۔ مشرق کی طرف سے

چودہ ہزار فٹ بلند مکرہ پہاڑ نظر آتا ہے مغرب میں وادی بالاکوٹ ہے اور کند چوٹی اور داور تپدق سینی ٹوریم نظر آتے ہیں جہاں صاف شفاف فضا میں پھیپھڑوں کی بیماریاں رفع ہو جاتی ہیں شمال میں چودہ ہزار فٹ اونچا پہاڑ موسیٰ کا مصلّٰے نظر آتا ہے جنوب میں ایک سپاہی کی طرح سترہ ہزار فٹ اونچا ملکہ پربت ہے ملکہ پربت کی چوٹی سے کوہ پیاناگا پربت اور آزاد کشمیر کی خوبصورتی کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ محکمہ جنگلات مکرہ تک ایک نئی جیپ کی سڑک بنا رہا ہے جس کے ذریعہ سیاح مشرق میں پہاڑ تک باآسانی پہنچ سکیں گے۔ ایک اور سڑک پارس سے شران تک بنائی جا رہی ہے۔

شوگران کے ایک ہزار باشندے کسان ہیں جن کی رنگت دھوپ میں رہ کر سنہری ہو گئی ہے یہ لوگ پتلے دبلے اور لمبے ہیں اور صحت بخش آب و ہوا میں رہنے کی وجہ سے بالکل کھلاڑیوں کی طرح لگتے ہیں مجھے یقین ہے کہ سیاح ان لوگوں کا جن پر ان کا کوئی حق نہیں، پرتپاک خیر مقدم دیکھ کر مغلوب ہو جائیں گے بچوں کا انداز نہایت دوستانہ ہے اور وہ اجنبیوں کو تحفہ کے طور پر خشک پھل اور مکئی کی روٹی پیش کرتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ آپ وہاں آئے ہیں۔

وادی کاغان کے راستہ پر واپس پہنچ کر کوائی سے پارس چار میل لمبا سفر ہے یہاں ہر شخص کو جنگلے دار دروازے سے گزرنے کے لیے رکنا پڑتا ہے۔ یہ دروازہ صبح کو سوا نو بجے اور پھر شام کو پانچ اور چھ کے درمیان کھلتا ہے۔ اس سے تمام گاڑیاں ایک ایک کر کے گزرتی ہیں تاکہ راستہ بند نہ ہو جائے۔ قدیم امریکی گھوڑا گاڑیوں کے دور کی طرح اونٹ گاڑیاں، بیل گاڑیاں، گھڑ سوار اور پیدل چلنے والے لوگ ایک دوسرے کے پیچھے لائن بنا کر چلتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو آگے بڑھ جاتے ہیں اور کچھ شام ہونے سے پہلے دریا کے کنارے ٹھہر جاتے ہیں۔ کھانا پکانے کے لیے آگ جلائی جاتی ہے اور رات گزارنے کے لیے عورتیں خیمے کھڑے کر لیتی ہیں۔

بہت سے سیاح جو دروازہ کھلنے کے وقت سے پہلے یا بعد میں پہنچتے ہیں۔ انہیں خوش اخلاقی سے گزارنے کی اجازت دے دی جاتی ہے کیونکہ وہ وادی میں اجنبی ہیں۔ یہ نوازش ایک مسلمہ دستور العمل ہے۔

پارس میں چھوٹا سا بازار اور ایک نیا خوبصورت چائے خانہ ہے جو شاہراہ کے کنارے بنا ہے گرد و غبار سے بچنے کے لیے یہ جنت ہے ہم اسے ریسٹورنٹ کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ عام چائے خانوں سے یہ بالکل مختلف ہے۔ بہت سے لوگوں کے لیے اکٹھے چائے پینے کے لیے لمبی لمبی

میزیں اس کی خصوصیت ہیں۔ تمام دن یہاں سیاح اور مقامی لوگ جمع رہتے ہیں اور بھنی ہوئی مکئی کے ساتھ، جو اس علاقے میں پیدا ہوتی ہے، چائے پیتے ہیں۔ تین آنے میں تیز خوشبو والی چائے کی پیالی اور چار آنہ میں مکئی مل جاتی ہے ہر طرف سے انگریزی اور اردو میں ملی جلی باتوں کی آواز آتی ہے۔ کاغان میں چائے خانہ وہاں کے رہنے والوں اور نوواردوں کی ملاقات کا اڈہ ہے۔ یہ سوال ہمیشہ پوچھا جاتا ہے "کیا آپ کو یہ مقام پسند آیا؟" اگر آپ جواب اثبات میں دیں تو لوگوں کے چہرے دمک اٹھتے ہیں۔ چائے خانہ کا مالک بہت سی کارآمد باتیں بتاتا ہے کہ ریچھ کے شکار کے لیے کون سا وقت مناسب رہے گا جو آس پاس کے علاقے میں پائے جاتے ہیں وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ گائیڈ کہاں سے مل سکتے ہیں اور پہاڑیوں کے کون سے حصے تاریک ہیں۔ چائے خانہ کا فرنیچر پارس میں گھریلو صنعتوں کی شاخ نے بڑی عمدگی سے بنایا ہے یہاں کے لوگ بھیڑ کی اون سے کپڑے بناتے ہیں۔ گائے کے چمڑے سے جوتے بناتے ہیں اور کم و بیش ہر معاملہ میں بالکل خود مختار ہیں۔

بارہ میل آگے مہاندری ہے جہاں ایک صاف ستھرا ریسٹ ہاؤس ہے یہاں چوکیدار بھی موجود ہے راستے کے دونوں طرف اونچے اونچے درخت ہیں اور گو جانوروں کے چلنے کی وجہ سے سڑک پر دھول اُڑتی ہے لیکن یہاں سایہ اور ٹھنڈی ہوا ہے مہاندری کے لوگ چمڑے کے خوبصورت جوتے بناتے ہیں جن پر طلے کا کام ہوتا ہے۔ ایک جوڑا آٹھ روپیہ میں مل جاتا ہے۔ کراچی میں یہی جوڑا پچیس روپیہ میں فروخت ہوتا ہے۔ سنار زیورات بناتے ہیں اور چمکدار دھاتوں سے بٹن ڈھالتے ہیں۔ چاندی کی خوبصورت بالیاں صرف تین روپے میں فروخت ہوتی ہیں اور یہاں کے سناروں سے مل کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ مہاندری کے سیب تربوز جتنے بڑے ہوتے ہیں اور ٹماٹر ملائی کا مزہ دیتے ہیں جیسے ان کے اندر دودھ بھرا ہو۔ گاؤں کے آس پاس کا علاقہ پرانی طرز کا ہے۔ وہ مکان پہاڑیوں کے دامن میں پتھروں کے بنے ہیں۔ یہاں کسی کو کسی بات کی جلدی نہیں۔ لوگ اپنا کام نہایت اطمینان سے کرتے ہیں۔ سیاحوں کو دیکھ کر ان کی تعریف کرتے ہیں اور ان کی آمد کو اہم واقعہ سمجھتے ہیں۔

ناران سے تیس میل دور شینو مچھلیوں کی عمدہ پرورش گاہوں کے لیے مشہور ہے سیاح چھوٹی چھوٹی اور بڑی مچھلیوں کو خاص تالابوں میں ساتھ ساتھ تیرتے دیکھ کر بہت محظوظ ہوتے ہیں یہاں مچھلیوں کی نہایت احتیاط سے پرورش کی جاتی ہے تاکہ کاغان کے دریا ہر سال بھرے رہیں۔

معمولی رقم کے عوض تمام مچھیروں کو لائسنس جاری کیے جاتے ہیں۔

نو میل آگے چھوٹا سا شہر کاغان اپنی مثال آپ ہے اس کی پہاڑیوں کے نیچے دریا کنہار بہتا ہے یہاں سیّاح مچھلی پکڑ سکتے ہیں اور شکار کا پورا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ چکور اور ہمالیائی تیتر عام ہیں۔ کالے اور سرخ ریچھ بھی آسانی سے مل جاتے ہیں۔ کاغان کے ریسٹ ہاؤس میں اترنے سے پہلے مہاندری کی طرح یہاں بھی ایک خوبصورت ریسٹ ہاؤس ہے سیّاح اپنے ساتھ یہاں تازہ مچھلیاں اور مرغابیاں لاسکتا ہے۔ اگر کسی کی انگلی میں چوٹ آجائے یا اسپرین کی ضرورت پڑ جائے تو اس کے لیے کاغان میں ایک جدید ہسپتال موجود ہے۔ کاغان جس کے نام پر وادی مشہور ہے انتہائی دلکش مقام ہے جہاں دیدہ زیب مکان، ڈاکخانہ، تار گھر اور دوسری آسائشیں میسر ہیں اس کے مناظر کی خوبصورتی سیّاح کو مسحور کر دیتی ہے ناران کو جانے والی سڑک کا ساڑھے چودہ میل کا راستہ نہایت دلفریب ہے یوں محسوس ہوتا ہے گویا آپ سوئٹزر لینڈ میں ہیں۔ پہاڑیوں میں اونچی نیچی گھاٹیاں ہیں پس منظر میں پرشکوہ پہاڑ ہیں جن کے سلسلہ نے سارے علاقہ کو اپنے حلقہ میں لے رکھا ہے۔ دیہاتی لوگ درختوں اور پھولوں کی طرح ماحول کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ افغانی نسل کے قبائلی ہیں جو ناران میں بس گئے ہیں انہوں نے مقامی عورتوں سے شادی کر لی ہے اور ان کے بڑے بڑے خاندان ہیں یہ سب موسم بہار اور سرما میں اپنے جانوروں کے لیے چارے کی تلاش میں لمبے سفروں پر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ مضبوط اور توانا لوگ وادی کا چپہ چپہ چھان مارتے ہیں جہاں قسمت لے جاتی ہے خیمے لگا لیتے ہیں اور سردی شروع ہونے پر ٹھنڈی جگہوں سے گرم مقام پر منتقل ہو جاتے ہیں اس خوبصورت پس منظر میں ناہموار راستوں پر بوڑھی عورتیں چھڑیوں سے جانوروں کو ہانکتی ہیں بچے ہاتھوں میں چوزے لیے بیلوں پر سوار گھومتے رہتے ہیں یہی چوزے ان کی خوراک کا سامان ہیں تمام جوان عورتیں، بغیر کسی استثناء کے موٹے تازے بچے اٹھائے ہوتی ہیں یا حاملہ ہوتی ہیں۔ مرد سمجھدار تاجروں کی طرح تمام دن گھومتے رہتے ہیں اور شام پڑتے ہی آرام کے لیے ٹھہر جاتے ہیں۔ اپنی منزل مقصود گلگت، تک پہنچنے میں وہ ایک مہینہ لگا دیتے ہیں۔

خالص افغانی قبیلے بھی اس علاقے میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ جو پاوندے کہلاتے ہیں اور ان جنگجوؤں کی پشتوں میں سے ہیں جنھوں نے کابل اور خیبر پاس میں لڑائیوں میں حصہ لیا۔ ان کے

قافلے لمبے چوڑے ہوتے ہیں اور اپنے لباس اور حلیے کی وجہ سے مقامی لوگوں سے بالکل الگ تھلگ لگتے ہیں۔ عورتیں رنگ برنگے بھڑکدار کپڑوں کے اوپر بھاری زیورات پہنتی ہیں مرد چغے پہنتے ہیں اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچے خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں، کوئی نہ کوئی زیور ضرور پہنتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں تجسس کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اور جو کوئی ان کی تعریف کرنے کے لیے رُک جائے اسے لازماً خریدار سمجھتے ہیں چند سکّوں یا چھوٹے موٹے تحفوں (کنگھا، مٹھائی یا رومال وغیرہ) کے عوض تصویریں اتارنے کی اجازت دے دیتے ہیں اگر آپ غور کریں تو یہ اچھا سودا ہے کیونکہ وادیٔ کاغان میں پاوندے سب سے خوبصورت مسافر ہیں۔ رات کو ٹھہرنے کے لیے جگہ نہایت احتیاط سے منتخب کی جاتی ہے اور جس خوبصورت انداز سے یہ لوگ خیمے لگاتے ہیں اس پر کسی بادشاہ کے محل کا گماں ہوتا ہے۔

جانوروں، اونٹوں اور نقدی کی صورت میں کافی دولت کے علاوہ ان کے پاس تجارتی سامان بھی ہوتا ہے جو یہ سفر کے دوران فروخت کرتے ہیں پاوندہ عورتیں اپنی خوبصورتی کے لیے مشہور ہیں اور شادی کے قابل لڑکی کے لیے بہت بڑی رقم طلب کی جاتی ہے پاوندے آپ کو وادی کاغان کے ہر حصے میں ملیں گے یہاں کے بچے شہری بچوں کی نسبت زیادہ خوش قسمت ہیں۔ سڑک کے کنارے وہ فاتحوں کی طرح اونٹ پر سواری کرتے ہیں اور اپنے اردگرد کی دنیا کو دیکھتے جاتے ہیں کیا ہمارے دور کے بچوں کو اس دور دراز اور تاریخی لحاظ سے اہم دنیا کا سفر کرنے کا موقع ملتا ہے؟ بہر حال، اونٹوں کے قافلے روزان پتھریلے اور اکثر خطرناک حد تک تنگ راستوں سے گزرتے ہیں یہ لوگ ہر مہینے بالاکوٹ اور ناران سے گلگت آتے جاتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ برفباری شروع ہو جاتی ہے اس زمانے میں یہ لوگ موسم بہار آنے تک کابل اور خیبر پاس کے دیہاتوں کو واپس لوٹ جاتے ہیں ایک دن میں عموماً یہ لوگ دس سے پندرہ میل تک سفر کرتے ہیں بس وادی کے اندر ناران تک جاتی ہے محکمہ تعمیرات کے ریسٹ ہاؤس میں تقریباً بیس سیّاحوں کے لیے جگہ موجود ہے ناران کاغان سے آدھے راستہ پر ہے تمام جیپ ڈرائیور، تاجر اور قافلے پٹرول لینے سامان اتارنے اور چڑھانے کے لیے رات کو یہاں قیام کرتے ہیں پٹرول کے بڑے بڑے پیپے پہاڑیوں پر سے لڑھکتے ہیں مچھیرے اپنا شکار اٹھائے خوشی خوشی آتے ہیں اور ان سیّاحوں کو جن کے کانٹے سے کوئی مچھلی نہیں لگتی کھانے کی دعوت دیتے ہیں پہاڑوں کی ٹھنڈی رات میں چیڑ کی لکڑی

پر بھنی ہوئی مچھلی سے لذیذ اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟ ناران میں ایک خوبصورت بازار ہے جہاں آنے والے اپنے اونٹوں کے ساتھ اکٹھے ہوتے ہیں۔ بازار کو چھوڑ کر ناران ایک خاموش مقام ہے جو اونچی اونچی چوٹیوں سے گھرا ہوا ہے، جن سے لمبی لمبی سڑکیں چھپ گئی ہیں اس علاقے میں بہت سے ہوسٹل ہیں اور کاغان آنے والے طالب علموں کو ہر طرح کا آرام ملتا ہے علی الصبح ہر شخص شکار اور مچھلیاں پکڑنے کی تیاری کرتا ہے اور سب لالہ زار، بٹر کنڈی اور خوبصورت جھیل سیف الملوک پر اکٹھے ہوتے ہیں...... ہر شخص کا انداز جداگانہ ہوتا ہے سیف الملوک جانے کے لیے صرف ایک نہایت تنگ اور دشوار گزار راستہ ہے، جس پر گھوڑے یا خچر پر یا پیدل سفر کیا جا سکتا ہے۔ اس راستہ پر چلنا گویا تاریخ کے گرد آلود اوراق میں واپس لوٹنا ہے یہاں ثمرقند اور سہارا کے ریگستانوں کی طرح کے میدان ہیں، ہری بھری گھاٹیاں ہیں، جھاڑیوں سے بھری سکاٹ لینڈ کی طرح کی کھائیاں ہیں کونوں میں اُگے ہوئے خوبصورت پھول پتھر اور شگاف ہیں اور جھیل کا کہیں پتہ نہیں چلتا پھر اچانک سراب کی طرح چاندی کی مانند چمکتی جھیل نمودار ہوتی ہے...... شیشے کی رنگ برنگی چادر کی طرح جو ہر وقت رنگ تبدیل کرتی رہتی ہے اور ایک آئینہ کی طرح جس میں آسمان کے تمام رنگ منعکس ہوتے ہیں جھیل میں اُچھلتی ہوئی مچھلیوں اور اردگرد برف پوش پہاڑیوں پر چڑیوں کے اڑنے کا نظارہ مسحور کن ہے اس جنت کی خوبصورتی کو دیکھ کر آپ دم بخود رہ جائیں گے...... اور جب ٹھنڈی ہوا چلتی ہے اور سورج کی کرنیں سیف الملوک کی لہروں سے مل کر اٹھکھیلیاں کرتی ہیں تو دنیا کی تمام چیزیں اوجھل ہو جاتی ہیں۔

جھیل سیف الملوک صدیوں پرانی ہے اس سے بہت سی کہانیاں اور قصے وابستہ ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں جو اس کی گود میں پیدا ہوئے ہیں، آج بھی ایک پُراسرار مشرقی کہانی باقی ہے جو الاؤ کے گرد بیٹھ کر بار بار دہرائی جاتی ہے۔ یہ ایک خوبصورت شہزادے کی کہانی ہے جس نے اپنے والدین کا کہنا نہ مانا اور ممنوعہ راستوں پر ہیولائی انسانوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ وہ جھیل پر آ پہنچا جو پہاڑ کے دامن میں جواہرات کی طرح چمک رہی تھی۔ اسے جھیل پر مرمریں لباس میں ملبوس، رقص کرتی تتلیوں کی طرح اٹھکھیلیاں کرتی پریاں نظر آئیں پھر وہ پانی کے اندر کود یں اور تیر کر نیچے چلی گئیں۔ چٹان کے ہر سوراخ سے پریاں اس طرح نکل پڑیں گویا پتھروں کے اندر چھوٹے چھوٹے بے شمار گھر ہوں۔ شہزادے کی تلاش بے سود نہیں رہی۔ اس نے واپس آ کر سیف الملوک کی پریوں کی کہانی سب کو سنائی۔ انیسویں صدی کے شروع میں اس کہانی کو صوفی شاعر میاں محمد نے نظم اور گیتوں میں ڈھال دیا اور اسے لافانی کر دیا۔ گاؤں کے عمر رسیدہ لوگ آج بھی میاں محمد کے گیت گاتے ہیں۔ جوان عاشق مزاج لوگ، گڈریئے اور کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے کسان یہ گیت گنگناتے ہیں۔ سیاح انہیں سن کر خوش ہوتے ہیں اور رات کو آگ کے گرد بیٹھ کر کہانی ایک بار پھر دہرائی جاتی ہے اور گاؤں کے لوگ ناچتے ہیں اور میاں محمد کے گیت گاتے ہیں۔ احترام اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ سیاح شہزادے کی مہم کو دل میں چھپائے، یہ امید کرتے ہیں کہ شاید واپس لوٹتے ہوئے وہ تتلیوں کی سی پریاں ان کو بھی نظر آ جائیں۔ نہایت افسردگی کے ساتھ اور چار و ناچار وہ یہاں سے روانہ ہوتے ہیں یہ تمنا لیے کاش وہ ہمیشہ کے لیے یہیں رہ جاتے۔

اس سے بھی زیادہ دلچسپ وقت لالہ زار میں گزارا جا سکتا ہے جو ناران سے صرف بارہ میل دور ہے یہاں سورج کی چمک میں گرمی ہے لیکن آس پاس کے علاقہ میں ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔ لالہ زار میں شکیوان، صنوبر اور چیڑ کے جنگلات ہیں۔ جنگلات جیسے جیسے اونچے ہوتے جاتے ہیں آسمان پر لمبے لمبے سائے ابھرنے لگتے ہیں اور جامنی اور ارغوانی جنگلی پھولوں پر سفید دھوئیں کے بادل منڈلاتے ہیں۔ ڈھیروں کی شکل میں زمین پر پڑے ہوئے صنوبر کے پھولوں کی خوشبو فضا کو معطر کرتی ہے اور نظروں سے اوجھل کونوں کھدروں سے نکلتی ہوئی آبشاریں نیچے روپہلی ندیوں میں گر جاتی ہیں۔

چبوترہ پر بنے ہوئے چھوٹے سے ریسٹ ہاؤس میں ایک کشادہ برآمدہ بھی ہے۔

وادی کو لوٹتے ہوئے آپ جرید گاؤں میں ٹھہر سکتے ہیں جہاں کنہار کے کنارے گورنمنٹ اسپنگ ملز حال ہی میں تعمیر ہوا ہے۔ یہ فورڈ فاؤنڈیشن کا منصوبہ ہے جس سے تمام گاؤں والوں کو روزگار مل گیا ہے۔ اس چھوٹے سے قصبے کا مستقبل درخشاں ہو گیا ہے۔ یہاں کھیتوں اور باغوں میں گھرے اونچے اونچے سرخ درخت پہاڑوں پر ہر طرف اُگے ہوئے ہیں۔ ان کے سرخ پھول رنگوں سے بھرے ہوئے ہیں اور کپڑے کے کارخانے میں کام آتے ہیں۔ قدرت اس نئے منصوبہ کو کامیاب بنانے کے لیے فیاضی سے کام لے رہی ہے۔

کاغان کی چوٹی تیرہ ہزار فٹ بلند ہے جہاں گلگت کی سرحد پر بابا زار پاس کے ذریعے پہنچا

جا سکتا ہے۔ دریا کنہار اس کی تنگ گھاٹیوں میں سے بہتا ہے لیکن بابا زار پاس کی خوبصورتی تا نگا پرست کے نظارہ سے دوبالا ہو جاتی ہے جس کی چوٹیاں برف کے سفید لبادے میں چمکتی رہتی ہیں۔ اس کی چمک گڈریوں کی جھونپڑیوں اور سیاحوں کے خیموں پر چھا جاتی ہے اور انہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی غار میں سو رہے ہوں۔ وہ آسمان کی سیاہی اور جھلملاتے ستاروں کو دیکھ سکتے ہیں جو اتنے نزدیک معلوم ہوتے ہیں اور یوں لگتا ہے گویا سیاحوں کو شب بخیر کہہ رہے ہوں۔

میں بسیال میں جھیل لالہ زار کے کنارے کھڑی تھی۔ تیز دھوپ کے باوجود ہوا بے حد ٹھنڈی اور کاٹنے والی تھی۔ پھولوں سے ڈھکی ہوئی جھیل نیلے اور سنہری رنگوں میں جھلمل جھلمل کر رہی تھی گویا آفتاب وقت سے پہلے غروب ہونے کے لیے زمین پر اتر آیا ہو اور پانی پر چمکدار دھاریاں ڈال رہا ہو۔

کاغان! جسے میں نے طوعاً و کرعاً چھوڑا اور جس کی یاد مجھے آج بھی تڑپاتی ہے......ایک خوبصورت وادی جس کے باشندے، گو وہ جدید تہذیب سے بے نیاز ہیں، دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں اپنی لوک کہانیاں سناتے ہیں اور جب ان کے خیموں کے نزدیک اپنے خیمے نصب کریں تو وہ آپ کے انتہائی خوش اخلاق پڑوسی بن جاتے ہیں۔ کاغان ایسی چیزوں سے مالا مال ہے جو آپ کو متاثر کریں گی اور سکون بخشیں گی۔ ایک طرح سے اس گھاٹی قدرتی مناظر اور حسن سے مالا مال اس پہاڑی مقام پر آپ کا قیام اور سیر و سیاحت آپ کے دل کو سکون اور اطمینان کی روشنی سے معمور کر دے گی۔ شہزادہ اور اس کی تلاش جیسے ازسرِنو زندہ ہو جائے گی۔ وادی میں آپ کا آخری دن پہلے دن ہی کی طرح دلکش ہو گا بلکہ خوبصورت مناظر دیکھنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کی وجہ سے اس کی ہمت دوبالا ہو جائے گی۔

کاغان ایک طریقِ زندگی ہے۔ اس کی یاد آپ کے ساتھ زندہ رہے گی...... آپ...... خوش باش سیاح جو یہاں ایک بار پھر لوٹنا چاہیں گے۔

پشاور برصغیر کا دروازہ

پشاور۔ ایک قدیمی صدر مقام، جہاں شباب اور پیری باہم شیر و شکر نظر آتے ہیں جہاں پشتو بولنے والے باریش قبائلی فرزندان کوہستان ان طلبہ کے قابل فخر والدین ہیں جو کیمرج کے اسلوب کی انگریزی بولتے ہیں۔ یہ تعلیم انہوں نے نوعمر، نئی اور تابندہ پشاور یونیورسٹی سے حاصل کی ہے۔ ماہر کاروباریو اور اے سیاحو! جو یہاں ثقافت کی تلاش میں آئے ہو اس کے عشق پیچاں سے سجے طویل و عریض کمروں اور ہالوں میں سے گزرو اس کے لیکچر کمروں سے گزرو اس کے آثارِ قدیمہ کے شعبہ میں جاؤ اس کے فلسفہ، معاشیات اور لسانیات کے شعبوں سے لے کر پٹیریان کی طرز کے کنڈرگارٹن سکولوں سے گزرو تمہیں اس کامیابی اور کارکردگی کو اپنی آنکھوں دیکھ کر ایک عجیب احساس گھیرے گا۔ وہ کامیابی جو یہاں کے طلبہ نے جو اونچے نیچے ہر طرح کے گھرانوں سے آتے ہیں، نوابوں کے بچے مزدوروں کے بچے سب کا ایک ہی نصاب ہے جو ہر ایک کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ یہ یونیورسٹی ایک خواب کی تعبیر ہے۔ آج سے 15 سال پہلے پشاور کے میدانی علاقے کا یہ حصہ ایک بے آباد صحرا تھا۔ آج یہ علم کا گہوارہ ہے جس کو باغات احاطہ کیے ہوئے یں۔ یہ سرحد کی تہذیب و ثقافت کا منارہ ہے جو 250 سرسبز و شاداب ایکڑوں پر پھیلے ہوئے وسیع و عریض پھولوں کا پارک معلوم ہوتا ہے۔ ایک اجنبی کو یہ کتنی گرمجوشی سے خیر مقدم کہتی ہے۔ یہ بانی پاکستان کے خواب کی تعبیر ہے جو ان کے اس دنیا سے انتقال کے بعد ظہور پذیر ہوئی۔ ان کی ایک جیتی جاگتی یادگار، ابدی یادگار جس میں ہزار ہا ہزار طلبہ جوئے رواں کی طرح اس کی دہلیز سے مشاقانہ اور بے تابانہ حصول علم کی طلب میں داخل ہوتے ہیں وہ مسرور ہیں کہ ماضی، حال اور

مستقبل کی حکمت کو حاصل کر رہے ہیں جو ان کے اپنے مستقبل کے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ ان کے اپنے شاندار علاقے میں اپنی کامیابی کے لیے اہم ہے۔ یہ درسگاہ جو والد کی طرح شفیق وائس چانسلر محمد علی کی سرکردگی میں کام کر رہی ہے، جو سب کو ایک خاندان کے افراد سمجھتے ہیں۔ یونیورسٹی کے میدانوں کی دوستانہ فضائیں اور خیبر کے پُرشکوہ پہاڑوں کے سائے میں یہ جوان نسل پھل پھول رہی ہے۔

پشاور کس لیے اہم ہے؟ بہت سی باتیں ہیں۔ پہلی تو یہ حقیقت کہ یہ شمال مغربی سرحد کے ایک شہر کی حیثیت سے مشہور ہے۔ صدیوں سے تاریخ میں اسے ناقابلِ تسخیر پٹھانوں کا قلعہ لکھا جا رہا ہے۔ قدیم زمانے کے کاروانوں کا راستہ اور اب بھی بے شمار صدیاں بیت جانے کے بعد ایک باعزت تجارتی مرکز ہے...... محبت، قہقہے اور تشدد، پشاور کے ماحول میں ہمیشہ اکٹھے رہے ہیں اور عسکری موسیقی اس کی ہر چھت سے سننے میں آتی ہے۔

پشاور ایک ایسی جگہ ہے، جس سے آپ یقیناً لطف اندوز ہوں گے اور ایک سیاح جو کچھ نئی چیزوں کی تلاش میں ہے اس کے لیے یہ پیرایہ آغاز ہے کیونکہ شہر کے اردگرد مشرق کی پُراسرار اور سحر انگیز کیفیت چھائی ہوئی ہے۔ پشاور کا اپنا ایک وقار ہے۔ قدرت نے اسے زندگی کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ رومان پرور درۂ خیبر اور دلکش ریاست سوات کا دروازہ بھی ہے۔

دو ہزار برس گزرے وسطی ایشیا کو جانے والے تجارتی راستے پر ایک اہم شہر تھا۔ بدھ تاجر ریشم، نایاب پارچات، قیمتی پتھروں اور (Spices) سے لدے ہوئے قافلے ترکستان اور ہندوستان کی طرف جاتے۔ واپسی پر وہ خطہ مغرب سے عمدہ شیشے کا سامان، سونا اور چاندی لاتے۔ اور بحیرۂ روم سے گزرتے ہوئے چین جاتے۔

یہ خطہ خوشحال تھا، شہزادوں اور روزیروں۔ نے کہا ہوا تھا کہ وہ اس بات کا خیال رکھیں کہ جو شخص بھی یہاں آئے، وہ دنیائے مشرق کی آسائشیں و رشان وشوکت کو پوری طرح دیکھ لے۔ کشن بادشاہوں، سکھوں، مغلوں اور آخر میں انگریزوں سب نے اسے اپنا خاص مقام بنایا اور باری باری سب اسے حاصل کرنے کے لیے لڑے۔

آج کل اس کی آبادی 155,000 کے قریب ہے۔ جو قابلِ فخر پٹھانوں، کنیڈا کے چند

باشندوں اور نوجوان امریکیوں کی ایک کثیر تعداد پر مشتمل ہے۔ اب بھی پشاور، پاکستان کا ایک قدیم ترین مشہور شہر ہونے کی حیثیت سے اپنی ایشیائی انفرادیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ سطح سمندر سے 1136 فٹ کی بلندی پر واقع ہے اس کے دونمایاں حصوں پر تازہ اور سرد ہوائیں چلتی ہیں۔ چھاؤنی کا علاقہ پانچ مربع میل کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ سڑکوں پر دو رویہ سبز پیڑ ہیں......اور ساتھ ساتھ خوبصورت مکانات...... ہر ایک کا اپنا ایک باغیچہ ہے۔ شہر کے علاقہ میں دلکش مال ہے۔ سڑکوں میں بارونق دکانیں ہیں جن کے نام بھی بڑے خوبصورت ہیں...... بازار بٹیر بازاں میں یا مشہور بازار قصہ خوانی میں گھومنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ یہی کیفیت جی ٹی روڈ کی ہے جو پشاور میں شاہراہ کا کام دیتی ہے۔

پشاور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ افغان سرحد پر یہ سب سے بڑا فوجی مرکز ہے اور مغربی پاکستان میں پاکستان ویسٹرن ریلوے کا آخری اسٹیشن ہے۔ کراچی سے آنے والی ٹرینیں یہاں براہ راست پہنچتی ہیں۔ پی آئی اے پاکستان کی اپنی انٹرنیشنل ایئرلائنز کی کئی پروازیں روزانہ کراچی سے صرف دو گھنٹے اور 45 منٹ میں پہنچتی ہیں۔ اکثر لوگ کراچی سے پشاور اپنی کاروں پر بھی چلے آتے ہیں۔ راستے میں ایک رات انہیں ٹھہرنا پڑتا ہے۔ اکتوبر سے اپریل تک آب وہوا خوشگوار اور عمدہ ہوتی ہے لیکن جنوری فروری میں دیہات میں پہاڑیاں برف سے ڈھک جاتی ہیں اور ہوا میں سردی کی شدید چبھن بڑی مزے دار ہوتی ہے۔ ڈینز یہاں کا بڑا ہوٹل اور ایک عمدہ جگہ ہے۔ میں اسی ہوٹل میں ٹھہری تھی۔ بنگلوں کے ایک سلسلے کی صورت بنے ہوئے اس ہوٹل کے فرش پر پھول بکھرے ہوئے ہیں۔ ترکی، روس اور یورپ کو آتے جاتے مہمانوں کے باعث یہاں ایک دلچسپ غیر ملکی خوشبو چھائی رہتی ہے۔ امریکہ سے آنے والے تاجروں کے ساتھ یہاں کے ڈپلومیٹ اور ٹیکنیکل ماہرین خوب مذاکرات کرتے ہیں۔ اہلِ قلم اور مہم جو مشروبات پر اکٹھے ہو بیٹھتے ہیں اور ایک دوسرے کو تجسس بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ہوٹل کا عملہ نہایت مہمان نواز ہے اور ایک غیر متوقع مہمان کے لیے بھی کسی نہ کسی طرح جگہ بنالی جاتی ہے خواہ ہوٹل کے کمرے بالکل پُر ہوں۔ خرچ مل ملا کر روزانہ چالیس روپے بنتا ہے۔

محکمہ سیاحت نے: نیز میں اپنا چھوٹا سا دفتر کھول رکھا ہے۔ جہاں سیاح اپنے سفر کا پروگرام بنا سکتے ہیں اور آزاد قبائلی علاقے سے حکومت پاکستان کے محکمہ سیاحت کی طرف سے اجازت نامے

حاصل کر سکتے ہیں۔ پی آئی اے ہیڈ کوارٹر بھی ڈینز میں ہی ہے۔ ہوٹل کے باہر ٹیکسیاں اور تانگے کھڑے رہتے ہیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے ہوٹل گریز، لالہ زار اور سروسز میں کمرے اور بستر نہایت معمولی نرخوں پر مل جاتے ہیں۔ ہیڈ ورکس ڈیپارٹمنٹ کے سیکرٹری کی اجازت سے چھاؤنی میں واقع سرکٹ ہاؤس اور ڈاک بنگلہ میں بھی سیاحوں کے لیے رہائش کا انتظام ہو جاتا ہے۔

پشاور کلب میں زندگی کے لمحات پُر آسائش اور پُر شکوہ گزرتے ہیں۔ مہمانوں اور ملاقاتیوں کے لیے ایک بہت بڑا اور خوبصورت نہانے کا تالاب موجود ہے۔ اپنے شہر سے دور لوگ اکثر یہاں ٹھہرتے ہیں۔ یہاں طرز رہائش قدیم ہے لیکن اس میں کچھ جدید سہولتوں کا اضافہ بھی ہے۔ ریٹ پندرہ روپے روزانہ سے شروع ہوتے ہیں جن میں گھر کے پکے ہوئے عمدہ کھانے بھی شامل ہیں۔ کلب میں ایک لائبریری ہے جہاں پڑھنے کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ چائے پینے، شام کے کھانے اور رقص کے لیے بڑے لان بھی موجود ہیں۔ اس علاقے کا ایک بہت بڑا حصہ کلب سے متعلق ہے۔ شاندار فائن ہول گاف کورس بھی اس سے وابستہ ہے۔ کلب میں واقع ٹینس اور سکوائش کورٹس قریباً سارا سال ہی استعمال میں رہتی ہیں۔ آس پاس کے کئی جدید سینما گھروں میں دوپہر اور شام کے شو ہوتے ہیں۔ نیو فرنٹیئر ٹورسٹ کلب اب ہر آنے والے کے لیے کشادہ ہے جہاں جدید کمرے عمدہ کھانا اور اچھی سروس سب کچھ درمیانے سے نرخوں پر مل جاتا ہے۔

پشاور کا عجائب گھر بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ اس کا دامن گندھارا آرٹ سے مالا مال ہے اور مجسّموں سے لے کر سونے، چاندی کے نایاب سکوں، ہتھیار، عربی اور فارسی کے قدیم نسخے اور انمول جواہرات تک...... ساری تاریخی اشیاء موجود ہیں مٹی کے پرانے برتن صدیوں پرانے دستکاروں کے فن کی غمازی کرتے ہیں۔ باریک لیکن واضح خطوط اور عمدہ کام مسلم کلچر کی وسعتِ دامانیٔ اظہار کے آئینہ دار ہیں۔ پشاور کے عین قلب میں تاریخی، گور گٹھڑی بدھ عہد کی ایک حسین یادگار ہے۔ سکھوں کے عہد میں یہ اطالوی جنرل ایوی قبائل کی رہائش گاہ بن گئی تھی۔ اندر شہر بازار کی دلکش اور سفید مسجد مہابت خان کے اونچے مینار ہر جانے والے سے کہتے ہیں کہ یہاں ٹھہر و اور دم لے کر آگے جاؤ۔ شاہ جہاں کے زمانے میں اسے پشاور کے مغل گورنر نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے میناروں کے جھروکوں سے پشاور کا بڑا خوبصورت منظر دیکھنے میں آتا ہے۔ فرطِ جذبات سے بے قابو ہو کر میں نے تلے نظر جھکائی تو مجھے آفریدی اور شنواری قبیلوں کے عجیب لوگ دکھائی

دیئے...... طویل قد و قامت اور پُر شکوہ جسامت والے یہ باشندے لدے ہوئے اونٹوں کے قافلوں، خچروں اور گدھوں کے ساتھ گزر رہے تھے۔ ان سب کا رُخ منڈی کی طرف تھا۔ میرے ذہن میں وہ قدیم دن گھومنے لگے جب قافلے ان راستوں سے گزرتے اور پھر کس طرح زمین، زن اور طاقت کے لیے انہی سواریوں سے جنگیں لڑی جاتی تھیں۔ میں نے ان سارے زمانوں کی جدوجہد کے بارے میں سوچا جس کا انجام یہ ہوا تھا کہ مسلمانوں کی جرأت و سطوت سرحد پر غالب آ گئی۔ اسی وقت میرے ذہن میں قرآنِ مقدس کی آیتیں آ گئیں جن کا مفہوم کچھ ایسے ہے...... ''تم پر خدا کی رحمت ہو کہ تم نے صبر کیا اور اب دیکھو کہ یہ آخری منزل کس قدر خوبصورت ہے......'' یہ تاثرات اس ماحول اور تنہائی پر منطبق ہو رہے تھے۔ یہ نظریہ پاکستان کے بھی عین مطابق تھے۔ پاکستان جس نے اپنی آزادی اور ایمان کے راستے میں کسی سنگِ راہ کو نہیں رہنے دیا۔ کچھ عرصہ بعد اپنے چند دوستوں کے ہمراہ میں نے پشاور سے 19 میل دور قلعہ جمرود بھی دیکھا۔ یہاں درہ خیبر پر مشہور ''خیبر رائفلز'' کا صدر مقام بھی ہے...... جواں سال کپتان انچارج نے ہمیں ادھر اُدھر گھمایا۔ ادھر بہت کم لوگ جانے کی جرأت کرتے تھے ہمارے اچانک داخلے پر وہ بہت خوش ہوئے۔ ہم نے سپاہیوں کی ورزش دیکھی پھر ایک لیکچر میں بھی گئے جہاں فلموں سے یہ واضح کیا گیا تھا کہ زیر تربیت لوگوں کے کردار اب پرامن سرحدوں کے محافظوں کے سے ہوں گے۔ ہر سیّاح کے لیے درۂ خیبر دیکھنا ناگزیر ہے۔

پشاور سے 15 میل باہر کنیڈا کے سب سے بڑے کولمبو پلان پروجیکٹ وارسک واقع ہے۔ افغانستان کی سرحد کے نزدیک دریائے کابل پر یہ جگہ نہایت شاندار اور قابل دید ہے۔ وارسک بند سے 160,000 کلوواٹ بجلی پیدا ہوتی ہے اور 100,000 ایکڑ خشک زمین سیراب ہوتی ہے۔ کنیڈا اور پاکستان دونوں کے باشندوں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ کنیڈا کی نوجوان مائیں مخلص آیاؤں سے گھل مل گئیں۔ آیائیں بھی بڑے پیار سے ان کے بچوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں...... عام پاکستانی باورچی جو پلیٹیں بھی نہیں دھوتے تھے اب خوشی خوشی یہ کام کرتے ہیں ایک غیر ملکی مالکن کی مشفقانہ نگرانی میں گھر کی صفائی بھی کرتے ہیں۔

بچوں کے درمیان زبان کے فاصلے کو جلد ہی عبور کر لیا گیا۔ کنیڈا کے بچوں کے لیے اپنے سکول تھے جہاں کنیڈا کے ٹیچر ہی پڑھاتے تھے اور انہیں بھی اجنبیت محسوس ہی نہیں ہوتی تھی۔ رسی

ان کی قسمت اس ڈگر پر رواں رہی...... حتیٰ کہ کنیڈائی خلوص دل کی متاع لے کر آئے۔انہوں نے ان کی زمین کو سیراب کرنے کی پیشکش کی...... اور انہیں برقی قوت کی مدد پیش کی تا کہ وہ کم محنت اور زیادہ اعتماد کے ساتھ بہتر زندگی بسر کر سکیں۔حکومت پاکستان نے بھی غیور پٹھانوں کے دل میں یہ بات بٹھا دی اور ایک تعلیم یافتہ معزز پٹھان جو کچھ عرصہ باہر بھی رہے تھے وہ اپنے ہموطنوں کو ان کی زبان میں یہ بتانے لگے کہ مستقبل میں انہیں کیا کیا نعمتیں میسر آ سکیں گی۔

شاہنواز خان صاحب اپنے ہم وطن پٹھانوں کی مانند طویل القامت، مضبوط، جسیم اور سخت مزاج ہیں۔انہوں نے ان کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے خاص محنت اور وقت صرف کیا ہے۔ روزانہ وہ پٹھانوں کو 'وارسک' کے لیے مجوزہ زمین دیکھنے کو بلاتے...... صرف باتیں سننے کی بھی انہیں اجرت دی جاتی...... وہ انہیں سمجھاتے کہ جب بند مکمل ہو گیا تو دریائے کابل کا چمکدار پانی ان کی بنجر زمینوں میں بل کھائے گا۔ان کی فصلیں نمو پائیں گی پھلیں پھولیں گی۔ان کے بچوں کی مفت تعلیم کے لیے سکول کھل جائیں گے۔بجلی کی روشنی ان کے گھروں کو منور کرے گی۔محنت میں وقار بھی ہے اور یہ کسی کمزوری کی علامت نہیں ہے۔اس محنت کا معاوضہ انہیں روپے کی شکل میں دیا جائے گا۔جس سے وہ اپنی ضرورت کی چیزیں خرید سکیں گے۔اپنی بیویوں کے لیے نئے کپڑے عورتوں کے لیے زیورات اور سامان آرائش اپنے لیے سائیکل اچھی خوراک میسر آئے گی بہتر رہائش گاہیں ہوں گی اور ان کی جیبوں میں ہمیشہ پیسے کھنکیں گے۔

کئی روز اس سننے سنانے اور مفت پیسے دینے کے بعد پٹھانوں سے شاہنواز خان نے پوچھا کہ اب ان میں سے کون کون کام کے لیے آئے گا۔ضرورت 7000 افراد کی تھی۔صرف چند آمادہ ہوئے۔باقی ساتھ کے گاؤں میں گھومنے پھرنے چلے گئے ہفتے گزر گئے اور جب مزدور قبائلی کھنکتے سکوں کے ساتھ اپنے علاقے میں واپس گئے۔انہیں کھنکاتے ادھر ادھر گھومے اور ایک تنہا مکان سے موسیقی کی لہریں اُبھریں۔جہاں ایک پٹھان نے اپنی اس آمدنی سے ایک ریڈیو خرید لیا تھا۔ پھر کیا تھا جلد ہی ہزاروں پٹھان چلے آئے اور بہت سے پٹھان خاندان وارسک کے میدان میں رہ رہے تھے۔پٹھان بچے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کسی سکول میں داخل ہو رہے تھے اسی لیے وہ چپ چپ سے تھے۔کام کی جگہ سے باہر پٹھانوں کے سائیکل کھڑے ہوتے۔ایک پٹھان بھی انسان ہوتا ہے...... اور اپنی خون پسینے کی کمائی سے خریدی ہوئی سواری کا اسے بہت فکر ہوتا ہے۔

پھلانگنا اور گیند ایسے کھیل ہیں جن میں الفاظ کے استعمال کی بہت کم ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بچوں کے اشارے اور مسکراہٹیں بتا دیتیں کہ بات سمجھ میں آ گئی ہے۔جب کہ ان کی مائیں انہیں دیکھتیں اور پھر اپنی سلائیاں یا ڈیزائن ایک دوسرے سے بدل لیتیں۔گھریلو زندگی کی پابندیوں نے وارسک کی نجی دنیا کو وہاں ٹھہرے ہوئے 150 خاندانوں کے لیے نہایت پُر مسرت مقام بنا دیا۔تمام مصروف باپ، خواہ وہ انجینئر تھے مزدور تھے ویلڈر تھے یا بڑھئی تھے انہیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ ایک ساتھ کام کرنا سب سے مضبوط رشتہ ہے۔کنیڈا کے اعلیٰ آفیسر بھی پاکستانیوں کی تیز ذہانت کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔اس قبائلی علاقے کے ڈیم پر کام کرنے والے کنیڈا کے انجینئروں کو اب بھی احترام سے یاد کرتے ہیں کیونکہ وہ خود آستینیں چڑھا کر کام میں لگ جاتے۔حالانکہ ڈیوٹی کے لحاظ سے یہ کام ان کے جونیئرز کا ہوتا...... سرنگوں کے گہرے حصوں میں انہیں پسینے میں شرابور اور ہانپتے دیکھا جاتا اس طرح وہ ایک پائپ لائن کو مناسب مقام پر رکھنے کے لیے ناتجربہ کار مزدوروں کے گروہوں کی رہنمائی کرتے...... ہر روز جب یہ کنیڈائی پاور ہاؤس سے نکلتے تو گریس سے ان کے چہرے سیاہ ہوتے، آٹھ گھنٹے کے اس مسلسل اور عمدہ کام کے باعث ان کے فولادی خود بھی تیل گریس وغیرہ سے آلودہ چمک رہے ہوتے...... بند پر کام کرنے والے قبائلی مزدور زمین کھودتے، مٹی ڈھوتے.وقت اس بات پر سخت حیران ہوتے کہ یہ تعلیم یافتہ غیر ملکی لوگ اس ناہموار زمین پر ہمارے ساتھ ہی محنت کر رہے ہیں۔

ماضی میں غیر ممالک سے لوگ آتے بھی تھے تو تلواروں کے ساتھ ان پر حکومت کرنے کے لیے۔لیکن یوں اس دوستانہ ماحول میں ان کی مدد کرنے، انہیں تربیت دینے کے لیے کبھی کوئی اجنبی نہیں آیا تھا...... صدیوں کی بات ہے کہ حملہ آور آتے اور چلے جاتے...... ہر فاتح انہیں اپنا غلام بنانے کے لیے ہمت آزمائی کرتا...... ان پٹھانوں کو جو پیدا ہی آزاد رہنے کے لیے ہوتے ہیں...... جو بچپن سے ہی بندوق اٹھائے پھرتے ہیں...... اس بہت بڑی دنیا کے مقابلے میں اپنی حفاظت کے لیے جس دنیا پر وہ کبھی اعتبار نہیں کرتے حتیٰ کہ جب برطانوی حکمرانوں نے دریائے کابل کے ساتھ ریلوے لائن بچھانا چاہی تو انہیں بھی پسپا کر دیا گیا۔کیونکہ وہ اس زمین پر نقل و حمل کے لیے آسانی پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن قبائلی ایسی ہر چیز کے مخالف تھے۔اب بھی آمد و رفت اور بار برداری کے لیے ان کے پاس خچر ہیں، گھوڑے ہیں، اونٹ ہیں...... اور دو مضبوط پاؤں......

اس لیے اب بھی وہ بندوقیں لے کر کام پر آتے۔ کبھی کبھی بعض تنازعات کا انجام المیہ ہوجاتا ہے۔ لیکن آخر کنیڈائی لوگوں کو خالی ہاتھ دیکھ دیکھ کر پٹھانوں کو بھی اس بات پر تیار کرلیا گیا کہ وہ اپنی بندوقیں گھر رکھ کر آئیں اور اب 7000 پٹھانوں میں سے کسی کے پاس بھی بندوق نہیں دیکھی جا سکتی۔ وارسک جمہوریت کی ایک صحیح مثال ہے۔ جو پٹھانوں اور کنیڈائیوں کو پانچ گھنٹے کی سخت محنت کے لیے ایک دوسرے سے منسلک رکھتی ہے۔ اگر چہ اب اسے ساتھ آٹھ برس بیت چکے ہیں لیکن کنیڈا کی دوستی اور ملک کے اس دور افتادہ حصے میں انسانی خدمت کے یہ نقوش اہل پاکستان کے دل میں ہمیشہ تابندہ رہیں گے۔

پشاور سے 25 میل جنوب میں مشہور درہ کوہاٹ قبائلی علاقے میں واقع ہے جہاں آفریدی قبیلے کے لوگ رہتے اور کام کرتے ہیں...... ان کے ہاتھ کے بنے ہوئے ریوالور اور رائفلیں مشینوں سے بنے ہوئے آلات سے زیادہ عمدہ اور خوش شکل ہوتے ہیں۔ دنیا کے ہر حصے کے سیاح انہیں وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کوہاٹ ایک چھوٹے سے جزیرے سے مشابہ ہے جہاں بالکل نایاب سامان تجارت نہایت ارزاں نرخوں پر دستیاب ہے۔ ذرا تصور کیجیے کہ میں نے ایک دکان پر چین کا ریشمی کپڑا اور میڈرڈ کے (laceS) بکتے دیکھے۔ میں نے ایک کریم رنگ (lace waap) وہیں پہن لیا اور اسے خرید بھی لیا...... ساتھ کھڑے سرخ قبائلی مجھے یہ پہنتے دیکھ کر تحسین کے انداز میں مسکرا رہے تھے۔ بعد میں میں نے مقامی قبائلی سردار کے ساتھ بیٹھ کر ایک گائے کا تازہ اور سرخ رنگ گوشت کھایا۔ گائے کو ابھی ابھی ذبح کر کے باہر تنور پر پکایا گیا تھا۔ کچے پیاز کے ساتھ اس کا ذائقہ بڑا عمدہ لگا۔ درہ کوہاٹ میں لوگ بڑے دل لگا کر کھانا کھاتے ہیں، اگرچہ خوراک کچھ زیادہ تازہ نہیں ہوتی۔

ان تعلیمی اور مطالعاتی قسم کے مناظر کو دیکھنے کے بعد آرام کے لمحات پشاور کے الف لیلوی بازار اور مصنوعات دیکھتے ہوئے گزارے جاسکتے ہیں۔ کہیں معمولی قیمت کے سنہری جوتے آپ کی آنکھوں کے سامنے بنائے جا رہے ہیں۔ کہیں پیدائشی فنکاروں کی مصنوعات چمک رہی ہیں...... آپ کے سامنے ہی زیورات بنائے جا رہے ہیں۔ آپ کے دیکھتے ہی دیکھتے چمڑے کو کوٹا اور پھر بکسوں کی شکل میں ڈھالا جاتا ہے۔ پٹھانوں کی دلکش ٹوپیاں اور پگڑیاں چمکدار ریشمی دھاگوں سے اور موتی جڑ کر بنائی جاتی ہیں۔ یہ ایک تار عنکبوت کی طرح نازک ہوتی ہیں......

سامان کراکری اور لکڑی کی چیزوں پر پتھروں کی مدد سے رنگ کیا جاتا ہے۔ ذہین درزی ایرانی بھیڑوں اور بکریوں کی کھالوں پر بھی مشین چلا لیتے ہیں۔ پشاور کے تانبے اور کانسی کے برتنوں پر جو چمک ہوتی ہے وہ اس شمال مغربی سرحدی علاقے کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ چمکدار دھات کی بنی ہوئی بڑی گول ٹرے، کافی دلکش میز، کافی سیٹ، شمعدان اور مختلف شکل کی پلیٹیں تنگدست سیاح کو مجبور کردیتی ہیں کہ سب کچھ خریدنے کے باوجود وہ کچھ اور خریدنے کے لیے بے تاب ہوجاتا ہے۔ اس نفیس دستکاری کا راز موروثی اور روایتی ہے اور مدتوں سے یہ باپ سے بیٹے کی طرف سینہ بہ سینہ منتقل ہو رہا ہے۔ یہ فن ان کی زندگی کا اتنا ہی اہم حصہ ہے جتنا کہ وہ مذہب، جس پر وہ ایمان لے آئے ہیں۔

الف لیلوی ماحول والا قصہ خوانی بازار دل موہ لیتا ہے۔ برسوں سے یہ داستان سنانے والوں کے بازار کی حیثیت سے مشہور ہے اور اب بھی یہاں کی فضا قسمت بتانے والوں، خوانچہ فروشوں اور رقص کرتے لڑکوں سے معمور ہے۔ پشاور کی زرخیز باغوں کے پکے ہوئے لذیذ پھلوں سے سجی دکانوں کو دیکھ کر منہ میں پانی بھر آتا ہے...... پھلوں کو بڑی دلکش ترتیب سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ تازہ پھلوں کا رس چار آنے فی گلاس بکتا ہے۔ ہر راہ کیفوں سے لپکتی اشتہا انگیز خوشبو ایک شخص کو سیخ کباب کھانے پر مجبور کردیتی ہے اچھی طرح سینکے ہوئے گرم گرم نانوں پر رکھ کر انہیں کھائیں تو بڑا لطف آتا ہے۔

خرید و فروخت کا بھی بڑا مزہ آتا ہے۔ میں ایک سینڈل ساز سے باتوں میں مصروف تھی کہ ایک کسان قریب آکر رکا...... ''میم صاحب'' کہنے لگا'' کیا آپ ایک موٹا تازہ چوزہ نہیں خریدیں گی۔ پیشتر اس کے کہ میں جواب دیتی اس نے اپنے تھیلے سے ٹانگیں ہلاتی، پر پھڑپھڑاتی مرغی نکالی...... اور بڑے فخر سے اسے میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے شکریے کے ساتھ اس کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کیا...... کہ اگر ڈنر پر میں ایک اپنا مرغ لے کر پہنچی تو ڈنر والے کیا کہیں گے......؟'' ان لوگوں کی سادگی بھی ان کی دلکشی کا اہم حصہ ہے...... اچھے دام ملنے کی توقع ہو تو وہ کسی بھی جگہ خریدار کو ڈھونڈ نکالیں گے...... وہ چاہتے ہیں کہ آپ اپنے قیام سے پوری طرح لطف اندوز ہوں۔ وہ آپ کو ہر چیز دکھائیں گے۔ ان میں مرغیوں کے چوزے بھی شامل ہیں۔

پشاور کے گردونواح میں ایک اور قابل دید مقام نوشہرہ ہے۔ جو ایک خوبصورت اور وسیع شاہراہ سے صرف چند میل کے فاصلے پر پڑتا ہے یہ دریائے کابل کے کنارے پر پھیلا ہوا ہے۔ نوشہرہ ایک چھوٹا سا دیہاتی قصبہ ہے جہاں فیروز سنز کی فارسیٹیکل لیبارٹریز واقع ہیں۔ وہی کتابیں چھاپنے والے فیروز سنز۔ یہاں پانچ سو کے قریب کارکن ہیں سب ہنسی خوشی کام کرتے ہیں۔ انہیں روزمرہ کی ضروریات کے ساتھ ساتھ طبی سہولتیں بھی میسر ہیں۔ نوشہرہ چھاؤنی دریائے کابل کے دائیں کنارے پر پھیلی ہوئی ہے یہ اہم فوجی مقام سب ڈویژن کا ہیڈ کوارٹر ہے جی ٹی روڈ اسی میں سے گزرتی ہے دریا کو عبور کرنے کے لیے کشتیوں کا پل بھی ہے اور ایک ریلوے لائن اور سڑک کا مشترکہ پل بھی ہے ایک دلکش ڈاک بنگلہ بھی...... رنگ رنگ پھولوں کے باغیچوں کے درمیان مسکراتا ہے۔ اس کے کنارے پر ایک خوش نظر آفیسرز کلب آنے والوں کے لیے آغوش کشادہ رہتا ہے۔

نوشہرہ سے چار میل دور رسالپور کئی ایک وجوہ کے باعث نہایت مقبول جگہ ہے۔ اس کی آب وہوا نہایت صحت بخش خیال کی جاتی ہے۔ یہ پاک فضائیہ کا اہم سٹیشن ہے۔ یہاں ایک تربیتی سکول بھی ہے۔ یہ خوبصورت مقام دریائے کابل کے بائیں کنارے آباد ہے۔ ایک اور خوبصورت بستی ہے جہاں پشاور سے زیادہ خنکی ہے اور سطح سمندر سے خاصی بلند ہے۔

ضلع پشاور پشتو کے مشہور محب وطن اور کلاسیکی شاعر خوشحال خان خٹک کی جائے پیدائش بھی ہے۔ خوشحال خان کے والد خٹک قبیلے کے سربراہ بھی تھے وہ نوشہرہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر واقع اکورہ خٹک میں پیدا ہوئے والد کا انتقال ہوا تو خوشحال کمسنی میں ہی اپنے قبیلے کے سربراہ بن گئے اور مغل فوج کی طرف سے انہوں نے کئی فتوحات حاصل کیں اورنگ زیب کے زمانے میں وہ کسی وجہ سے بادشاہ کی نظروں سے گر گئے اور انہیں ایک مغل عدالت نے پشاور میں قید کی سزا دی اور بعد میں دہلی اور جے پور میں قید خانے میں رہے۔ 57 برس کی عمر میں انہیں رہا کیا گیا انہوں نے قید میں ہی شاعری کی۔ اگرچہ اس میں انتقام کے جذبات کا زیادہ اظہار ہے لیکن ان کا کلام پھر بھی پیغمبر اسلام ﷺ کی مدح کے باعث نہایت مقبول ہے انہوں نے صوفیانہ اور عشقیہ شاعری بھی کی۔ اپنی ذات کا وقار اور جرأت جس کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ انہوں نے آفریدیوں میں وفات پائی، جن کے پاس انہوں نے پناہ...... لی تھی ان کی آخری خواہش یہ تھی کہ انہیں کسی ایسی جگہ دفن نہ کیا جائے جہاں مغل حملہ آوروں کے قدم پہنچ سکیں۔ خوشحال خاں کی سادگی پشاور کے لوگوں کی سادہ طبیعتوں سے ہی مشابہ تھی۔

پشاور کی قریبی شاہراہوں کو اب بڑا خوبصورت بنا دیا گیا ہے۔ معزز مہمانوں کے لیے جمرود کے مقام پر ایک بڑا تقریباتی پلیٹ فارم تعمیر کیا گیا ہے یہ پشاور روڈ پر خیبر کی طرف جاتے ہوئے آتا ہے یہاں ممتاز مہمانوں کو قربانی کے بکرے اور دوسرے تحائف پیش کرنے کی رسم اب زیادہ وقار سے انجام پائے گی۔ تھیٹروں کا پس منظر ڈرامائی ماحول ہے۔ اس کے عین سامنے سکھ دور کا پرانا کچا قلعہ ہے اور نیچے پشاور کی اپنی تاریخ ساز شاہراہ پر پشاور کا ہمیشہ نیلگوں رہنے والا آسمان سایہ کیے ہوئے ہے۔ یہ پرشکوہ محراب اور دروازہ تاریخی خیبر کے روایتی ماحول میں اور اضافہ کرتا ہے۔ یہاں ستونوں کی تعمیر قبائلی علاقوں کی چوکیوں کی طرز پر کی گئی ہے۔ اس میں مالا گوری پہاڑیوں سے نکالا ہوا سنگ مرمر استعمال کیا گیا ہے پشاور میں ان دنوں اے جی مدنی کمشنر ہے انہوں نے ساری تعمیر اپنی نگرانی میں کروائی تھی اس جگہ کو خوبصورت اور دل کش بنانے کے لیے انہوں نے اپنی دلی توجہ دی تھی۔

شاہراہ کے نیچے پشاور کے مغل عہد کے باغات موجود ہیں شاہ باغ اور وزیر باغ ایشیا کے اس دروازے کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں لمبے لمبے پیڑ اور پھول بڑی تعداد میں اگتے ہیں اور پتھر کے کٹے ہوئے ٹھنڈے بینچ ذہنی سکون کا سرچشمہ ہیں پشاور میں زندگی کی ہر جگہ ایک انفرادیت ہے ایک ادا ہے یہاں ماضی کی جھلملاتی جھلکیاں بھی ہیں اور اس کے حال کے ہر لمحے میں مسرت کی قیمتی ساعتوں کا اضافہ کرتی جدتیں بھی......

سحر انگیز خیبر

خیبر پاس: اس نام میں جادو ہے جو برسوں پرانے بہادر لوگوں اور معرکہ خیز دنوں کی یاد دلاتا ہے خیبر پاس، عظیم الشان خیبر...... جس کے گیت گائے جاتے ہیں۔ جس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاتا ہے۔ وہ مقام جسے اس سرزمین پر آنے والے تمام سیاح دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کی خوبصورتی اور حیرت انگیز ماضی کے بارے میں کم لوگوں کو واقفیت ہے بہت کم لوگ اس کے باشندوں، پٹھان قوم کے بارے میں جانتے ہیں...... غیر مفتوح لوگ جو آج بھی پوشیدہ جھونپڑیوں اور غاروں میں رہتے ہیں، اپنے اصلاف کی قائم کی ہوئی روایات پر چلتے ہیں اور بدنامی کے ساتھ زندہ رہنے کی نسبت اپنی عزت کی خاطر جان دے دیتے ہیں۔

پٹھان کس چیز سے بنے ہیں؟ ان کا پس منظر کیا ہے؟ اپنے شاندار ماضی کے علاوہ حال ہی میں انہوں نے کیا کردار ادا کیا ہے؟ بیسیویں صدی کی تہذیب میں انہوں نے خود کو کس طرح ڈھالا ہے؟ نیا وارسک ڈیم بننے کے وقت سے انہوں نے نہایت شاندار کردار ادا کیا ہے۔ نہ بڑے بڑے دعوے ہوئے اور نہ بینڈ باجوں ہی کی آوازیں آئیں، لیکن یہ سب کچھ ایک حقیقت ہے جو صرف چند سال پہلے رونما ہوئی ہے۔

گڑگڑاتی آوازیں۔ گرتی ہوئی چٹانیں، شروع میں دھیمے دھیمے اور پھر شور کے ساتھ اوپر سے گرتی ہوئی مٹی یک لخت یہ سب ایک پرزور شور میں تبدیل ہو گئے اور انجینئر شاہ نواز خاں اور ان کے پتلے دبلے ساتھی غلام کے اردگرد مٹی کے تودے گرنے لگے چند لمحے پہلے وہ پشاور سے باہر وارسک ڈیم پر ایک خندق کے کشادہ سرے پر کھڑے تھے جہاں سنہری دھوپ ہوا کی نمی کو کاٹ رہی تھی اب وہ یک لخت مٹی اور ملبے کے انبار میں پھنس گئے تھے اور دن کی روشنی غائب اور سورج آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا گویا چاروں طرف سیاہ لبادہ پھیلا دیا گیا ہو۔ پھر سانس گھونٹنے والے بخارات اور بے حد دھول اڑی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ پتھر گرنا بند ہو گئے۔ شاہنواز نے چہرہ سے پسینہ پونچھا اور دم بخود غلام کو ملبہ سے کھینچتے ہوئے چیخا ”چھپ جاؤ“ ”ادھر آؤ“ اس نے کہا ”تحمل سے کام لو۔ روشنی کی ایک کرن آ رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم پوری طرح نہیں گھرے“ مٹی اور پتھروں کے ڈھیر میں راستہ تلاش کرتے ہوئے انہوں نے روشنی کی راہ کو ڈھونڈ نکالا۔ ڈھکے ہوئے راستہ میں ایک سوراخ نظر آ رہا تھا جس سے ایک آدمی بمشکل رینگ کر باہر نکل سکتا تھا۔

”غلام باہر نکل جاؤ اور پھر واپس آؤ۔ دیکھتے ہیں یہ راستہ کتنا محفوظ ہے سرنگ کے دوسرے سرے پر سو آدمی کام کر رہے ہیں۔ ہمیں انہیں اس سوراخ کے ذریعے فوراً باہر نکالنا چاہیے۔“ غلام رینگ کر باہر نکل گیا اور پھر واپس آیا۔ ”صاحب...... صاحب...... یہ جگہ بہت مخدوش ہے بہرحال ہم کچھ نہ کچھ انتظام کر لیں گے؟ پھر شاہنواز نے اپنے فورمین کو فون کیا اور کہا، ”لوگوں کو فوراً سرنگ کے اس سرے پر لے آؤ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں ہر ایک سے۔“

لوگ بغیر کسی اضطراب کے آ گئے اور بچانے والوں کے آنے سے پہلے شاہنواز نے تمام مزدوروں کو صحیح سلامت باہر نکال لیا اور تمام دن کسی نے آرام نہیں کیا۔ اس کے بجائے انہوں نے اگلے اٹھارہ گھنٹے سرنگ کو صاف کرنے میں صرف کیے اور سو آدمیوں کی اگلی شفٹ کام پر اس طرح آئی گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

یہ لوگ ان سات ہزار پٹھان مزدوروں میں سے تھے جنہوں نے منگلا ڈیم تعمیر کیا۔ پٹھان خون کے گرم اور نڈر ہوتے ہیں۔ یہی وہ اصل چیز ہے جس سے پٹھان بنے ہیں۔ خواہ وہ آفریدی، آفندی، تلاگوری، مہمند یا ملک قبائل سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہزاروں پٹھان پاکستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن ان کا خاص علاقہ شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے جو خیبر پاس، پشاور، کوہاٹ پاس اور سوات کا علاقہ ہے۔ سب کے طور طریق اور رسم و رواج ایک ہیں۔ سب پشتو بولتے ہیں اور اپنے ساتھ بندوقیں رکھتے ہیں۔

پٹھانوں کی پیدائش، شادی، موت، محبت، جنگ اور نفرت کی بے شمار رسمیں ہیں گو یہ موجودہ دور کی اقدار سے لگا نہیں کھاتیں لیکن یہ طریق پرورش بہادر جنگجو پیدا کرتا ہے ماں بچہ کو سخت ضابطہ

حیات پر عمل کرنا سکھاتی ہے اور اسے کھلونوں کی جگہ بندوق دیتی ہے وہ تمام آسائشیں جو عام سمجھی جاتی ہیں اس کے لیے ممنوع ہیں اور اسے سادہ کپڑے پہنائے جاتے ہیں تاکہ وہ مغرور نہ ہو جائے بری ارواح کو دور رکھنے کے لیے بچوں کے کپڑوں کے ساتھ تعویز سی دیئے جاتے ہیں اور اکثر ایک خاص تعویز عقل بڑھانے کے لیے ماتھے پر باندھا جاتا ہے اس کا باپ اسے سکھاتا ہے کہ عزت و ناموس کی خاطر جان دینا بدنامی کے ساتھ زندہ رہنے سے بہتر ہے جب وہ جوان ہوتا ہے تو موت کا خوف اس کے دل سے نکل چکا ہوتا ہے۔

پٹھان سکندر اعظم کی براہ راست پشت سے ہیں جو خیبر پاس اور یہاں کے پہاڑوں سے گزرا تھا۔ نسلی اعتبار سے بھی اور شکل و شباہت اور کردار کے لحاظ سے بھی یہ یونانی ہیں۔ اکثر دیہاتوں کے نام بھی یونانی ہیں اور وہاں یونانی رسمیں مروج ہیں۔ ان کے بیشتر جھگڑے عورتوں پر ہوتے ہیں۔ لیکن اندرونی طور پر وہ شاعر اور گوّیے ہوتے ہیں۔ خوش اخلاق اور رحم دل گو وہ یہ ہرگز نہیں چاہتے کہ یہ بات آپ پر آشکارا ہو۔ پٹھانوں میں ان قوموں کا بھی خون ہے جو ایران منگولیا اور سلطنت عثمانیہ سے ہندوستان آئیں۔ یہ لوگ طاقتور جنگجو ہوتے ہیں اور لڑنا پسند کرتے ہیں۔ اسلامی عقائد کا ان کی زندگی پر گہرا اثر ہے پٹھان توجہ اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں۔ ایک لمبا تڑنگا نوجوان جو خودسر، گرم جوش، غریب لیکن مغرور ہے۔ پٹھان اپنے چھوٹے سے گاؤں، بنجر خیبر یا پشاور کے گردونواح میں کھیتی باڑی کر کے اپنی روزی کماتے ہیں۔ کچھ کاریگر ہیں جو مٹی اور تانبے کے برتن بناتے ہیں اور مسجدوں میں پنج وقتہ نماز ادا کرتے ہیں۔

پہاڑی راستوں اور سرنگوں کی اوٹ میں چُھپے خیبر کے دیہاتوں میں جو سڑک سے نظر نہیں آتے، پٹھان پرانے انداز میں رہتے ہیں۔ کھلے چولہوں میں آگ جلتی رہتی ہے اور کیتلی میں چائے اُبلتی رہتی ہے۔ توانا قبائلی درمیان میں حقہ رکھ کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے ہیں اور ان کے پاس سے چھوٹے بچے بکریوں کے ریوڑ لیے گزرتے رہتے ہیں۔ بچوں کو گود میں اٹھائے برقعوں میں چھپی عورتیں گاؤں کے بازار میں خرید و فروخت کرتی ہیں اور آہستہ آہستہ چلتی ہیں تاکہ مردوں کے کام میں خلل انداز نہ ہوں۔ پٹھانوں کے جاننے میں بڑا وقت لگتا ہے لیکن ایک بار آپ کو دوست تسلیم کر لیا جائے تو وہ خیر مقدم کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیتے ہیں۔ باتیں کرتے وقت پٹھان آپ کو اپنے کام اپنی جدوجہد، گھوڑے، نئی بندوق اور بوڑھی بیوی کے بارے میں باتیں بتائے

گا۔ گاؤں کی کہانیوں میں اس کے دل کی دھڑکن جھلکتی ہے۔ ''میری سادہ کٹیا کی طرف نہیں میرے خیر مقدم کی گرم جوشی دیکھیے۔'' وہ کہتا ہے۔ وہ قصے بیان کرنے لگے گا اور خون آشام جھگڑوں اور اپنے دشمنوں کے بیٹوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی تلاش کا ذکر کرے گا جنہیں اس نے کبھی نہیں دیکھا۔ دشمنوں سے انتقام لینے کے لیے وہ خوشبو میں معطر ہو کر اپنا بہترین لباس پہن کر جائے گا...... شاید شکست کھانے اور اپنے خالق سے ملنے کے لیے...... کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ اپنے ناموس کی خاطر لڑنے والا جنت میں جاتا ہے۔

شمال کے قبائلی علاقوں میں انتقام کے جذبے کو پسند نہیں کیا جاتا۔ لیکن جب ان کا انتظامی افسر اپنے ماہانہ دورے پر معائنے اور واقعات کی تفتیش کے لیے آتا ہے تو گاؤں کا سربراہ مسکرا کر اس کا استقبال کرتا ہے۔

پٹھان اپنے خاندان میں ہی شادی کرتے ہیں۔ قبیلوں میں اکثر جوان لڑکیوں کی کمی ہوتی ہے اس صورت میں لڑکی کی تلاش باہر کے قبائل میں کی جاتی ہے۔

تمام معاملات والدین ہی طے کرتے ہیں۔

پٹھان عورتوں کی حفاظت ایک عظیم خزانے کی طرح ہوتی ہے۔ ماں بننے والی عورتیں خاندان کے مردوں کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھتیں اور کسی غیر عورت کو مسکرا کر دیکھنا گویا موت کو دعوت دیتا ہے اس معاملہ میں مصالحتی کونسل کوئی مدد نہیں کرے گی ایک بھائی کو ایسی آشنائی کا ذرا بھی شبہ ہو جائے تو وہ اپنی بہن یا عزیز ترین دوست کو گولی مار دے گا۔ اس کے غصے کے سامنے کوئی پیش نہیں جاتی۔ وہ اپنی بیوی کو مجبوراً مار دے گا اور والدین حقارت سے مسکرائیں گے۔

پٹھان فخر کے ساتھ بخوشی پھانسی چڑھ جائے گا اور خاندان کے لوگ اس کی تعریف کریں گے اور ''ہیرو'' کے نعرے لگائیں گے جب کہ منصف نے اسے قاتل قرار دیا ہے ایسی صورت میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کون راستی پر ہے۔

پٹھانوں پر آج تک کسی نے فتح حاصل نہیں کی۔ گو برطانیہ نے ان پر دو سو سال حکومت کی۔ ماضی میں دوسری قومیں انہیں مغلوب کرنے کی کوشش کرتی رہیں لیکن ناکام رہیں درحقیقت انگریزوں نے دوسرے قبیلوں میں امن رکھنے کے لیے انہیں ملازم رکھ لیا حال ہی میں صرف ایک بار پٹھانوں نے اپنی زمین پر بندوقوں کو خیرباد کہا ہے۔ کینیڈا اور کولمبو پلان کے تحت وارسک منصوبہ

کی تعمیر کے وقت جب آٹھ ہزار مزدوروں کی ضرورت تھی، پٹھان محنت کے بدلے رقم اور گاڑیوں کی پیشکش کا تمسخر اڑاتے تھے۔ وہ اس وقت بھی خچروں، اونٹوں، گھوڑوں اور اپنے پیروں پر بھروسہ رکھتے تھے۔

یہ پٹھان انجینئر شاہ نواز خاں کی دانشمندی کا کمال ہے کہ وہ لوگ راضی ہو گئے شروع میں صرف چند لوگ آگے آئے لیکن جب وہ کھنکتی ہوئی جیبوں کے ساتھ گھر لوٹے اور وارسک کی کمائی سے خریدی ہوئی سائیکلوں پر جانے لگے تو سات ہزار لوگ......اپنی بندوقیں لیے......مزدوروں میں شامل ہو گئے شاہ نواز نے انہیں بتایا کہ کینیڈا کے لوگ اپنے ساتھ بندوقیں نہیں رکھتے۔ انہیں بھی کیا ضرورت ہے؟ اور جلد ہی سات ہزار مزدوروں میں سے ایک کے پاس بھی بندوق نظر نہ آتی تھی بعد میں جب ایک پٹھان نے وارسک کی رسم افتتاح کی تو سب فخر سے سینہ تانے کھڑے تھے۔

جس پٹھان نے یہ افتتاح کیا وہ پاکستان کے صدر، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں تھے۔ جس طرح ان پٹھانوں نے وارسک کی بنجر زمین کو بارآور منصوبہ میں تبدیل کر دیا اسی طرح خیبر پاس نے انسانیت کے مقدر کو بدل ڈالا ہے بادشاہ، شہزادے فاتحین اور ان کے سپاہی اس کے نام ہی سے مسحور ہو جایا کرتے تھے اس کی سرحدوں کے اندر نئی زمینیں ڈھونڈنا اتنا ہی زبردست چیلنج تھا جتنا ایٹمی قوت والے سیاروں کی مریخ، زہرہ اور چاند پر پہنچنے کی کوشش۔

پچیس سو سال سے زاید سے خیبر پاس تاریخ کے اہم واقعات کے خاموش شاہد کی حیثیت سے کھڑا ہے خیبر ان پہاڑوں کے سلسلہ کی کلیدی حیثیت رکھتا ہے جن کے دامن میں گاؤں اور کھیت چھپے ہوئے ہیں اور اندرونی حصے میں لہلہاتی کھیتیاں اور سونے سے بھرے مندر ہیں۔

آپ کے ان راستوں پر جن پر صدیوں پہلے مشہور لوگ چلے تھے کار چلانے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے بابر، اس کا لڑکا ہمایوں، سکندر اعظم اور بہت سے دوسرے لوگ خچروں، گھوڑوں اور اونٹوں اور بیلوں کے قافلوں سے نجات پانے کے لیے ان راستوں پر چلے ہوں گے۔ نئے ملکوں کو فتح کرنے کے بارے میں سوچتے ہوئے انہوں نے سڑک کے کنارے پڑے بڑے بڑے پتھروں کے سہارے آرام کیا ہوگا۔ اترائی کے دوران انہوں نے ناقابل برداشت دن گزارے ہوں گے۔ لیکن آج کل 35 میل کا یہ ٹکڑا ہم چند گھنٹوں میں طے کر لیتے ہیں۔

پشاور سے پہلے دس میل تک اونچی ہوئی سڑک پر دوستوں کے ساتھ جیپ میں سفر کرتے ہوئے میں انہیں احساسات سے مغلوب تھی جو میں نے مشہور پرتگالی ملاح واسکوڈے گاما کے مقبرہ اور پھر امریکی صدر ابراہیم لنکن کے مجسمے کے سامنے کھڑے ہو کر محسوس کیے تھے ان لوگوں نے تاریخ پر اپنے نقوش چھوڑے تھے اور اب نئے مناظر کو ابھرتے اور مدھم پڑتے دیکھ کر تاریخ لکھی جا رہی تھی۔ گھاس کے جوتے اور ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے اور پگڑی باندھے ایک لمبا تڑنگا پٹھان چلتے ہوئے ماضی کی جھلک معلوم ہوتا تھا اس کی آنکھیں مردانگی سے پر اور فخر سے مسکرا رہی تھیں جن کے پیچھے اس کی محرومیاں، خواہشات اور جھگڑے فساد چھپے تھے ہم نے چلتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ ہلایا اور اسے سلام سے جواب دیا۔ جیسے جیسے ہم پینتیس ہزار فٹ بلند پاس، کی طرف چڑھتے گئے وادی غائب ہوتی گئی اور اونچی اونچی چوٹیوں کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ میں نے ان بیشمار قافلوں کے بارے میں سوچا جنھوں نے یہ راستہ طے کیا ہوگا۔ تاجر، فوجیں، بیرونی حملہ آور اور بادشاہ جو مزید دولت اور طاقت کی تلاش میں نکلے تھے۔ افغانستان کی طرف جانے والی یہ چوٹیاں تشدد اور کشت و خون کی کتنی کہانیاں سنا سکتی ہیں لیکن بلند پہاڑ خاموش تھے گویا اس راز کو چھپا رہے ہوں جو صرف اس دور کے فاتحین کو معلوم تھا۔

اس وقت سنگلاخ پلیٹو پر کیا منظر ہوگا۔ جب 326 قبل مسیح میں سکندر اپنی فوجوں کے ساتھ خیبر کے راستے دریائے کابل آیا تھا......اور بعد میں سیقیا کے باشندے جنہیں مقامی قبائلیوں، ہندی یونانیوں اور سقوں نے مغلوب کر لیا تھا۔ ''اس وقت کیا لگتا ہوگا۔؟'' میں سوچ رہی تھی جب قریباً دو سو سال بعد ڈیرئس نے اس کا محاصرہ کر لیا تھا اور وادیوں میں چھڑکاؤ کیا تھا اور صدیوں گزرنے کے بعد مسلمان حکمرانوں نے اپنے سپاہیوں کے ساتھ کامیاب حملے کیے اور پشاور میں جے پال کی فوجوں کو شکست دی۔ پھر بابر، جس کی رگوں میں چنگیز خاں کا خون گردش کر رہا تھا، ان پہاڑیوں پر آیا اور برصغیر میں سلطنت مغلیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس وقت کیسے نغمے گائے گئے ہوں گے جب خیبر بابر کے لڑکے کی رزمیہ موسیقی سے گونج رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایران کے مشہور آرٹسٹ میر سید علی اور عبدالصمد کو لایا تھا جنھوں نے تصویر کشی کے پہلے مغلیہ سکول کی بنیاد ڈالی اور جس کی اولاد نے ثقافتی احیاء میں مغلیہ فن مصوری کو ایک روایت کی حیثیت دے دی۔

دن سخت گرم تھا اور سورج تیزی سے چمک رہا تھا لیکن خیبر کی ٹھنڈی ہوا فضا میں خنکی پیدا کر

رہی تھی کبھی نہ بھولنے والا ماضی ہوا کی لہر کے ساتھ اٹھتا تھا...... پھر یکلخت گم ہو جاتا تھا جیپ سے اتر کر اپنے گائیڈ کے ہمراہ ہم پیچدار راستے کے ذریعے خیبر پاس کے ایک گاؤں میں پہنچے جو سڑک سے یوں ہٹا ہوا تھا گویا اس کا وجود ہی نہ ہو۔ پرانے زمانے کے دور میں گھڑ سوار بھی بغیر معلومات کے یہاں نہیں پہنچ سکتے تھے غاروں میں رہنے والوں کی طرح یہ لوگ بھی مٹی کے مکانوں میں رہتے ہیں چھپے ہوئے میدانوں اور ڈھلوان سڑکوں پر پہاڑیوں کے اندر ہر گاؤں ایک سا ہے جہاں مسجد محافظ کی طرح کھڑی ہے اس سارے منظر میں مسجد ہی ایک خوبصورت عمارت ہے جس کے مینار روشنی میں دور دراز دنیا کے گرجاؤں کے کلسوں کی طرح چمکتے ہیں۔

گول مٹول چہروں والے بچے کھیلتے ہمارے پاس سے گزرے وہ بے حد شرمیلے تھے اور جب ہمارے گائیڈ نے ان سے بات کی تو وہ ہنس پڑے اور والدین کی طرف مڑ گئے تاکہ تصویریں اتروانے کے لیے ان سے اجازت لے سکیں۔ ظاہر ہے کہ والدین بھی چاہتے تھے کہ ان کی تصویریں اتاری جائیں مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے تھا کہ میں ایک چھوٹے سے بچے کی اس کی بہنوں کے ساتھ تصویر اتار سکوں۔ اس میں ہر شخص شریک ہو گیا کیونکہ سیاحوں سے تصویریں اتروانے کا خیال بڑی اہمیت رکھتا ہے ان کے دور دراز گاؤں میں بہت کم سیاح آتے تھے اور یہ واقعہ ان کے لیے تاریخی حیثیت کا حامل تھا۔ ان کے شوق سے متاثر ہو کر میرے دوستوں اور میں نے سب کی تصویریں اتاریں......اور میں نے مخصوص کپڑوں میں بچوں کی (جو مجھے بے حد پسند آئے تھے) الگ سے تصویر اتار ہی لی۔ ہم نے انہیں مٹھائیاں دیں جس کی وجہ سے ہم سیاحوں کے بجائے دوست بن گئے تھوڑی ہی دیر میں ہمیں دیکھنے اور دعائیں دینے کے لیے تمام لوگ اکٹھے ہو گئے ہم خود کو خوش قسمت سمجھتے تھے کہ انہوں نے ہمیں قبول کر لیا تھا ورنہ وہ بے اعتنائی بھی برت سکتے ہیں۔

ہم مجبوراً فیاض پٹھانوں سے جدا ہوئے کیونکہ ابھی خیبر پاس کا بہت سا حصہ دیکھنے کو باقی تھا جو افغانستان کی سرحد تک جاتا ہے جب ہم چوٹی کے نزدیک پہنچے تو لوراگا نظر آنے لگا۔ خشک پہاڑ پر لوراگا پر فضا اور خوبصورت مقام ہے جہاں ہرے بھرے کھیتوں میں جھلمل جھلمل کرتے ندی نالے بہتے ہیں ہم نے سڑک کے کنارے گھاس پر بیٹھ کر کھانا کھایا جہاں سے ہم جدید دور کے قافلوں کو دیکھتے رہے جو اجناس جوتے اور دوسری تمام اشیاء لے کر کابل جا رہے تھے۔ گو آج کے

فاتحین خیبر پاس سے نہیں گزرتے، لیکن سرحد پر دونوں طرف سے آنے جانے والے تاجروں کی وجہ سے رونق رہتی ہے پاس کے سرے پر لنڈی کوتل کا قلعہ اس علامت کا مظہر ہے کہ پاکستان اپنے عوام کی قوت اور آزادی کے لیے ایک فصیل کی حیثیت رکھتا ہے قلعے پر لگا ہوا جھنڈا فخر سے فضا میں اڑتا ہے پاس کے دہانے پر خیبر رائفلز قلعہ جمرود ہے۔ یہ دونوں قلعے دنیا کے مشہور ترین پاس کی حفاظت کے پرامن مقصد پر کمربستہ ہیں...... عظیم خیبر...... ان تمام لوگوں کا راستہ جو دوستی کا ہاتھ بڑھائے آتے ہیں۔

سوات

جہاں تاجدار اور آپ بھی جا سکتے ہیں

ریاست سوات سیاحوں کو دوبارہ آنے پر اکساتی ہے گزشتہ قیام کی خوش کن یادیں ہمیشہ ذہن میں تازہ رہتی ہیں۔ بڑے عرصہ بعد میں سوات دوبارہ گئی خوابیدہ اور پرسکون ریاست میں اب زندگی کی نئی لہر دوڑ رہی تھی۔ اس کی وجہ سیاسی ہو سکتی ہے۔'' میں نے سوچا...... پرانا نظام بدل گیا ہے۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ یہاں انسانی دلچسپی کا عنصر بھی ہے جو دنیا کی تاریخ میں لکھا جا رہا ہے۔

یہ بات بالکل پریوں کی کہانی کی طرح معلوم ہوتی ہے لیکن یہ ایک سچی کہانی ہے ایک رات ایک حسین و نوجوان شہزادی درخت پر ایک گھونسلے کی طرح بنی چھوٹی سی کٹیا میں داخل ہوئی اور صبح ملکہ بن کر نکلی...... یہ برطانیہ کی موجودہ ملکہ الزبتھ تھی جس کی زندگی افریقہ کے جنگلوں میں سفر کرتے ہوئے کچھ سے کچھ ہوگئی۔ چند سال پہلے اسی طرح سوات کے شہزادہ کی جوان بیوی رات کو ایک عظیم جنرل کی سیدھی سادھی لڑکی کی حیثیت سے آرام کے لیے لیٹی۔ اگلی صبح جب وہ اٹھی تو وہ ملک کے نئے صدر کی مشہور لڑکی بن چکی تھی۔ میلوں دور کراچی میں، اس کے باپ نے جو اس وقت جنرل محمد ایوب خاں تھے، عنان حکومت سنبھال لی تھی اور پو پھٹنے سے پہلے منتشر قوم کے لیے نشان راہ بن گئے تھے۔

اسی لحاظ سے شروع سے سوات کی تاریخ بار بار بدلی ہے۔ ابتدائی بدھ دور سے، جب سوات، باغ کے نام سے مشہور تھا، ہر حکومت نے اس کے خزانوں میں اضافہ ہی کیا ہے اور مغربی پاکستان کے مقبول تفریحی مقامات میں شمال مغربی پاکستان کے خوبصورت علاقوں میں، سوئٹزرلینڈ کے الپس پہاڑوں کے پس منظر کے ساتھ سوات آثار قدیمہ کے لحاظ سے سب سے زیادہ مالا مال ہے اب سیاحوں کو پشاور سے نجی گاڑی کرایہ پر نہیں لینی پڑتی نہ دوستوں کی خوشامد کرنی پڑتی ہے کہ وہاں لے جائیں پلک جھپکنے کی دیر ہے اور جادوئی چراغ کے جن کی طرح ایک نئی سٹیشن ویگن سو میل لمبے پہاڑی راستے پر دوڑنے لگتی ہے اور چھ بالکل اجنبی مسافر راستے میں دوست بن جاتے ہیں۔

مستعد ٹریول ایجنسی ''صحرائی ٹریول سروس'' جو پشاور میں اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہے کے زیر انتظام روزانہ پشاور اور سوات کے درمیان سٹیشن ویگن آتی جاتی ہے یہ بہت عمدہ ہے اور کرایہ نہایت کم صرف پندرہ روپے میں گرد و غبار سے محفوظ آپ نہایت آرام کے ساتھ اپنی منزل مقصود کے دارالحکومت سیدو شریف جا سکتے ہیں کراچی کی ٹریول ایجنسی ایرایڈز (Aer-Aeds) کی گاڑیاں بھی یہاں چلتی ہیں سارے مسافر سیاح نہیں ہوتے سفر کے دوران میری ملاقات جہاں زیب کالج کے پرخلوص پرنسپل اور ان کے نائب سے ہوئی۔ ایک ٹیکسٹائل مل کے ڈائریکٹر اور سوات ہوٹل کے پرجوش قائم مقام منیجر میجر گلیلی بھی شریکِ سفر تھے میں واحد سیاح تھی سارا راستہ نہایت پرلطف گزرا، اکیلی عورت ہونے کی وجہ سے ہر سیاح مختلف مقامات پر میری چائے کے پیسے ادا کرنا چاہتا تھا۔ اس میں سڑک کے کنارے بکتے ہوئے تازہ اُبلے ہوئے انڈے اور گرم گرم نان بھی شامل تھے۔

راستے میں سرخ گالوں والے سواتی بچے آپ کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں اور ایسے تکتے ہیں گویا آپ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہوں۔ راستے میں ہم نے ہر شہر میں تعمیر ہوتے ہوئے نئے سکول بھی دیکھے۔ مجھے اپنا پچھلا سفر ابتک کتنا اچھی طرح یاد ہے ہم ایک پہاڑی کے دامن میں چھوٹی سی ندی کے کنارے ٹھہر گئے تھے کیونکہ میرا ساتھی کار کے سفر سے بیمار ہو گیا تھا میں نے چلو بھر کر دوست کے لیے پانی نکالا! ہمیں مشکل میں گرفتار دیکھ کر کچھ بچے نیچے اترے اور ہماری پیاس بجھانے کے لیے صاف شفاف پانی کی گھڑیا بھر کر لے آئے پھر بچوں کے ماں باپ آگئے اور ہم سے اپنے سادہ گھروں میں آرام کرنے اور چائے پینے پر اصرار کرنے لگے سوات کے یہ لوگ معمولی کسان تھے لیکن مہمان نوازی کا جذبہ تو دل میں پیدا ہوتا ہے یہی مہمان نوازی آج بھی پائی

جاتی ہے سکولوں کے بچے گزرتی کاروں پر پھولوں کی پتیاں پھینکتے ہیں اور آنے والوں کو دیکھ کر جوش وخروش کا اظہار کرتے ہیں جب سیاح سڑک کے کنارے اگے ہوئے خوبصورت پھولوں کو دیکھنے کے لیے رکتے ہیں تو بچے شرماتے ہوئے ان سے کہتے ہیں کہ وہ راستہ تو پوچھنا نہیں چاہتے۔

سیدو کو راستہ مالاکنڈ پاس کے ذریعے جاتا ہے نیلے آسمان کو منعکس کرتی ہوئی خوبصورت سڑک ہے راستے کے کنارے مکئی اور گیہوں کے ہرے بھرے کھیت ہیں۔ چاروں طرف ندی نالے اور جھرنے پھیلے ہوئے ہیں اور درختوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کا عکس آبشاروں پر پڑتا ہے۔

سیدو شریف میں دو ہوٹل ہیں مریان سیدھا سادا لیکن آرام دہ ہوٹل ہے اور ایک دن کا کرایہ کھانے سمیت سولہ روپے ہے سوات ہوٹل جہاں سو آدمیوں کے ٹھہرنے کی جگہ ہے بہت عمدہ ہے اور پرانی عظمت کے ساتھ جدید ترین آسائشیں مہیا ہیں تمام چیزوں کو ملا کر یومیہ کرایہ بائیس روپے سے شروع ہوتا ہے کھانے کے ساتھ سوات میں پیدا ہونے والے پھل دیئے جاتے ہیں رس سے بھرے ہوئے انگور، ناشپاتیاں اور سیب بے حد لذیذ ہیں اور ان کا جام بنا کر فروخت کیا جاتا ہے سوات کا شہد مشہور ہے اور ہر کھانے کی میز پر موجود ہوتا ہے سیاح ان کے مرتبان بھر کر ساتھ لے جاتے ہیں (شہد کی مکھیوں کے فارم دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں) ہوٹل کے دالان آرام دہ فرنیچر سے آراستہ ہیں اور سیاحوں کے بچوں کے کھیلنے کے لیے وسیع میدان ہیں شام کی چائے درختوں کے نیچے دی جاتی ہے جس پر کسی میلے کا گماں ہوتا ہے۔ آپ اجنبیوں کے ساتھ گپیں اڑاتے ہیں جو آپ کے دوست بن جاتے ہیں سوات رومان اور ماہ عسل منانے والوں کے لیے بہترین جگہ ہے۔ سواری کے لیے گھوڑے اور سیر کے لیے عمدہ سڑکیں ہیں اگر آپ سردیوں میں جائیں تو ہر کمرے میں چمنیوں میں چیڑ کی لکڑی جلتی ہے دھوئیں کی خوشبو اور شام کے وقت آگ کے سامنے بیٹھ کر بالکل ذاتی گھر کا سا لطف آتا ہے رات کا کھانا آپ کمرہ میں بھی کھا سکتے ہیں۔ یہاں مغربی اور پاکستانی دونوں طرز کے بہترین کھانے ملتے ہیں ہوٹل کی انتظامیہ ایک کلب بھی چلاتی ہے جہاں بیڈمنٹن، سکوائش، ٹینس اور گاف کھیلا جاتا ہے لمبے چوڑے میدان ہیں جہاں آرام کرنے سے سکون ملتا ہے آس پاس کے دریاؤں میں تیراکی اور مچھلی پکڑنے کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے سوات

ہوٹل کی کامیابی کا راز اس کے بورڈ کے سربراہ ریاست سوات کے پرجوش حکمران ہیں جو والی کہلاتے ہیں اپنے لڑکے شہزادہ اورنگ زیب (ریاست سوات کے ولی عہد) کے ساتھ دونوں مل کر ہوٹل کے انتظام میں ذاتی دلچسپی لیتے ہیں سوات میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل کرنا عام بات ہے ان کے دفتروں کے دروازے غریب ترین باشندوں اور سیاحوں کے لیے ہر وقت کھلے ہیں جو بغیر کسی اطلاع کے ملاقات کر سکتے ہیں۔ آنے والے کا پرتپاک استقبال کیا جاتا ہے اور مہمان کی چائے اور بسکٹ سے تواضع کی جاتی ہے۔

والی جن کا نام جنرل میاں گل عبدالحق جہاں زیب ہے بڑے منکسر المزاج انسان ہیں ریاست کے لوگ ان کے انصاف اور تنظیم کی بڑی قدر کرتے ہیں شہزادہ اورنگ زیب انتظامیہ میں ان کی مدد کرتے ہیں سوات کی موجودہ حکومت والی کے والد نے قائم کی تھی جو بادشاہ صاحب کہلاتے تھے بادشاہ صاحب نے اپنی جوانی میں تمام قبائل کو اکٹھا کر کے ان جنگجو دشمنوں کے ساتھ جنگ لڑی جو ذاتی مفاد کی خاطر سوات پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ سوات کے عوام نے 1917ء میں انہیں اپنا حکمران تسلیم کر لیا۔ برطانوی حکومت نے انہیں 1926ء میں تسلیم کیا۔ بادشاہ صاحب نے خود کو عوام کی تعلیم، ہسپتال اور دوسری ضرورتوں کے لیے وقف کر دیا۔ پہاڑوں پر نئی سڑکیں اور شاہراہیں بنائی گئیں۔ صنعتیں قائم کی گئیں جن سے ان لوگوں کو روزگار ملا۔ جن کا میلان زراعت کی طرف نہیں تھا۔ انہوں نے لوگوں میں نئی روح پھونک دی اور ان کے دور حکومت میں تجارت نے بڑی ترقی کی۔ 1949ء میں بادشاہ صاحب اپنے لڑکے (جو والی بن گئے) کے حق میں دستبردار ہو گئے آج کل وہ دارالحکومت کے بالکل نزدیک مرغزار میں سنگ مرمر کے محل میں اپنا وقت گزارتے ہیں۔ سیاح یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ کسی پارک میں ہیں اکثر ان کے باغ میں چلے جاتے ہیں اگر بادشاہ صاحب انہیں دیکھ لیں تو بلا لیتے ہیں چائے کے ساتھ دوستانہ باتیں ہوتی ہیں اور اس غیر رسمی ماحول میں فرحت ملتی ہے۔

یہی وہ جگہ ہے جو 1961ء میں اپنے بھارت و پاکستان کے دورے کے دوران ملکہ الزبتھ اور پرنس فلپ نے چار روز آرام اور سکون کے لیے پسند کی تھی۔ ملکہ سواتیوں کی گرمجوشی دیکھ کر فرط جذبات سے مغلوب ہو گئیں۔ وہ جہاں بھی گئیں لوگوں نے ان کی کار کو گھیر لیا اور پھول برساتے ہوئے خوش آمدید کے نعرے لگائے۔ ملکہ کے میزبان، والیٔ سوات، اپنی رعایا کو دیکھ کر ایک مشفق

باپ کی طرح دمک رہے تھے تکلف کو بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا اور ملکہ کا مختصر دورہ ایک گھریلو محفل کی طرح لگتا تھا۔

سوات کے پانچ لاکھ باشندے پٹھان نسل سے ہیں انہیں اسلام سے والہانہ وابستگی ہے اور انہوں نے اپنی سادہ طرز زندگی کو نہیں بدلا نئی چھوٹی چھوٹی ٹیکسیوں نے گھوڑا گاڑی اور بگھی کے ذرائع آمدورفت کو نیا رنگ دے دیا ہے۔ بگھیاں آج بھی سوات کی سڑکوں پر چلتی نظر آتی ہیں۔ موٹر سکوٹر، سائیکلیں اور ٹرانسسٹر ریڈیو اس بات کا ثبوت ہیں کہ کارخانوں اور ملوں نے سوات کی معیشت کو فروغ دیا ہے سوات ہوٹل سے آگے بڑھ کر جہاں زیب کالج علم کا مرکز ہے جہاں عربی اردو ادب اور اسلامیات اتنے ہی مقبول مضامین ہیں جتنے کیمسٹری سائنس اور بایولوجی۔ تقریباً چار سو طالب علم پاکستان کے کونے کونے سے اور زندگی کے ہر شعبہ میں یہاں آتے ہیں تعلیم مفت ہے۔ والی نے یہ کالج اسی مقصد کے لیے تعمیر کرایا تھا کہ مستحق نوجوان اعلیٰ تعلیم سے محروم نہ رہ جائیں کالج کے ہوسٹل میں کھانے اور رہنے کا خرچ صرف ایک روپیہ روزانہ ہے سوات کے پھولوں سے بھرے ہوئے باغات میں بیلوں سے ڈھکے ہوئے ہال شہری ترقی کا پتہ دیتے ہیں کالج کے پرنسپل خواجہ محمد اشرف سرحد کے منکسر المزاج آدمی ہیں جو ہر طالب علم میں ذاتی دلچسپی لیتے ہیں بہت سے سیاح جو کالج دیکھنے آتے ہیں یہ کہتے سنے گئے ہیں۔ ''کاش میں بھی سوات میں ایک بار پھر طالب علم بن جاتا۔''

اردگرد کے علاقہ میں اسلام پور بھی آتا ہے جہاں گاؤں کے لوگ کھڈیوں پر رنگ برنگ کپڑے اور پردے بنتے ہیں سوات میں سینکڑوں پنجابی رہتے ہیں جو سیدو شریف میں منگورہ ٹیکسٹائل انڈسٹریز میں کام کرتے ہیں مل میں معقول آمدنی کی وجہ سے سواتی اور پنجابی باہم مل جل کر رہتے ہیں سوات میں بڑے بڑے کارخانے دیکھ کر پاکستانی اور غیر ملکی دنگ رہ جاتے ہیں منگورہ مل میں پانچ سو سے اوپر لوگ ملازم ہیں شیشہ چڑھی کھڑکیوں کے ساتھ بجلی کے کرگھے چلتے ہیں جاپانی طرز کی مشینوں سے ریشمی کپڑے کے تھان کے تھان نکلتے ہیں۔ شفٹیں دن رات کام کرتی ہیں اور یہاں ہر اس شخص کے لیے کام موجود ہے جو کام کی تلاش میں ہے منگورہ مل کے ڈائرکٹر غفور صاحب، جن سے سوات کے سفر کے دوران میری ملاقات ہوئی، اپنا کارخانہ دکھاتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں ابتدا میں یہ کارخانہ لاہور میں تھا لیکن اچھی آب و ہوا اور والی کی اچھی

پیشکش نے غفور خاندان اور دوسرے سندھیوں اور پنجابیوں کو معہ ساز و سامان کے خوبصورت سوات آنے پر مجبور کر دیا جہاں ٹھنڈی ہوا اور خوشگوار دھوپ میں کام بآسانی ہو جاتا ہے سوات کی آب و ہوا تقریباً بے عیب ہے اور دور دور سے لوگ چھٹی منانے یہاں آتے ہیں مون سون ہوائیں سوات نہیں پہنچتیں۔ کوہ پیماؤں کے لیے یہ جنت ہے اور جلد ہی یہاں (اس کی انگ) کے ڈھلان بھی بن جائیں گے۔ حال ہی میں آسٹریا سے ''اس کی انگ'' کے ماہر پاکستان میں آسٹریا کے سفیر ڈاکٹر کولب کے زیر سرپرستی یہاں آئے تھے اور انہوں نے اس ملک کو ایشیا کے لیے سرمائی کھیلوں کا صدر مقام بنانے کے امکانات کا جائزہ لیا۔

ان ماہرین نے سوات میں جلام بابا میں (جسے ڈاکٹر کولب نے پہلے ہی سے منتخب کر رکھا تھا) میں کافی روز گزارے جہاں برف سے ڈھکی ڈھلانیں سخت تھیں اور چمکتی دھوپ میں اس کی انگ کرنے کا لطف آتا ہے آسٹریا کے یہ 'اس کی انگ' کرنے والے اتنے پرجوش تھے کہ پاکستان میں سرمائی کھیلوں کا منصوبہ مناسب ساز و سامان کے ساتھ آسٹریائی طرز پر شروع ہو چکا ہے ''اس کی انگ'' کرنے والوں کے لیے جلام بابا میں ایک ہوٹل ہوگا، اسکائی لفٹ (Ski Lift) ہوگی اور آسٹریا کے تربیت دینے والے ہوں گے۔ پاکستان کے ہمالیائی علاقہ کے لیے بھی اسی قسم کا منصوبہ زیر غور ہے دور دور سے آنے والے سیاح امریکی اور یورپی تفریح گاہوں کی طرح خطیر رقم خرچ کیے بغیر ایشیائی اور مشرقی میزبانی کا لطف اٹھائیں گے۔ ایک مسلم ملک میں اس کی انگ کی تفریح گاہ نسبتاً نہایت کم خرچ ہوگی۔

اس ملک کے خوبصورت پہاڑ اس مقام پر اتنے ہی کارآمد بن جائیں گے جتنی کسان کے لیے زرخیز زمین ہے۔ ہزاروں سال سے برف سے ڈھکی ہوئی ان چوٹیوں کو خوف سے دیکھا گیا ہے۔ کوہ پیما آہستہ آہستہ چوٹیوں پر پہنچتے تھے۔ پہاڑی جانوروں کا شکار ہوتا تھا......اب یہ (اس کی انگ) کی ڈھلانوں کا کام دیں گی اور سرمائی کھیلوں کے میدان کی حیثیت سے لطف اور اچھی صحت کا ذریعہ بنیں گی۔

والیٔ سوات کے تعاون کے ساتھ ریاست سوات میں سرمائی کھیلوں کا یہ نیا مرکز کافی عرصہ گفتگو کا موضوع بنا رہے گا......اس علاقہ میں ریسٹ ہاؤس بڑھ جائیں گے۔ یوں بھی سوات کے ہر گاؤں میں ریسٹ ہاؤس موجود ہے۔ مریان جو سیدو سے تقریباً تیس میل دور ہے کا منظر نہایت

دلفریب ہے۔ پانچ میل آگے بڑھ کر بحرین ہے جو چوٹیوں پر واقع ہے یہاں سے وادی میں بڑی بڑی آبشاروں سے برف کے گالوں کی طرح صاف شفاف پانی کے دھارے بہتے ہیں۔ یہاں ٹھہرنے کے لیے بے شمار جگہیں ہیں اور ایک رات کے لیے پانچ روپے دیکر آدمی ایسے ماحول میں سوسکتا ہے جو میٹرہورن کی یاد دلاتا ہے بدھ عمارات کے کھنڈرات ان لوگوں کو لبھانے کے لیے اب بھی کافی ہیں جنہیں آثار قدیمہ سے دلچسپی ہے پرانے زمانہ کی تہذیب کا کھوج لگانے کے لیے سوات میں اب بھی اکثر مہمات آتی رہتی ہیں۔ اکثر سونے کے زیورات اور قیمتی پتھر دستیاب ہوتے ہیں حال میں آنے والی اٹلی کی مہم نے قدیم دور کے قیمتی مجسمے اور ساٹھ سے زیادہ سٹوپوں کی کھدائی کی ہے۔

تازہ ترین دریافت پروفیسر سیوسپ توسی کی ہے گو پروفیسر کی مہم گزشتہ سات سال سے اس علاقہ میں کام کر رہی ہے لیکن پچھلا سال سب سے زیادہ سودمند ثابت ہوا ہے یہ دریافت ان لوگوں کے بارے میں بہت سی مزید معلومات بہم پہنچائے گی جو ہزاروں سال قبل وسطی ہند کے علاقہ میں رہتے تھے۔

محتاط اور سلسلہ دار کھدائیوں سے ان قبرستانوں کے کھنڈرات کا پتہ چلا ہے جو ہزاروں سال قبل مسیح سے پہلے کے خیال کیے جاتے ہیں اور اس دور سے پانچ سو سال پہلے کے ہیں جب ہندی یونانی گندھارا آرٹ عروج پر تھا۔

یہ نظریات ان برتنوں اور دوسری چیزوں کی دریافت پر مبنی ہیں جو سو سے اوپر اچھی حالت میں مقبروں سے نکلی تھیں۔ ٹبکارا کا مقدس علاقہ، جہاں مقبرے اور قبرستان پائے گئے ہیں۔ یہاں کے لوگوں اور ان کے رسم و رواج کے ارتقاء کا پتہ دیتا ہے پروفیسر توسی نے اس بات کی تکمیل تصدیق کی ہے۔

یہاں بہت سی ایسی چیزوں کے نشانات ہیں جنہیں دوسری تہذیبوں سے اختیار کیا گیا تھا یہ تہذیبیں اس دور سے قبل اور بعد میں موجود تھیں جواب آثار قدیمہ کی تحقیقات کا موضوع ہے یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ اس علاقہ میں قدیم لوگ آباد تھے اس بات کی شہادت ان چیزوں کے نقش و نگار سے بھی ملتی ہے جو آس پاس کے علاقہ اور مقبروں سے ملی ہیں بہت سے مقبروں سے جنہیں حال ہی میں کھودا گیا ہے عورتوں اور مردوں کی ہڈیاں برآمد ہوئی ہیں جس سے اس امر پر روشنی پڑتی

ہے کہ عورت مرد دونوں کو اکٹھا دفن کیا جاتا تھا۔ ایک اور مقبرے سے دو گھوڑوں کے ڈھانچے برآمد ہوئے ہیں۔

غالباً سب سے زیادہ دلچسپ دریافت وہ ایک جیسی بدھ عمارات ہیں جو ایک دوسرے کے اوپر بنائی جاتی تھیں۔

سوات کے شمال مشرق میں دریائے سندھ کی خوبصورت پہاڑی گھاٹی ہے نیچے کھیت سبز مخمل کی طرح چمکتے ہیں۔ بساؤ پاس، کنڈائی کرمانگ اور ڈوبر کی وادیاں ساڑھے چودہ ہزار فٹ بلند ہیں اور دھوپ اور سایوں سے ڈھکی ہوئی ہیں سیر کرنے والوں کے لیے یہ دلچسپ جگہ ہے اور سوات کی مقامی بس پر وہاں جانے کا لطف آتا ہے اس علاقہ کے متجسس اور خوش باش سواتیوں کو دوست بنا کر خوشی ہوتی ہے۔

سوات میں کسی بھی دن دریا کے کنارے سیر کرتے ہوئے آپ راستے میں برات دیکھ سکتے ہیں۔ اجنبیوں کو خوش کرنے کے لیے براتی رک جائیں گے اور آپ کو تصویریں اتارنے اور پردے میں ڈھکی ہوئی دلہن کو ایک نظر دیکھنے کی اجازت دے دیں گے وہ آپ کو معزز مہمان کی حیثیت سے اپنی خوشیوں میں شریک کرنے پر اصرار کریں گے اگر آپ ان کی دعوت قبول کر لیں تو چاروں طرف سے واہ واہ ہوگی اور ان کی آوازوں کا شور اتنا ہی لطیف ہوگا جتنا چودھویں کی رات کو ایک محبت بھرا گیت قدیم زائچوں کے مطابق کسی اجنبی کی شادی میں شرکت کرنا نہ صرف خوش بختی لاتا ہے بلکہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ کسی کنوارے مرد یا کنواری دوشیزہ کو مستقبل کا ساتھ مل جائے...... تفریح کی سرزمین سوات میں یہ بھی ممکن ہے۔

دلفریب گلگت

یاؤں کا محبوب اور دنیا بھر میں سب سے زیادہ بسیط و عریض پہاڑی علاقہ پاکستان
ئیں ہاتھ اوپر کونے میں دیکھا جا سکتا ہے۔
ے وسط میں گلگت ایجنسی ہے ندی نالوں میں گھرا یہ ایک بڑا سا گاؤں ہے جہاں تازہ
ور ہر بچہ مچھیرا ہے چڑیاں تمام دن (بلکہ رات گئے تک) چہچہاتی رہتی ہیں اور اوپر
ں اور مقامی لوگوں کے شکار کے لیے پرندے اڑتے رہتے ہیں کوہ پیما عموماً مہمات
ں آتے ہیں۔ نوجوان پر جوش، عرق ریزی کرنے، سردی سے ٹھٹھرنے اور میلوں چل
ر چڑھنے کے لیے تیار۔ یہ ایسا جذبہ ہے جو سخت کوش کوہ پیماؤں کو مغلوب کر لیتا ہے
قراقرم کی چوٹیوں پر پہنچتا ہے تو اس زمین کا باشندہ معلوم نہیں ہوتا۔
ڈی سے ہوائی جہاز کے ذریعہ گلگت کا اسی منٹ کا راستہ ہے پی آئی اے (PIA) کے
ند پرواز کرتے ہیں اور مسافر خوبصورت نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں مجھے
امل ہونے کے لیے کئی روز انتظار کرنا پڑا کیونکہ اس سفر کے لیے موسم بالکل صاف
ز رفتہ اونچے ہوتے ہوتے ہم سیدھے بلند پہاڑوں کی طرف جا رہے تھے جہاز کی
مری کھلونے نما مکانوں کا چھوٹا سا شہر معلوم ہوتا تھا، ایبٹ آباد اور مظفر آباد دھوپ
ے تھے پچیس منٹ کے اندر ہم بارہ فٹ سے زیادہ چڑھ چکے تھے اور برف سے ڈھکے
لہ کی طرف جا رہے تھے جس کی چوٹیاں مہیب دانتوں کی طرح دکھائی پڑتی تھیں جن
پڑ رہا تھا راستے ہی میں کہیں الگ تھلگ دھند سے گھرا ہوا ننگا پربت ایک نا قابل

تسخیر جنگجوئی کی طرح کھڑا تھا جو ازل سے پہرہ دے رہا ہو۔

نیچے زرخیز وادی کاغان پھیلی ہوئی تھی بابوسار کو جانے والا جیپ کا راستہ صاف نظر آ رہا تھا جو گرمیوں میں گلگت کو بیرونی دنیا سے ملاتا ہے تھوڑے فاصلہ پر پگھلتی ہوئی برف سے چمکتا ہوا سلسلہ قراقرم نظر آ رہا تھا۔ اب جیپ کا راستہ تاریکی میں کھونے لگا۔ یہ نظارہ کسی حد تک پرخوف تھا لیکن جلد ہی اس پر نانگا پربت غالب آ گیا جو دھوپ میں نہایا ہوا چمک رہا تھا۔ پھر فوراً ہی ہماری منزل مقصود، گلگت، نظر آنے لگا اور بادلوں میں ہمارا مختصر سفر ختم ہو گیا۔

کسی زمانے میں گلگت کا سفر بڑا جان جوکھوں کا کام تھا۔ اونچے دروں میں صرف تجارتی راستوں کے ذریعے کاروانوں کی صورت میں جایا جا سکتا تھا اور منزل تک پہنچنے میں مہینوں لگ جاتے تھے میں سوچ رہی تھی کہ یہ کتنی خوش کن بات ہے کہ گلگت نے خود اپنا انقلاب برپا کیا اور 1947ء میں مہاراجہ کشمیر سے الحاق کا جوا اتار پھینکا اور کس طرح پاکستان کی مدد سے سڑکیں تعمیر کی گئیں اور موسم کے مطابق روزانہ جہاز پرواز کرنے لگے گلگت کتنی خوب صورت اور دلفریب جگہ ثابت ہوئی۔

چاروں طرف سے عظیم ہمالیہ سے محیط، اس کے ہوائی مستقر کی دیواریں بلند برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ ہیں سمندر سے ڈھکی ہوئی کھاڑی کی طرح اس کا راستہ گھاس سے چھپا ہوا ہے اور نیلگوں آسمان کے مقابلے میں خوبصورت تضاد پیش کرتا ہے اس کو دیکھ کر مجھے کیلیفورنیا کا پام اسپرنگز (Palm Springs) یاد آ رہا تھا جہاں کھجور کے درخت، جنگلی پھول اور چھوٹے چھوٹے جھرنے پھیلے ہوئے ہیں اور گھڑسوار ریتلے راستوں پر جمع ہوتے ہیں۔

وزارت امور کشمیر سے اجازت نامہ حاصل کرنے والوں کی، جو محکمہ سیاحت کی وساطت سے بآسانی مل جاتے ہیں، عموماً پولیٹیکل ایجنٹ کی رہائش گاہ پر خاطر تواضع کی جاتی ہے۔

ان کا خوب صورت بنگلہ وسیع میدانوں کے درمیان بنا ہوا ہے اب سیاحوں کو نئے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کے لیے بھی عمدہ جگہ مل سکتی ہے، پہاڑیوں کے اردگرد چکر کاٹتا ہوا مچھلیوں کا تالاب ہے اور شاہ بلوط اور صنوبر کے درختوں سے گھری ہوئی صاف شفاف پانی کی نہر ہے خوبانی، سیب اور انجیر کے درختوں کے درمیان گیندے اور سرخ گلاب کے پھول خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں موٹے تازے چوزے ادھر ادھر گھومتے پھرتے ہیں اور درختوں سے گھرا ہوا سرسبز د

وسیع میدان دھوپ کھانے اور شام کو خنک ہوا میں چائے پینے کا لطف اٹھانے کی دعوت دیتا ہے گھر کے مالک جو پولیٹیکل ایجنٹ ہیں، مصروف زندگی گزارتے ہیں اپنے فرائض کے ساتھ جو ایک مقامی گورنر کے برابر ہیں وہ اپنا فالتو وقت گلگتیوں کی زندگی بہتر بنانے کے بارے میں سوچ بچار میں گزارتے ہیں اپنے پرائیویٹ سیکرٹری اور اسٹینوگرافر کے ساتھ مل کر وہ بے اندازہ کام کرتے ہیں آنے والے مہمانوں اور مہمات کی میزبانی اس کے علاوہ ہے وہ بڑے گرم جوش اور مخلص آدمی ہیں اور گاؤں کے لوگ اُسے اسی طرح محبت کرتے ہیں جیسے کوئی اپنے باپ سے کرتا ہے علاقہ کا جج اور مجسٹریٹ ہونے کے علاوہ لوگ اپنے ذاتی مسائل بھی لے کر ان کے پاس آتے ہیں جنہیں وہ کسی نہ کسی طرح حل کر دیتے ہیں ان کی موجودگی سے گلگت کی دلچسپیوں میں اضافہ ہوگیا ہے، کیونکہ ان کی دوستانہ طبیعت ہمہ گیر ہے۔

بازار کو جانے والے خم دار راستے پتھر کی منڈیروں پر گھرے ہوئے ہیں اور ندیاں گندم کے کھیتوں کو سیراب کرتی ہیں گاؤں کے لوگ پرخلوص ہیں اور اجنبیوں کے ساتھ ہمدردانہ برتاؤ کرتے ہیں بازار میں لومڑی کی کھالیں چار سے آٹھ روپے تک فروخت ہوتی ہیں مجھے اس پر یقین نہیں آتا تھا لیکن یہاں شکار عام کھیلا جاتا ہے اور شکار میں جانوروں کی کھالیں شامل ہیں ایک اور عجیب وغریب چیز یہاں کا بازار ہے میں سوچ کر حیران تھی کہ خوبصورت گھڑیاں اور تصویروں کے فریم کون خریدتا ہوگا جو ریشمی کپڑوں کے ساتھ اونچے اونچے ڈھیروں کی شکل میں رکھے رہتے ہیں ایک چینی تاجر مشرق بعید کے بنے ہوئے کمخواب بیچتا ہے درزی ایک دن کے اندر اندر کپڑے سی دیتے ہیں یہ لوگ سیاحوں سے معزز ترین شہریوں کا سا سلوک کرتے ہیں اور اجرت بھی بڑی معمولی ہے۔

چونکہ پولو کو قومی کھیل کی حیثیت حاصل ہے (پولو کی ابتدا اسی علاقہ سے ہوئی تھی) اس لیے آپ کے پاس ایک جوڑا جودھ پوری کا بھی ہونا چاہیے جو عموماً عجلت میں سیا جاتا ہے درزی قصے کہانیوں کے کردار معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے سلے ہوئے کپڑوں سے برطانوی اور بونڈ اسٹریٹ کا قدیم رنگ جھلکتا ہے برطانوی دور کی کچھ چیزیں یہاں ابھی باقی ہیں عیسائیوں کا قبرستان ہے جس کی نگہداشت کی جاتی ہے اور کائی سے ڈھکے ہوئے کتبوں کے ساتھ یہ پھولوں کی سیج معلوم ہوتا ہے۔

گلگت کی لائبریری کے دروازوں کے گرد گلاب کے پھول اُگے ہوئے ہیں ایک میدان کے وسط میں جہاں ہر شام ٹینس اور کرکٹ کھیلی جاتی ہے۔ لائبریری پرانے انداز کے برآمدے کی طرح ہے جہاں گدے دار کرسیاں پڑی ہیں اور میزیں لوگوں سے بھری رہتی ہیں آپ کوئی کتاب لینے جاتے ہیں لیکن انتخاب کرتے ہوئے عہد رفتہ میں کھو جاتے ہیں یہ بڑا خوش کن تجربہ ہے لوگ یہاں گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں اور خوش الحانی کے ذریعہ زمانہ خال سے وابستہ تاریخ پڑھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔

گھڑ سواری یہاں بے حد مقبول ہے ہوائی اڈے کو جاتے ہوئے گرد آلود سڑکیں اور بے شمار ندی نالے پڑتے ہیں خنک شام میں سیاح اور مقامی لوگ میلوں لمبی سیر کو نکل پڑتے ہیں راستے کے دونوں طرف اونچے اونچے درخت ہیں اور گھوڑے دلکی چال چلتے ہیں نیلگوں دریا میں مچھیرے رہو پکڑنے کے لیے جال ڈالتے ہیں جو گلگت میں بہت مشہور ہیں شام ہونے پر موذن کی آواز سنائی دیتی ہے اور لوگوں کو عبادت کی طرف بلاتی ہے روشنیاں مدھم ہو جاتی ہیں اور دکانیں بند ہو جاتی ہیں گلگت کے لوگ سویرے سونے اور پو پھٹے اٹھنے کے عادی ہیں یہاں زندگی بالکل سادہ ہے......لوگ اسی طرح رہنا پسند کرتے ہیں

اس کے باوجود گلگت میں آج کل زندگی کی نئی لہر دوڑتی ہے......پنیال، گوپیز، نگر اور ہنزہ کو جانے والے راستوں پر سمتوں کے نشانات لگائے گئے ہیں اس کے علاوہ چنار باغ ریسٹ ہاؤس جانے والی سمت میں بھی خوشنما نشانات لگائے گئے ہیں یہاں سیاح پانچ روپیہ یومیہ دے کر قیام کر سکتے ہیں چنار پارک ایک وسیع پارک کی طرح ہے جہاں تیرنے کا تالاب، سرسبز میدان اور چاروں طرف درخت اور پھول ہی پھول ہیں اس کے وسط میں ان بہادروں کی یادگار تعمیر کی گئی ہے جنہوں نے گلگت کو بیرونی حملہ آوروں سے بچانے کے لیے اپنی جانیں قربان کیں یہ علاقہ گلگت کے سکاؤٹس (Gelgit Scaout) کے تصرف میں ہے اور وہ اس کے وسیع میدانوں میں اکثر میلے منعقد کرتے ہیں جن میں تمام سیاحوں کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے چنار باغ کے قریب ایک جدید ریسٹ ہاؤس حال ہی میں تعمیر کیا گیا ہے اس صاف ستھرے ریسٹ ہاؤس میں خوبصورت برآمدے اور الگ الگ غسلخانے ہیں تمام سہولتوں کے باوجود کرایہ صرف بارہ روپیہ یومیہ ہے اور نہایت ارزاں نرخ پر بڑا لذیذ کھانا ملتا ہے سیاح یہاں بے فکری سے دن گزار سکتے

ہیں اگر کہیں جانے کو دل نہ چاہے تو سارا دن سرسبز میدانوں میں بیٹھے رہیں یا شام کو پولو دیکھیں جو اس علاقے کا محبوب ترین کھیل ہے۔ بچوں کے سکول بھی قابل دید ہیں اگر آپ کے دانت میں درد ہو یا گلے میں خراش تو گلگت ہیلتھ ایجنسی سے استفادہ کیجئے جہاں طبی امداد مفت دی جاتی ہے اور بالکل خاندان کے فرد کی طرح نگہداشت ہوتی ہے گلگت کے لوگوں کو ہر طرح کی طبی سہولتیں میسر ہیں خوشنما ہسپتال میں بڑے بڑے ہوادار برآمدے بنائے گئے ہیں۔

باغبانی، کھیتی باڑی، جانوروں کا شکار، مچھلی کا شکار، شہد کی مکھیاں پالنا اور کپڑا بننا گلگت کے لوگوں کے ذریعۂ روزگار ہیں حال ہی میں دیہی ترقیاتی پروگرام نے گلگت میں شاندار نتائج پیدا کیے ہیں سنگ مرمر اور بھورا پتھر یہاں بے اندازہ پایا جاتا ہے پہاڑوں میں پائے جانے والی چند معدنیات نے بھی دیہاتی ترقی میں مدد دی ہے سڑکوں اور عمارات کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے ایک زراعتی افسر سات بڑے فارموں اور پھلوں کی نئی نرسری کا نگران ہے یہاں ریشم کے کیڑوں کی پرورش بھی شروع کر دی گئی ہے اور زیادہ سے زیادہ زمین کو زیر کاشت لانے کے لیے نئی نہریں بنائی گئی ہیں تاکہ یہ علاقہ اناج کے معاملے میں خود کفیل ہو سکے۔

اس علاقہ میں پہلی بار حال ہی میں مرغیوں کا فارم قائم کیا گیا ہے جہاں لوگوں کی تمام ضروریات پوری کی جائیں گی اور انہیں انڈے اور سرخ روڈ آئی لینڈ سفید لیگ ہارن اور دوسری اعلیٰ قسم کی مرغیوں کے چوزے فراہم کیے جائیں گے دور کے علاقوں میں رہو مچھلیوں کی پرورش گاہیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں ہر چیز کو دیکھ کر گلگت کی ترقی کا احساس ہوتا ہے دیہی ترقیاتی پروگرام کا بنیادی مقصد لوگوں میں اپنی مدد آپ کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ اس کے نتائج حیران کن ہیں مثال کے طور پر دریائے گلگت پر بارگو پل، معماروں کی اجرت کو چھوڑ کر، بارگو کے لوگوں نے نہایت کم وقت میں خود ہی تعمیر کیا ہے گلگت کے وسط میں واقع یہ عظیم پل گلگت کو ہنزہ اور نگر ریاستوں کو جانے والی سڑک سے ملاتا ہے اس سادہ گھاٹی میں یہ ایک جدید سہولت ہے گوپیترا شکومان، یاسین اور استوار کے علاقے (جہاں گلگت سے چند گھنٹوں میں پہنچ سکتے ہیں) شکاریوں کے لیے جنت ہیں تعلق اور مارخر ہر طرف پھرتے ہیں چیتے اور ریچھ دبے پاؤں چلتے ہیں اور دنیا کے کونے کونے سے شکاری یہاں شکار کے لیے آتے ہیں۔

چونکہ اسکردو کی طرح گلگت بھی اونچے پہاڑوں اور خطرناک دروں سے گھرا ہوا ہے اس

لیے ڈاک کی تقسیم یہاں ہمیشہ سے سست رہی ہے بلکہ ملک کے دوسرے حصوں سے یہاں ڈاک پہنچنے میں دس بارہ دن لگ جاتے تھے اور اگر برفباری ہو جائے تو اور بھی زیادہ عرصہ لگتا۔ پچھلے چند سالوں سے محکمہ ڈاک نے ایک خاص طیارہ کا انتظام کیا ہے جو روزانہ ڈاک لاتا اور لے جاتا ہے اس علاقہ کے کونے کونے میں کس طرح ڈاک بھیجی جاتی ہے یہ تقریباً ایک معجزہ ہے اور ہمت و استقلال کی کہانی ہے۔

راہداری کا عرصہ اب دنوں کے بجائے چند گھنٹے رہ گیا ہے ڈاک کے خرچ میں اضافہ کے بغیر جب سے یہ خاص طیارے چلنے شروع ہوئے ہیں علاقہ میں اور زیادہ طمانیت آ گئی ہے دوستوں یا عزیزوں کی طرف سے آیا ہوا خط ایسی خوشی بخشتا ہے گویا وہ آپ کے پاس موجود ہوں۔ اس سہولت کو بہت سراہا گیا ہے۔

اس علاقہ کے قدیم خطرناک دروں میں ڈاکیہ نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے اس کا کام بے حد مشکل ہے مضبوط توانا اور محتاط ڈاکیہ پہاڑیوں اور گھاٹیوں پر چڑھتا ہے دروں میں سے گزرتا ہے پانی میں چلتا ہے اور وقت پر اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے اس کا کام قوت برداشت ہمت اور ذاتی دلچسپی کا مظہر ہے وہ تمام اسکردو اور گلگت ایجنسی کو پاپیادہ طے کرتا ہے اکثر وہ چائے پینے اور لوگوں سے بات چیت کے لیے ٹھہر جاتا ہے اور انہیں پہاڑ کے دوسری طرف رہنے والے ان کے عزیزوں کی خیریت سے آگاہ کرتا ہے ڈاکیہ کا ہمیشہ خیر مقدم کیا جاتا ہے۔

مقامی لوگ سیاحوں کی خوب آؤ بھگت کرتے ہیں اور وہ کہیں بھی ہوں ٹیلیفون کال کی اطلاع انہیں مل جاتی ہے خواہ انہوں نے کسی سے ذکر بھی نہ کیا ہو۔ لیکن سارے شہر کو علم ہوتا ہے کہ وہ کس کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں گو یہ بات عجب سی لگتی ہے لیکن گلگت میں یہ بالکل قدرتی ہے غروب آفتاب کے وقت گلگت کی چوٹیاں آگ کی دیوار معلوم ہوتی ہیں اور جب وادی میں رات بسیرا ڈالتی ہے تو ایک ازلی سکون پہاڑیوں کو اپنے دامن میں لپیٹ لیتا ہے ستارے ایک ایک کر کے نمودار ہوتے ہیں اور قمقموں کی طرح آسمان پر جھلملانے لگتے ہیں گلگت میں مسرت وانبساط ایسی چمک کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں جو تاروں بھری رات میں ہر مکان میں پہنچتی ہے۔

پنیال پریوں کا دیس

پنیال اور گوپیز کے راج آپس میں قرابت دار ہیں اور چچا اور بھتیجوں کی حیثیت سے ایک دوسرے کے اتنے ہی نزدیک ہیں جتنے جڑواں بچے جو ایک دوسرے کی جدائی گوارانہ کرسکیں لیکن ذاتی برتری کی خاطر وہ شکاریوں کی طرح ایک دوسرے کے حریف بن جاتے ہیں ہر ایک اپنے آپ کو دوسرے سے بہتر میزبان سمجھتا ہے میری ذاتی رائے میں دونوں یکساں طور پر خوش اخلاق ہیں اور اپنی پہاڑی ریاستوں میں ایسی میزبانی کرتے ہیں کہ ان پرفضا علاقوں کو پریوں کی سرزمین کہا جاسکتا ہے۔

چونکہ گلگت سے جاتے ہوئے ان خوبصورت علاقوں میں سے پنیال پہلے پڑتا ہے اس لیے پریوں کی سرزمین کے نام پر اس کا پورا پورا حق ہے پیٹر پین بھی اس کی پوری تائید کرے گا، سچ پوچھیے تو یہ دیو مالائی چھوٹا بچہ (جو جہازوں سے بھی پہلے اڑتا تھا) پنیال میں گھر کا سا سکون محسوس کرے گا۔ پنیال دنیا کی چھت پر قدرت کے لگائے ہوئے باغیچے کی طرح ہے پھلدار درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں پر سورج چمکتا رہتا ہے اور یہ چمک آپ پر غالب آجاتی ہے اگر آپ وہاں موجود ہوں تو بھی آپ کو بمشکل یقین آئے گا کہ یہ سب کچھ حقیقی ہے۔ یہ تو ایک واہمہ ہے جس نے زندگی کا روپ دھار لیا ہے، گویا کسی جادوگر نے اپنی چھڑی ہلائی ہو اور انسانوں کو اس اجنبی کائنات میں لا ڈالا ہو اور پھر ہمالیہ کے وسط میں اپنی ٹوپی سے نکال کر اس دنیا کو ایک پہاڑی سلسلہ میں چوٹیوں کے درمیان ٹانگ دیا ہو۔ یہ ساحر خدا ہے جس نے مغربی پاکستان کو سلسلۂ قراقرم کی صورت میں چوٹیوں اور برف کے تودوں کا عظیم ترین تحفہ بخشا ہے جس نے انسانی آنکھ کو متحیر کر رکھا

ہے۔ مقامی لوگ پرخلوص اور سیدھے سادے ہیں اور قدیم لیکن خوبصورت ماحول میں عام پتھروں اور سنگ مرمر کے بنے ہوئے مکانوں میں رہتے ہیں۔ یہ پتھر پہاڑوں سے کاٹ کر لایا جاتا ہے۔ راجہ جان عالم یہاں کے حکمران اور گورنر ہیں اور رحم دلی سے ایسی تہذیب میں عدل وانصاف کرتے ہیں جو بالکل ان کی اپنی ہے، جہاں لوگوں کو روٹی مرغوب نہیں اور پولو ان کا پسندیدہ ترین کھیل ہے۔

گلگت میں مجھ سے ملنے والے وہ سفیر اور سیاح جو یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے ہر چیز دیکھ رکھی ہے وہ بھی ریاست پنیال کی خوبصورتی دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ ہر ایک نے اقرار کیا کہ اس زرخیز زمین پر قدم رکھنے سے پہلے وہ اس قدر دلچسپ اور حیران کن تجربہ کی ہرگز توقع نہیں رکھتے تھے۔

میرا پنیال جانا بالکل اتفاقی تھا۔ گلگت میں سفر کرتے ہوئے جہاں سے پنیال کو راستہ جاتا ہے، میری ملاقات راجہ حسین علی خاں سے ہوئی جو گوپیز کے حکمران ہیں۔ ہم دونوں گلگت کا خوبصورت ہسپتال دیکھ رہے تھے۔ جہاں بیماروں سے معزز مہمانوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے اور طبی امداد بالکل مفت ہے۔ انہوں نے میری سگریٹ سلگانے کے لیے ماچس جلائی جو تیز ہوا میں فوراً بجھ گئی۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو پیالے کی شکل دے کر ان کے ہاتھوں پر رکھ لیا۔ یہ ترکیب کامیاب رہی! وہ حیران رہ گئے، گھبرا کر تھوڑے سے ہکلائے اور سر کو خم دیتے ہوئے مسکرا کر کہا ''مادام'' میں دوائیاں لینے کے لیے پنیال روانہ ہونے والا ہوں جو یہاں سے صرف پینتیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ پنیال کا حکمران راجہ جان عالم جو میرا عزیز بھتیجا ہے، امریکی سیاحوں کی صحبت سے بہت لطف اندوز ہوتا ہے۔ میری جیپ میں جگہ ہے...... کیا آپ میرے ہمراہ تشریف لے چلیں گی؟ میں سوچ میں ڈوب گئی۔ پتلا دبلا راجہ پچاس کے پیٹے میں تھا اور ہنری ہشتم سے بھی زیادہ خوبصورت تھا۔ تقریباً دو گھنٹہ بعد میں جیپ میں بالکل راجہ سے لگی۔ بکسوں، ڈبوں، راجہ کے محافظ اور یونانی نسل کے قبائلی ڈرائیور سے گھری بیٹھی تھی۔ اگلے چار گھنٹوں میں سلسلۂ قراقرم میں ہمیں جس خطرناک راستہ پر سفر کرنا تھا اس کے بارے میں نہ کچھ راجہ نے بات کی نہ ڈرائیور نے۔ گفتگو کا رخ عہد رفتہ کے گھڑ سواروں اور آجکل کے گھوڑوں، خچروں اور پیدل چلنے والے قافلوں کی طرف بدل گیا۔

شام کی دھند میں برف پوش چوٹیاں چھپ گئیں جو عموماً گلگت روڈ پر وادی سے نظر آتی ہیں۔ آندھیوں میں گرے ہوئے بڑے بڑے پتھر تند رو دریائے گلگت کو پار کرتے ہوئے ہمارے راستہ میں پڑے تھے۔ وادی میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پانچ میل گزر گئے۔ ہم عظیم پہاڑوں

سے گھرے ہوئے تھے۔ دیوہیکل محافظوں کی طرح ایک ایک چوٹی سامنے آتی تھی۔ یہ دوسرے پہاڑی سلسلوں سے بالکل مختلف تھا کیونکہ قراقرم میں بیس ہزار فٹ بلند پہاڑ تو کوئی معنیٰ ہی نہیں رکھتے۔ یہاں بہت سی چوٹیاں ہیں جو اس سے کہیں اونچی ہیں۔ یہ راستہ کے دونوں طرف پتھروں کے ڈھیر تھے۔ پھر نخلستان کی طرح ہمارے سامنے اچانک جنگلی پھول، اونچے اونچے درخت اور جھلمل جھلمل کرتی ندیاں آ گئیں جیسے جیسے ہم خمدار راستوں پر چڑھتے اترتے گئے یہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوتے گئے۔ اگلے دس میل میں نے زیرِلب دعا مانگتے ہوئے گزارے کیونکہ ہم کھائیوں کے اوپر چل رہے تھے جن کے کنارے بالکل سیدھے کٹے ہوئے تھے اور نیچے سینکڑوں فٹ گہرے کھڈ تھے۔ ہمارا ماہر ڈرائیور گاڑی کو رسے پر چلنے والے آدمی کی طرح سنبھالے ہوئے تھا۔ راستہ کی خوبصورتی نے میرے نامعلوم جذبۂ خوف کو کسی قدر معدوم کر دیا تھا اس سماواتی راستوں پر چلنے کی خوشی میں دنیا کے سارے جھگڑے معدوم ہو گئے تھے۔ رفتہ رفتہ راستہ ہموار ہوتا گیا اور بےشمار جھلمل جھلمل کرتی آبشاریں یوں لگتی تھیں گویا پہاڑوں کی دیواروں پر تصویریں بنا دی گئی ہوں۔ زمین کی کونسی چیز ہم تک پہنچ سکتی تھی؟ جب پیاس لگی تو ہم نیچے اتر گئے جہاں چمکتے ہوئے پتھروں پر ایک ندی بہہ رہی تھی ہم نے جی بھر کر برف جیسا ٹھنڈا پانی پیا جو سونے سے بھی زیادہ بیش قیمت تھا۔ تازہ دم ہو کر ہم چل پڑے اور ہمارا سفر تین گھنٹے بعد ایک دریا کے کنارے ختم ہوا جو سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ دریا کو عبور کرنے کے لیے ہمارے لیے دو طریقے تھے۔ بانسوں کے بیڑے پر بیٹھ کر یا پھر رسیوں کے پل کے ذریعے دونوں طرح ہم دوسری طرف پنیال کے صدر مقام شرقیلا پہنچ سکتے تھے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ مجھے تین فرلانگ لمبے رسیوں کے پل پر رینگ کر دریا پار کرنا پڑے گا۔ یہ کام پُرلطف لیکن ساتھ ساتھ خطرناک بھی تھا اور مجھ جیسی شہری کے لیے بہت ہمت کا کام۔

راجہ ہمارا انتظار کر رہے تھے وہ طویل قامت، گورے چٹے، دبلے پتلے اور سکندرِ اعظم کی نسل سے ہیں۔ انہوں نے گوپیز کے راجہ سے بغلگیر ہو کر اور مجھے کندھے پر تھپتھپا کر ہمارا خیر مقدم کیا ہم کسی جاگیردارانہ ریاست میں تھے۔ کیونکہ ہمارے پہنچنے پر لوگ سڑک کے دونوں طرف جمع ہو گئے اور دونوں راجاؤں کے سامنے کورنش بجالائے اور ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا پھر میرے سامنے تعظیم سے جھکے۔ تمام آنے والوں کا اسی طرح استقبال کیا جاتا ہے۔ نیلی آنکھوں والے لمبے تڑنگے

لوگوں کی مسلم ریاست میں یہ استقبال پرانے طریقوں کے عین مطابق تھا۔ دوسرا استقبال اور بھی حیران کن تھا۔ ایک پہاڑی پر چڑھ کر ہم میدان میں پہنچ گئے جس کے راستہ میں قبرستان پڑتا تھا آنے والوں کے لیے یہ اچھا خاصا تکلیف دہ نظارہ تھا لیکن پہاڑی علاقوں میں زندگی اور موت کو بھی عام چیزوں کی طرح لیا جاتا ہے۔ ہر قبر کے اوپر ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی (تاکہ کوئی گھومتا پھرتا فقیر بیٹھ کر آرام کر سکے، قبروں پر پھول تھے نہ ان کے سرہانے کتبے۔ قبرستان سے چمکتا دریا نظر آتا تھا یہ شاید اس نظریہ کا مظہر ہے کہ اس جہاں سے رخصت ہونے والے ان دریاؤں کا شور سن سکیں جہاں کبھی وہ مچھلیاں پکڑا کرتے تھے۔

ایک صحن کے پار ہمیں مہمان خانے میں لیجایا گیا میں پتھر کے ایک عظیم الشان بنگلہ میں تھی جو خوبصورت باغ کے وسط میں تھا۔ یہ بنگلہ ایک بیڈ روم، جہاں دیوان پڑے ہوئے تھے۔ برآمدے اور غسل خانے پر مشتمل تھا اور چاروں طرف پھول ہی پھول تھے۔ کرسیوں کی پشت اور کارنس پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی دیواریں بھی پھولوں سے سجی تھیں۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ پنیال کے لوگ مردوں کی نسبت زندہ لوگوں کے لیے پھول لازمی سمجھتے ہیں۔ آتشدان میں لکڑیوں کا ڈھیر لگا تھا تاکہ شام کو سردی دور کرنے کے لیے آگ جلائی جا سکے۔ کھڑکیوں میں سے درختوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑ نظر آتے تھے۔ یہ منظر اتنا حیران کن تھا کہ وقت بےمعنی ہو کر رہ گیا تھا۔ شام ہونے سے پہلے غسل اور گرم چائے زیادہ ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ پنیال میں بجلی نہیں ہے لیکن آتشدان اور لیمپ کی روشنی دل کو بھاتی ہے۔ کھانے کی گھنٹی بجنے پر ہم سب راجہ کے سادگی سے سجے ہوئے محل میں جمع ہوئے کھانا دیکھ کر میں حیران رہ گئی مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی مصالحوں سے تلی ہوئی اتنی عمدہ مچھلی، گوشت اور چاول کھائے ہوں۔ پتوں اور سرخ ٹماٹروں کا عمدہ سلاد تھا۔ پنیال کے لوگ روٹی کی جگہ مکئی کے موٹے موٹے کیک بناتے ہیں جو بےحد لذیذ ہوتے ہیں اور کئی اقسام کا سالن ہوتا ہے دودھ بیحد گاڑھا ملتا ہے کیونکہ پنیال میں گائیں بےشمار ہیں۔ تمام اجناسِ خوردنی یہاں پیدا ہوتی ہیں اور دھوپ اور سرسبز چراگاہوں میں پلنے والی گائیں بھینسیں خوب ہٹی کٹی ہوتی ہیں۔ کافی پیتے ہوئے راجہ کی بیحد خوبصورت، سرخ و سفید گھنگھریالے بالوں والی بیٹی کو جس کی حال ہی میں اپنے چچازاد بھائی سے شادی ہوئی تھی ہمارے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ صرف اردو اور کشمیری زبان جانتی تھی لیکن لفظ اس کے حسن کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ وہ بہت کم عمر معلوم

ہوتی تھی۔۔ اس کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ پنیال میں کم عمری میں ہی شادی کرنے کا رواج ہے۔ شادی کے وقت بیشتر دلہنوں کی عمر بارہ سال ہوتی ہے اور دولہا اٹھارہ بیس کے لگ بھگ ہوتے ہیں۔ پنیال میں دلہنوں کو جہیز نہیں دیا جاتا۔ جیسا کہ پاکستان کے دوسرے علاقوں کا رواج ہے۔ اس کے برعکس دولہا گھر والوں کو برتن اور کپڑے پیش کرتا ہے۔ راجہ کی لڑکی اپنے دور کی نمائندہ تھی۔ شادی کرنا اور بچے پیدا کرنا ان کی زندگی میں اہم ترین کام ہے۔ شادی کی رسم ادا ہونے سے پہلے دولہا دلہن ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ قریبی رشتہ دار ہونے کے باوجود وہ مختلف ریاستوں میں رہتے ہیں اور انہیں آپس میں ملنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ والدین نزدیکی عزیزوں میں رشتہ کا انتخاب کرتے ہیں تاکہ زرخیز زمینیں خاندان میں ہی رہیں۔ یہ رواج اتنا راسخ ہے کہ کوئی اور طریقہ اختیار نہیں ہوسکتا۔ حیرت انگیز طور پر بیاہتا جوڑے عموماً خوش وخرم رہتے ہیں کیونکہ دلہن ایک اہم شخصیت بن جاتی ہے اور گھر کی مالکہ ہوتی ہے۔

راجہ جان عالم جدید دور کے آدمی ہیں انہیں بیٹری سے چلنے والے ریڈیو اور ادب سے رغبت ہے اور اپنے ریڈیو ٹیلیفون سے لطف اٹھاتے ہیں جس کے ذریعے علاقہ کے صدر مقام گلگت سے رابطہ قائم ہے۔ وہ صرف ایک شادی کے قائل ہیں۔ اس زمانہ میں ان کی بیوی دو تین پہاڑ پرے اپنے رشتہ داروں سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ ان سے ملنا تو نہ ہوسکا لیکن ہمیں معلوم تھا کہ وہ بالکل جوان ہے۔ راجہ نے ہمیں بتایا کہ شادی کے وقت ان کی بیوی کی عمر صرف چودہ سال تھی۔

اس رات عرصہ بعد پہلی بار میں بالکل بچوں کی طرح سوئی۔ پہاڑوں کی خنک ہوا میں شراب یا خواب آور گولیوں کے بغیر ہی نیند آجاتی ہے۔ ناشتہ کی میز پر چیزوں کا انبار ہوتا ہے۔ مہمانوں سے امید کی جاتی ہے کہ وہ کم از کم تین بڑے بڑے انڈے خوبانیاں، گرم گرم دلیہ اور گوشت کا ایک ٹکڑا ضرور کھائیں گے۔ راجہ صاحب چاہتے ہیں کہ لوگ خوب موٹے تازے ہو جائیں۔ ناشتہ کے دوران چند نوجوان لڑکیاں آئیں اور ہمارے سفر کے گرد آلود کپڑے لے گئیں۔ ابھی میں نے تھوڑا سا پھل اور دو انڈے ہی کھائے تھے کہ ہمارے میلے کچیلے کپڑے بالکل بے داغ اور عمدہ استری ہوکر واپس آگئے۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکی کہ یہ کس طرح ہوا۔ شاید مناسب یہی ہے کہ اس پر غور نہ کیا جائے اور صرف مسکرا کر شکریہ ادا کر دیا جائے۔

ناشتہ کے بعد راجہ حسین علی خاں اور میں مقامی عدالت کی کارروائی دیکھنے چلے گئے جو

نزدیک ہی صحن میں ہو رہی تھی۔ بالکل غیر رسمی انداز میں ایک شخص پر پڑوسی کی بیوی پر ڈورے ڈالنے کے الزام میں مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ وہ ان کے گھر ہمیشہ اس وقت جاتا تھا جب خاوند باہر ہوتا تھا وہ کسی دست درازی کا مرتکب نہیں ہوا کیونکہ بچوں نے بھی اس بات کی گواہی دی کہ جب بھی ان کا پڑوسی آتا تھا ان کی ماں تنہا نہیں ہوتی تھی۔ بچوں نے اتنا ضرور بتایا کہ وہ بڑے میٹھے الفاظ میں باتیں کرتا تھا جو ان کے لیے بالکل انوکھے تھے۔

راجہ جان عالم نے ملزم کا بیان سنا۔ ''مجھے اپنی بھیڑوں کے بارے میں مشورہ کی ضرورت تھی میں صرف عورت کے خاوند سے ملنے جاتا تھا مگر وہ ہمیشہ باہر گیا ہوا ہوتا تھا۔'' راجہ نے اسے تنبیہ کی کہ بھیڑوں کے بارے میں مشورہ وہ کھیتوں میں لے۔ اپنے پڑوسی کے باورچی خانے میں نہیں۔ اس پر بیس روپے جرمانہ کیا گیا اور پابندِ امن کر دیا گیا۔ ہر شخص مسکراتا ہوا رخصت ہوگیا۔

پنیال میں جیلیں نہیں ہیں۔ یہاں چور اِکا دکا ہی نظر آئے گا۔ راجہ رحمدلی سے عدل و انصاف کرتے ہیں اور مجرموں کو زیادہ سے زیادہ تیس روپے جرمانہ کرتے ہیں۔ پندرہ ہزار نفوس کی آبادی میں کبھی کبھار قتل بھی ہو جاتا ہے (جو عموماً جذباتی اشتعال کا نتیجہ ہوتا ہے) لیکن شاذ و نادر اور قاتل کو گلگت بھیجا جاتا ہے۔ جہاں پولیٹیکل ایجنٹ مقدمہ کی سماعت کرتا ہے۔

شادی کے موقعہ پر خوب جشن منایا جاتا ہے جس میں تمام لوگ شرکت کرتے ہیں۔ راجہ بھی شرکت کرتے ہیں اور انہیں ہل اور دوسرے زرعی آلات تحفے میں دیتے ہیں۔ یہ آلات ایسی سرزمین میں بڑے قیمتی سمجھے جاتے ہیں جہاں ہر چیز زمین اور محنت سے پیدا کی جاتی ہے۔

پنیال پاکستان کی ہمالیائی ریاستوں میں امیر ترین سمجھا جاتا ہے۔ یہاں سے ہنزہ، گوپیز اور دوسرے خشک پہاڑی علاقوں کو گندم بھیجی جاتی ہے۔ بیشتر زمین حکمران اور اس کے رشتہ داروں کی ملکیت ہے۔ باقی لوگ خود مختار تاجر، درزی اور بڑھئی ہیں۔ مزارعوں اور راجہ کے ذاتی ملازموں کو کام کے عوض اجناس کپڑا، طبی امداد اور دوسری چیزوں کے علاوہ مناسب خرچ بھی ملتا ہے پنیال میں کوئی غریب نہیں ہے اور ہر شخص اپنے سماجی رتبہ کے مطابق رہتا ہے۔ لیکن پولو کھیلتے وقت سب برابر ہوتے ہیں۔

پولو پنیال کا قومی کھیل ہے ہر روز شام چار بجے نماز کے بعد تمام کام بند ہو جاتا ہے۔ لوگ بینڈ پر تاتاری دھنیں بجاتے ہیں اور بین اور اسکاٹ لینڈ کی موسیقی کے ساتھ کھیل شروع ہوتا ہے۔ آقا اور خادم شانہ بشانہ نہایت مہارت اور چابکدستی سے کھیلتے ہیں۔ گذشتہ پچیس سال سے کوئی بھی

پنیال کے لوگوں کو شکست نہیں دے سکا۔ گلگت اور بلتستان کے علاقے میں انہوں نے چاندی کے تمام کپ جیتے ہیں۔ ان لوگوں کو ہلکی پھلکی قمیض اور برجس میں دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ ان میں سے بیشتر باورچی، خادم اور دوسرے لوگ ہیں جو کھانے کے وقت آپ کی خدمت کر رہے تھے۔ پولو کھیلتے وقت ہر طرح مساوات ہوتی ہے اور پنشن پانے والے ملازم بھی جوانوں کے ساتھ کھیل میں شریک ہوتے ہیں۔ مہمانوں کو بھی کھیل میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ ایشیا میں پولو سب سے پہلے سولھویں صدی میں مغل بادشاہوں نے شروع کیا۔ یہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے اور برطانوی دور میں بھی کھیلا جاتا رہا ہے۔ پنیال میں آج بھی پولو تفریح کا بہترین مشغلہ ہے۔ گھڑ سواری بھی بے حد مقبول ہے اور چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیاں بھی گھڑ سواری کے ماہر ہیں۔

پنیال کی زندگی سادہ اور پُر اطمینان ہے اور دریا اور زرخیز زمین وسیلۂ روزگار ہیں۔ دس ہزار فٹ کی بلندی پر یہاں کی آب و ہوا صحت بخش ہے۔ زندگی ایک ہی ڈگر پر چلتی ہے۔ کسان مشینوں کی مدد کے بغیر کاشتکاری کرتے ہیں اور لوگ پیدل یا گھوڑوں پر سفر کرتے ہیں۔ یہاں ابھی سینما گھر تعمیر نہیں ہوئے۔ خوبانیاں بکثرت پیدا ہوتی ہیں اور کھانے کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ ہر طرف باغات پھیلے ہوئے ہیں۔ گندم کے کھیتوں میں رنگ برنگ پھول اُگے ہوتے ہیں۔ اس بات پر مجھے اس وقت یقین آیا جب میں نے خود گندم کے خوشوں کے درمیان سے پھولوں کے گچھے توڑے۔ پنیال کے بچے سرخ و سفید اور بے حد خوبصورت ہوتے ہیں۔ سکول سے آنے کے بعد وہ کھیتوں میں بڑوں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ بڑے ہونے پر وہ کوئی ہنر سیکھ لیتے ہیں اور بہت عمدہ کاریگر بن جاتے ہیں۔ پنیال کے تمام مرد، خواہ وہ چار سال کے ہوں یا چورانوے سال کے۔ گول گول ٹوپیاں پہنتے ہیں اور ان میں ماتھے کے اوپر تازہ پھولوں کا گچھا اٹکا لیتے ہیں۔ یہ بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے، جولائی میں کٹائی کے وقت بہت بڑی دعوت ہوتی ہے اور مرد ایک خاص رقص کرتے ہیں۔ نومبر مویشی خریدنے کا مہینہ ہے۔ سرسبز چراگاہیں بے حد ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ مویشی گاؤں میں لائے جاتے ہیں۔ جہاں کسان اپنی اپنی پسند کے جانور خریدتے ہیں۔ اس کے بعد ایک اور دعوت منعقد ہوتی ہے۔ بیشتر تقریباتِ پنیال کی زراعتی زندگی کے گرد گھومتی ہیں۔ پنیال کے لوگ اپنے گھر رہنا پسند کرتے ہیں۔ گلگت میں ہنزہ اور دوسری ریاستوں کے ڈرائیور، قلی اور کلرک مل جائیں گے لیکن ان میں پنیال کے باشندے نہیں ہوں گے۔ زمینیں زرخیز ہونے

کی وجہ سے کہیں اور کام نہیں کرتے انہیں اپنی زمین سے عشق ہے۔

علاقے کی ترقی کے لیے راجہ جان عالم نے تندرد دریا پر ایک فولادی پل کی تعمیر شروع کرا دی ہے دریا کے کنارے پایا جانے والا پتھر پشتوں کی تعمیر میں استعمال ہو رہا ہے جو فولادی سلاخوں کو سہارا دیں گے۔ تاریخ میں پہلی بار پنیال ایک مستقل پل پر فخر کر سکے گا جس پر سے جیپیں آسانی سے گزر سکیں گی۔ گاڑیاں رکھنے کے لیے پہاڑ کے ایک طرف گیراج تعمیر ہو چکے ہیں۔

راجہ لوگوں کی صحبت پسند کرتے ہیں اور حال ہی میں انہوں نے اپنے مہمان خانے کو کاروباری ادارے میں تبدیل کر دیا ہے۔ کھانے کی تمام چیزیں راجہ کی اپنی زمینوں پر پیدا ہوتی ہیں اور گوشت ان کے ذاتی مویشیوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس لیے وہ نہایت کم خرچ پر بہت سی چیزیں مہیا کر سکتے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا ایک آدمی کے لیے پچیس روپے یومیہ کرایہ بہت زیادہ ہوگا جبکہ سات سال سے کم عمر کے بچے مفت ٹھہر سکیں گے اور چودہ سال تک کے لڑکوں کا آدھا کرایہ ہوگا۔

انہوں نے کہا ”میرے مہمانوں کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ انہیں بہترین کھانا ملے گا اور کرایہ میں کپڑوں کی دھلائی اور گھڑ سواری بھی شامل ہوگی۔ میں خود اپنے مہمانوں کے ساتھ گھنے جنگلوں میں جایا کروں گا جہاں چیتے گھومتے پھرتے ہیں ہمارے دریا مچھلیوں سے بھرے ہوئے ہیں اور تیراکی کا لطف ہر شخص اٹھا سکتا ہے۔ پیدل چلنے والوں کے لیے عمدہ راستے ہیں۔ لڑکوں کے لیے ہمارے پاس ٹٹو ہیں اور پانی میں کھیلنے کے لیے اتھلی ندیاں۔ چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے بے شمار آیائیں ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے...... کیا پچیس روپے بہت زیادہ ہیں؟“ میں نے کہا میرے خیال میں تو یہ نہایت مناسب ہے۔ پھر میں نے ایک گھنٹہ راجہ کے ساتھ نیا بنگلہ دیکھنے میں گزارا جو سرسبز ڈھلوان پر تعمیر ہو رہا تھا۔ بڑھئی اور معمار کام کرتے ہوئے گانا گا رہے تھے۔ ہر چوٹ کے ساتھ ان کی ٹوپیوں میں لگے ہوئے پھول اوپر نیچے ہلتے تھے۔

چاروں طرف سے عظیم ہمالیہ سے گھرے ہوئے اس علاقہ میں ایک عجب ملکوتی احساس ہوتا ہے جو پنیال کا خاصہ ہے۔ لوگوں میں ایک طرح کی سنجیدگی ہے جو آنے والوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔ خمدار راستوں پر لوٹتے ہوئے ہم نے گھنٹیوں کی آواز سنی اور پھر گھوڑوں کا ایک قافلہ ہمارے سامنے آ گیا۔ گلاب کی بھینی بھینی خوشبو، چنار کی مخصوص بو اور لکڑی کے دھوئیں میں مدغم ہو رہی

تھی۔ میرے خیال میں دنیا بھر میں پُرسکون اور ساتھ ساتھ پُرلطف چھٹیاں گزارنے کے لیے پنیال ایک غیر معمولی مقام ہے۔

جب میں دوسری بار پنیال گئی تو ترقی کے لیے راجہ جان عالم کا ایک خواب پورا ہو چکا تھا جو آس پاس کے علاقہ میں بیسویں صدی کی واحد علامت ہے۔ ان کی ذاتی نگرانی میں دریا کے اوپر فولادی پل تعمیر ہو چکا ہے۔ پل کو سہارا دینے والے ستون فتح مندی کا نشان ہیں اور ماحول کا حصہ لگتے ہیں۔ یہ ستون ٹھوس پتھر کے بنے ہوئے ہیں جو پنیال کے پہاڑوں سے نکالا گیا ہے آپ کی جیپ نہایت تیزی سے پُرخطر راستہ طے کرتی ہوئی منٹوں میں راجہ کے محل کے دروازے پر جا پہنچتی ہے۔ گو بہت سے سیاحوں کو یہ کہتے سنا گیا ہے "مجھے لکڑی کے بیڑے اور رسیوں کے پل کی کمی محسوس ہوتی ہے۔"

گوپیز ازلی سرزمین

گوپیز! "آپ نے کبھی اس کے بارے میں سُنا ہے؟" ہمالیہ میں بلندی پر واقع ایک عجیب وغریب پہاڑی ریاست کوہِ غزار کا صدر مقام گوپیز یوں لگتا ہے گویا یہ بھی پھولوں اور درختوں کے ساتھ پیدا ہوا ہو۔

یہاں دس ہزار صحت مند لوگ رہتے ہیں اور گزشتہ بارہ مہینے میں یہاں کوئی نہیں مرا لہٰذا آپ اسے "ازلی سرزمین" کہہ سکتے ہیں۔ مقامی ڈاکٹر جو کسی بڑے شہر سے آیا ہے، بے کار بیٹھا مکھیاں مار رہا ہے۔ وہ روزانہ صبح اپنا کلینک کھولتا ہے لیکن ہفتے ہو گئے اس کے پاس کوئی مریض نہیں آیا۔ پہاڑ کی ہوا اتنی صحت بخش ہے کہ لوگ ہمیشہ تندرست رہتے ہیں اور بالکل اپنے آباؤ اجداد کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔ جب میں ڈاکٹر کے پاس پہنچی تو وہ خوش ہو گیا۔ میری انگلی زخمی تھی اور گلے میں خراش پیدا ہو گئی تھی، لیکن میں اس کے اندازے۔ ، کہیں پہلے ٹھیک ہو گئی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ پہلے کسی نے اتنی ہمدردی اور خلوص سے میرا علاج کیا و۔ اس نے مشفق ماں کی طرح میری خبر گیری کی۔ یہی گوپیز کا دستور ہے۔

یہاں امیر اور غریب کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہر شخص کے پاس اپنی زمین ہے جہاں وہ اجناس کی کاشت کرتا ہے اور اپنی بھیڑ بکریاں اور گائیں چراتا ہے۔ باغات انگور، خوبانی سیب، ناشپاتی، آم اور سردے سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان کی کھانے پینے کی ضروریات پیداوار کے مقابلے میں بہت کم ہیں جو بچ جاتا ہے آس پاس کے دیہاتوں میں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ ابھی جام بنا کر پھلوں کو محفوظ کرنے کے طریقہ سے آشنا نہیں گو انگور کی شراب بڑی مقدار میں کشید کی جاتی ہے۔

میں نے انہیں بتانے کی کوشش کی کہ فالتو پیداوار سے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے لیکن انہوں نے بس سر ہلا دیا۔ پھر میں نے سیبوں اور خوبانیوں سے ایک چیز تیار کی، اس پر نیبو کا عرق چھڑکا اور بیل سے تازہ توڑے ہوئے ہرے ہرے انگور ڈال دیئے۔ یہ لذیذ چیز تھی۔ ڈاکٹر اور اس کی بیوی نے اس کی بہت تعریف کی اور تھوڑی سی اپنے بچے کو بھی کھلائی۔ وہ اور مانگتا رہا کیونکہ یہ بچے کے کھانے سے مشابہ اور اشتہا بڑھانے والی چیز تھی۔ لیکن گوپیز کے لوگوں کو یہ چنداں نہ بھائی۔ "کتنی عجیب بات ہے" انہوں نے کہا "بھلا کبھی سیبوں کو بھی اُبالتے سُنا ہے؟ ہم تو پھل ہمیشہ قدرتی حالت میں کھاتے ہیں" انہوں نے اُسے چکھا تک نہیں۔

سیاحوں کے آنے پر بڑی خوشی منائی جاتی ہے۔ تمام لوگ اپنا کام چھوڑ چھاڑ کر اُن کے گرد خوش آمدید کہنے جمع ہو جاتے ہیں گوپیز کے چھوٹے سے خوبصورت بازار میں سیر کرتے ہوئے جہاں ایک نیچی سی پہاڑی پر آگے سے کھلی دکانیں بنی ہوئی ہیں، بہت سے لوگ خریدار کی تعریف اور ہمت افزائی کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اگر قیمت زیادہ معلوم ہو تو دکاندار کا مذاق اڑاتے ہیں اور اگر وہ سمجھتا ہے کہ زیادہ پیسے ہتھیانے میں کامیاب ہو جائے گا تو پھر خدا ہی اس کا مالک ہے۔ اس کے برعکس اگر سیاح کوئی ایسی چیز خریدنا چاہے جو فروخت کے لیے نہیں اور دکاندار کی ذاتی ملکیت ہے تو پھر جلدی سے تین چار لوگ سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور وہ چیز دم بخود خریدار کو تحفتہً پیش کر دی جاتی ہے۔ یہی گوپیز کا دستور ہے۔

عوام راجہ حسین علی خاں کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں جو یہاں کے گورنر اور کوہِ غزار کے حکمران ہیں۔ راجہ حسین علی خوبصورت خدوخال کے مالک، بارعب اور سکندرِ اعظم کے سپاہیوں کے اصل جانشینوں میں سے ہیں۔ تنومند اور یونانی نقوش والے گوپیز کے لوگ بھی اسی نسل سے ہیں۔ وہ اپنے تمام مسائل لے کر راجہ کے پاس آتے ہیں اور نزدیک آ کر عقیدت سے ان کے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہیں۔ ایک روز وہ مجھے اپنا محل دکھا رہے تھے کہ ایک بوڑھی عورت روتی دھوتی آئی۔ اس کے لڑکے نے اپنے بھائی کے نام منی آرڈر بھیجا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ماں عزیزوں سے ملنے دُور گئی ہوئی ہے۔ اس کا بھائی اس اثنا میں چلا گیا تھا اور ماں واپس آ گئی تھی۔ پوسٹ ماسٹر نے عورت کو منی آرڈر دینے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ یہ خلاف قانون تھا۔ چنانچہ وہ اپنی التجا لے کر راجہ کے پاس چلی آئی۔ وہ قانون کی خلاف ورزی کی اجازت تو نہیں دے سکتے تھے لیکن انہوں نے

سسکیاں بھرتی بڑھیا کو کافی رقم قرض کے طور پر دے دی کہ وہ منی آرڈر ملنے تک اپنا کام چلا سکے! بڑے شہروں میں بھلا کون گورنر سے قرض مانگ سکتا ہے یا اس طرح کی بپتا سُنا سکتا ہے؟ یہی گوپیز کا دستور ہے۔

ہمالیائی علاقوں کے گورنر بالکل الگ نسل سے ہیں۔ یہ لوگ بادشاہوں اور شہزادوں کی پشتوں میں سے ہیں۔ ان کا خون بالکل خالص ہے کیونکہ یہ ہمیشہ انتہائی قریبی رشتہ داروں میں شادیاں کرتے ہیں جن سے ان کے آباؤ اجداد کا حسب نسب ملتا ہو۔ راجہ حسین علی کسی انگریز بادشاہ کی شبیہ لگتے ہیں اور ان کی نیلی آنکھوں میں ایک مستقل چمک ہے۔ وہ شاہانہ وقار سے ٹیکساس کے گڈریوں (Cowboy) کی طرح گھڑ سواری کرتے ہیں۔ ان کی دو بیویاں ہیں۔ لڑکے دُور شہروں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ لڑکیاں گھر پر رہتی ہیں اور خاندان کی بڑی بوڑھیوں سے سگھڑ بیوی بننے کی تعلیم لیتی ہیں ایسے علاقہ میں جہاں عورتوں کے کام کرنے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا یہ تعلیم دوسری پڑھائی کی نسبت زیادہ ضروری ہے۔ شادیوں میں تمام لوگ شرکت کرتے ہیں۔ دولہا کا انتخاب والدین ہی کرتے ہیں۔ شادی شدہ جوڑے ہمیشہ خوش و خرم رہتے ہیں۔ بھرپور زندگی اور صحت بخش ہوا طمانیت پیدا کرتی ہے کھیتوں پر جانے کے لیے سویرے اُٹھنے کا معمول لازمی ہے۔ گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ مصروف رہتی ہے اور گھر سنبھالتی ہے جس کی وہ مالکہ ہے۔ یہ سادہ زندگی سالہا سال سے یکساں چلی آ رہی ہے۔ کوہ غزار کے لوگ سچے مسلمان ہیں قرآن پاک کے احکامات کی تعمیل کرتے ہیں...... اور مسجد میں پنج وقتہ نماز ادا کرتے ہیں۔

یہ علاقہ گلگت ایجنسی کا حصہ ہے اور دشوار گزار پہاڑی راستے کے ذریعہ گلگت سے ملا ہوا ہے۔ اڑسٹھ میل کا یہ سفر جیپ، خچر یا گھوڑے پر طے کیا جا سکتا ہے۔ سارا راستہ بے حد خوبصورت اور دلکش ہے۔

گوپیز میں ریڈیو ٹیلیفون کے ذریعے (جو یہاں بیسویں صدی کی سہولتوں کی واحد نشانی ہے) راجہ آس پاس کی ریاستوں سے رابطہ قائم رکھتے ہیں۔ سال میں کئی بار راجہ حسین علی کوہِ غزار کے تمام دیہاتوں کا دورہ کرتے ہیں اور عوام سے مل کر ان کی مشکلات دُور کرتے ہیں۔ راجہ ایک زیرک اور ہمدرد ثالث کی طرح حکومت کرتے ہیں۔ گوپیز میں راجہ کے دن کی ابتدا کونسل (جسے عوام منتخب کرتے ہیں) کے اجلاس سے ہوتی ہے جس میں مختلف مسائل پر بحث کی جاتی ہے اور ان

پرفوری توجہ دی جاتی ہے۔کوہِ غزار کی واحد جیل گوپیز میں ہے۔اس میں صرف تین قیدیوں کی جگہ ہےاور یہ ہمیشہ خالی پڑی رہتی ہے کیونکہ یہاں جرائم کا نام ونشان تک نہیں اگر کوئی شخص اپنے پڑوسی کی زمین ہتھیا کر استعمال میں لے آیا ہے تو یہ چوری ہے۔اس کی سزا جیل خانہ نہیں، اسے زمین معہ سود کے واپس کرنی پڑتی ہے۔راجہ کی بیوی (جنہیں رانی کہا جاتا ہے) عورتوں سے ملتی ہیں اور ان کی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔اگر کسی کا خاوند مر جائے تو پڑوسی یا راجہ کی کونسل تمام ذمہ داریاں سنبھال لیتی ہے اور ہر چیز کا انتظام کرتی ہے۔یہاں لاوارث خاندان نہیں ہیں آگ لگنے کی صورت میں اڑوس پڑوس کے لوگ پہاڑوں سے پتھر ڈھولاتے ہیں اور نیا گھر تعمیر کر دیتے ہیں۔

گوپیز کی مقامی زبان شینا ہے لیکن ایک تہائی کے قریب لوگ گزارے کے لائق انگریزی بول لیتے ہیں۔سکولوں میں چوتھی کلاس سے انگریزی پڑھائی جاتی ہے دوسرے مضامین اردو میں ہوتے ہیں۔اس دور دراز علاقے میں مخلوط تعلیم حیران کن چیز ہے۔گو بہت سی عورتیں پردہ کرتی ہیں لیکن لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔گوپیز کے بچے بے حد خوبصورت ہوتے ہیں.....صاف کھلتا ہوا رنگ، سُبک جسم اور چمکدار آنکھیں، وہ بڑے جوش وخروش سے اپنی معلومات کا اظہار کرتے ہیں اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ پا کر فخر محسوس کرتے ہیں۔سکول ایک پہاڑی پر واقع ہے۔دوسری پہاڑی پر (گوپیز میں بے شمار پہاڑیاں ہیں) پھولوں کے درمیان گھرا ہوا ڈاکخانہ اور تار گھر ہے۔یہاں ڈاک ریل اور جیپوں کے ذریعہ آتی ہے، نہ ہوائی جہاز ڈاک کے تھیلے گراتے ہیں۔زندگی بہت پیچھے لوٹ گئی ہے۔ہرکارہ آٹھ میل کا فاصلہ نہایت تیزی سے طے کرتا ہے اور پھر رُک کر مہر بند تھیلے دوسرے ہرکارہ کے حوالے کر دیتا ہے۔یہ ہرکارہ پھر آٹھ میل چلتا ہے اور یہ سلسلہ گلگت آنے تک جاری رہتا ہے۔یہاں پہنچ کر پھر جدید ذرائع استعمال ہوتے ہیں اور جہاز کے ذریعے ڈاک مختلف مقامات کو بھیجی جاتی ہے۔

گوپیز میں جوتے خریدنا اچھا خاصا ہمت کا کام ہے۔جوتے موٹے چمڑے کے بنائے جاتے ہیں اور انہیں بانس کی پتلی پتلی تیلیوں سے سجایا جاتا ہے۔ہوا سے چمڑا سخت ہو جاتا ہے اور پہلی بار جوتا پہننا کافی جوکھوں کا کام ہے۔دکاندار کی مدد سے میں نے بھی ایک جوڑا خریدا۔اس کے طور طریقے سنڈریلا کی بہنوں سے ملتے جُلتے تھے۔اس نے جوتے کے پنجہ پر ہلکے سے ہتھوڑی سے چوٹ لگائی تاکہ میرا پاؤں اور پھسل جائے۔اگر جوتا ٹھیک ہے پھر تو چڑھ جائے گا لیکن اگر

سائز مناسب نہیں تو پھر آپ کی چیخ نکل جائے گی۔بہرحال، دکاندار ہمیشہ اتنے بڑے سائز کا انتخاب کرتا ہے کہ تکلیف کا احساس محض خیالی ہوتا ہے۔

جب سیّاح گوپیز آتے ہیں تو راجہ کے گویئے شام ڈھلے ہی وسیع میدان میں جمع ہو جاتے ہیں اور موسیقی سے مہمانوں کا سواگت کرتے ہیں جو بیگ پائپ (Bag Pipe) سے ملتی ہے۔اس کا نام وبانسرا موسیقی ہے اور مقامی بنے ہوئے سازوں پر بجائی جاتی ہے جنہیں ستار کہتے ہیں۔یہ ساز منڈولن سے ملتا جلتا ہے۔

گوپیز میں آرام اور تفریح کو بھی یکساں اہمیت حاصل ہے قومی کھیل پولو روزانہ کھیلا جاتا ہے جس میں آقا اور خادم شانہ بشانہ حصہ لیتے ہیں۔

گوپیز میں سرسبز ڈھلانوں کے دامن میں پنڈر جھیل بہتی ہے جو مچھلیوں سے بھری ہوئی ہے۔ان کی رنگت سنہری ہے اور کھانے میں بے حد لذیذ ہیں۔یہاں مچھلی پکڑنے اور کھانے کا لطف آتا ہے۔گھوڑے رسل ورسائل کا اہم ذریعہ ہیں اور لوگ دور دراز علاقوں میں گھوڑوں پر پکنک منانے جاتے ہیں۔

میں راجہ کے ذاتی بنگلہ میں ٹھہری تھی جو گوپیز کے پُل سے صرف پانچ میل دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں واقع ہے گاؤں کا نام آبِ حیات ہے۔ہم گھوڑوں پر نشیبی پہاڑی راستوں کو طے کر کے وہاں پہنچے۔بنگلہ ایک چوٹی پر واقع ہے۔اس میں چار کمرے اور بڑے بڑے آتش دان ہیں اور چاروں طرف پھول کھلے ہوئے ہیں۔پھلوں کے تناور درختوں کا سایہ پھیلا ہوا ہے اور پرشکوہ پہاڑ دلفریب پس منظر پیش کرتے ہیں۔جب شہزادہ صدرالدین خاں اور شاہ ایران کے بھائی یہاں آئے تو وہ اسی بنگلے میں ٹھہرے تھے اور اس کی خوبصورتی سے مسحور ہو گئے تھے۔سچ پوچھئے تو یہ جگہ ازلی دلکشی کی مالک ہے۔

گوپیز میں شکار کی کھلی اجازت ہے اور یہ لوگوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔برف پوش پہاڑوں کے درمیان بلندی پر ابیکس (Ibex) گھومتے پھرتے ہیں جن کی اونی کھال نہایت قیمتی ہوتی ہے۔گوپیز کے لوگ اس سے کپڑا بُنتے ہیں جو بالکل انگورا اُون کی طرح لگتا ہے۔ابیکس بکری سے ملتا جلتا جانور ہے جو موٹا تازہ ہوتا ہے۔یہ ٹھنڈے علاقوں میں رہتا ہے اور کبھی میدان میں نہیں اترتا۔اکثر برفانی چیتے بھی مل جاتے ہیں اور انہیں علاقوں میں پکڑے جاتے ہیں۔شکاریوں کو اپنا شکار

ڈھونڈنے کے لیے پہاڑیوں پر چڑھنا پڑتا ہے۔ گوپیز میں چڑھائی کالُطف سارا سال آتا ہے اور گرمیوں میں تیراکی کا حظ بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہاں مارچ سے اکتوبر تک گرمی رہتی ہے۔ اس کے بعد موسم بے حد سرد ہو جاتا ہے اور تمام لوگ ایبکس کے اُون سے بُنے ہوئے لمبے لمبے چغے پہنتے ہیں۔ اس لباس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ فرغل نما ہوتا ہے۔ اس کی آستینیں دو گز لمبی ہوتی ہیں اور نیچے آ کر صرف چار انچ رہ جاتی ہیں۔ بازو بالکل ڈھکے رہتے ہیں اور آستین کا سرا ہتھیلی کے گرد لپیٹ لیا جاتا ہے جس سے بیحد گرمائی ملتی ہے اور انگلیاں بھی آزادانہ حرکت کر سکتی ہیں اس قدیم علاقہ میں یہ بہت بڑی نعمت ہے۔

میں نے یہاں کسی شخص کو اداس یا روتا ہوا بچہ نہیں دیکھا۔ مسرت گوپیز کی فضا میں رچی ہوئی ہے اور ہر شخص اتنا ہنستا ہے کہ یہ کھیل تماشہ کی سرزمین معلوم ہوتی ہے۔ ہماری جدید تہذیب سے بہت دُور، یہ لوگ اپنے آپ کو امیر کبیر سمجھتے ہیں کیونکہ پُرخلوص اسلامی جمہوریہ پاکستان کے زیرِ سایہ، کوہِ غزار کے پہاڑی علاقے میں ان کی زمین تمام ضروریات کو پورا کرتی ہے۔

تاریخی ہنزہ

بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ سلسلہ ہمالیہ میں بلندی پر واقع پہاڑی ریاست ہنزہ جہاں کے لوگ سدا جوان معلوم ہوتے ہیں اور ماحول کسی تصوراتی مملکت کا لگتا ہے، اپنے اہم جغرافیائی وقوع کی وجہ سے آزاد دنیا کے لیے نہایت اہم حیثیت رکھتا ہے۔

پاکستان ہنزہ ریاست کی سرحدوں پر افغانستان، روسی ترکستان اور چینی صوبہ سنکیانگ سے گھرا ہوا ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ برصغیر پاک و ہند پر ہمالیہ کے انہیں حصوں سے حملے ہوتے تھے اس طرح ہنزہ پاس پر برصغیر کے لیے پاکستان کی حیثیت ایک حفاظتی ڈھال کی سی ہے۔

چند سال ادھر کی بات ہے انہیں پہاڑوں میں ایک حکمران محل میں اپنے خاندان کے ساتھ رہتا تھا۔ بلندی پر واقع بستی میں یہ محل بے حد خوبصورت تھا اور ہر کھڑکی سے برف پوش پہاڑ اور برف کے تودے نظر آتے تھے۔ یہاں اس قدر خاموشی تھی کہ محل پہنچنے سے پہلے سیاح سوچتے تھے ''یقیناً یہی وہ جگہ ہے جہاں شہزادی سوئی ہوئی ہے اور کوئی شہزادہ اسے جگانے نہیں آیا۔ یا پھر ساتوں بونوں نے سنو وائٹ کو چھپا دیا ہے کہ وہ تمام تکالیف سے محفوظ رہے۔ ان دشوار گزار پہاڑی راستوں پر کوئی انسان کس طرح آ سکتا ہے؟'' گو محل اور اس کے اردگرد کی ہر چیز افسانوی اور الف لیلیٰ کی کہانیوں کی طرح معلوم ہوتی تھی لیکن یہ اصلیت تھی۔ جب بادشاہ اتنی بلندی پر سخت سردی میں رہتے رہتے اُکتا گیا تو وہ نیچے اُتر آیا اور آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر کریم آباد میں ایک نیا محل تعمیر کرایا اور اس پر جلی حروف میں خوش آمدید لکھوا دیا۔

اصلی استقبال غازیِ ملت جنرل میر محمد جمال خاں کی طرف سے ہوتا ہے جو ہنزہ کے میر ہیں اور اس چھوٹی سی ریاست پر بادشاہ کی طرح حکمرانی کرتے ہیں۔

میر جمال خاں وجیہہ اور تنومند آدمی ہیں۔ وہ ہنزہ میں ہاتھ سے بنے ہوئے کپڑے کے سوٹ پہنتے ہیں جس کا شمار دنیا کی بہترین ٹوئیڈ میں ہوتا ہے۔ میر جمال کا رہن سہن اور طریق کار جدید تہذیب کے عین مطابق ہے۔ دشوار گزار راستوں کے ذریعے جو پہاڑوں کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔ عوام کی آسائش کی تمام چیزیں جیپوں اور خچروں پر یہاں لائی جاتی ہیں۔ میر صاحب ہنزہ میں 'نیشنل جیوگرافک' (National Geographk) کے واحد خریدار ہیں جو مہینے میں ایک بار یہاں جہاز کے راستے آتا ہے وہ اپنے مہمانوں کے لیے بہت سے رسالے اور کتابیں بھی منگاتے ہیں۔ ان کی رہائش گاہ ایک شاندار قلعہ کی طرح ہے اور بیش قیمت فرنیچر سے آراستہ ہے۔ ان کی مہمان نوازی اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ تمام آنے والے لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ شاہی مہمان ہیں۔ وہ موسیقی اور رقص سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور بانسری، ڈھول اور ستار پر مشتمل بینڈ دھنیں اڑاتا رہتا ہے۔

ہنزہ گلگت ایجنسی کا حصہ ہے اور اس پر پاکستان کا پرچم لہراتا رہتا ہے۔ ہنزہ کی سرحدیں افغانستان، روسی ترکستان اور چینی ترکستان سے ملتی ہیں۔ عہدِ رفتہ میں وسطی ایشیا کا مرکز ہونے کی وجہ سے ہنزہ تجارتی شہر کی حیثیت سے مشہور تھا۔ ہمسایہ ملکوں میں لاکھوں روپیہ کی تجارت ہوتی تھی۔ اس کی سرحدوں پر اکثر قافلے لوٹ لیے جاتے تھے اور اسی قسم کی بہت سی مشکلات بے شمار قافلوں کے ساتھ پیش آتی تھیں یہ جنگجو لٹیرے بے حد وفادار تھے اور 1891ء میں جب برطانوی فوجوں نے ہنزہ پر حملہ کیا تو اس سے برسرِ پیکار رہے۔ یہ شمالی تجارتی راستے اب بند ہو گئے ہیں خرید و فروخت اور لوٹ مار ختم ہو گئی ہے اور اب ہنزہ پُر امن مقام ہے جہاں سادہ لوح اور پُر خلوص لوگ رہتے ہیں اور اپنی زرخیز زمین کی کاشت پر بسر اوقات کرتے ہیں یہاں فالتو پیداوار نہیں ہے اور ضرورت کی دوسری چیزیں مثلاً نمک اور کپڑا وغیرہ گلگت کے راستے لایا جاتا ہے۔ تیز رو دریاؤں سے کافی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے لیکن ابھی تک پانی کو صرف ایک قدیم طرز کے آٹے کی مل کے لیے کام میں لایا گیا ہے جو پتھر کے بڑے سے پہیے سے چلتا ہے۔ ہنزہ کے لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں اور گندم، جو اور خوبانیوں کی کاشت کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا ایک اور پیشہ تیز رندیوں سے سونا

تلاش کرنا ہے جو کافی سُود مند ثابت ہوا ہے۔ سونا ڈھونڈنے والے لوگ گلگت اور آس پاس کی چھوٹی ریاستوں سے آتے ہیں۔

ہنزہ کی عورتیں ٹوپیوں اور کپڑے پر بڑی خوبصورت کشیدہ کاری کرتی ہیں۔ یہ چیزیں اتنی دلکش ہوتی ہیں کہ سیاح اور باہر سے آنے والے تاجر انہیں خریدنا چاہتے ہیں لیکن وہ صرف اپنے ذاتی استعمال کے لیے سلائی کرتی ہیں۔

ہنزہ کی معیشت میں خوبانیاں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ سارا علاقہ جو تقریباً نو ہزار فٹ ہے، دریائے ہنزہ، گلگت، شیوک اور سندھ کی نہروں سے سیراب ہوتا ہے۔ خوبانی ہنزہ کی اہم فصل ہے اور آلو کے لاتعداد کھیتوں کی طرح کثیر مقدار میں بوئی جاتی ہے۔ دوسرے پھلوں میں سیب، ناشپاتی، آڑو، شہتوت اور بیر بکثرت ہوتے ہیں۔ پھولوں سے بھرے باغ سنگلاخ پہاڑوں کے پس منظر میں بڑا دلفریب نظارہ پیش کرتے ہیں۔ گرمیوں میں درختوں سے تازہ خوبانیاں اتار کر کھائی جاتی ہیں۔ سردیوں میں خشک کر کے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی گٹھلی کی گری بادام کا لطف دیتی ہے۔ اس کو پیس کر کیک یا روٹی بنائی جاتی ہے جو بے حد لذیذ ہوتی ہے۔ خوبانی کی گری سے تیل بھی نکالا جاتا ہے جس کے استعمال سے لوگوں کی صحت پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے وہ اپنی عمروں سے بہت کم معلوم ہوتے ہیں۔ گھنی داڑھیوں اور مضبوط ہاتھوں والے نوے سالہ بوڑھے محض پینسٹھ سال کے دکھائی پڑتے ہیں۔ سادہ زندگی، سادہ خوراک، پھلوں کے قدرتی وٹامن اور تازہ خنک ہوا انہیں بہار کے پھولوں کی طرح سدا جوان رکھتے ہیں۔

ہر سال جنوری میں ہنزہ کے لوگ فصل بونے کا تہوار مناتے ہیں اور بیجوں کے ساتھ سونے کی گرد ملائی جاتی ہے۔ ساتھ ساتھ لوگ اچھے موسم کے لیے دعائیں مانگتے ہیں۔ اگر سال کے شروع میں آسمان ملگجا ہو تو قحط سالی کا خطرہ ہوتا ہے۔ مطلع صاف اور آسمان نیلگوں ہو تو سمجھا جاتا ہے کہ دھوپ نکلے گی۔ پگھلتی ہوئی برف اور تیز رندیاں پہاڑیوں سے بہہ کر نیچے وادی میں پہنچتی ہیں اور خوبانیوں کے باغات اور کھیتوں کو سیراب کرنے والی نہروں کی آواز بڑی بھلی معلوم ہوتی ہے۔

ہنزہ کے لوگ بڑے پُر خلوص اور دوست نواز ہیں۔ گاؤں میں پھرتے ہوئے خلوص کی گرمی، مسرت اور گہری دلچسپی کا احساس ہوتا ہے۔ لوگ سیاحوں کا پیچھا کرتے ہیں اور اپنا کھیل چھوڑ چھاڑ کر ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ پھر دوستانہ باتیں شروع ہو جاتی ہیں "آپ کہاں سے

آئے ہیں؟ کیا ہم آپ کو پسند ہیں؟ آپ ہمارے ساتھ سیر کریں گے؟ آپ ہمارے ساتھ پولو کے میدان چلیں گے؟''

دوسروں کو خوش کرنے کا یہ جذبہ دیکھ کر آپ کا دل چاہتا ہے کہ انہیں اٹھا کر سینے سے چمٹا لیں۔ لوگوں کی خونخوار فطرت کے بارے میں تمام باتیں جھوٹی ہیں۔ ہنزہ کے لوگ پٹھانوں سے مختلف ہیں کیونکہ یہاں کی زمین زیادہ زرخیز ہے اور کاشت کاری آسان ہے۔

یہ لوگ مضبوط، توانا اور خوبصورت ہیں۔ جرائم کا نام ونشان تک نہیں۔ ہنزہ میں پولیس نہیں ہے۔ تمام تنازعوں کا فیصلہ میر کرتے ہیں۔ جرم کی پاداش میں مجرم کو پہاڑوں میں ایک دوردراز جگہ شمشال بھیج دیا جاتا ہے۔ اس تنہائی کا تصور ہی فاسد ارادوں کو دور کر دیتا ہے اور خاندان سے بچھڑنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ ہنزہ والوں کی قابلِ فخر روایات پر عزتِ نفس کی چھاپ ہے۔ اگر کسی کے نام پر ذرا بھی حرف آئے تو وہ فوراً بدلہ لے لیتا ہے۔ لہٰذا زنا کاری کا یہاں نام ونشان نہیں اور اگر کبھی اس کا ارتکاب ہو تو بڑی سخت سزا ملتی ہے۔

ہنزہ کے لوگ بڑے پُرخلوص ہیں۔ اگر کوئی عورت بیوہ ہو جائے تو تمام پڑوسی بچوں کی پرورش میں مدد کرتے ہیں۔ اس کی زمین کی نگہداشت ہوتی ہے اور ہر سال بہار میں نئی فصل کی کاشت ہوتی ہے۔ پھر فصل کاٹ کر جمع کی جاتی ہے۔ اس طرح ہر معاملہ میں اس عورت کی مدد کی جاتی ہے۔

ہنزہ کا حکمران خاندان چھ سو سال سے زیادہ پرانا ہے۔ پرانے زمانے کے حکمران وادی میں اہم مقامات پر پتھر کے بنے ہوئے قلعوں میں رہتے تھے جو ایشیائی قبائل کے حملے کی صورت میں حفاظت کا کام بھی دیتے تھے۔ قلعے کے دروازہ کے اوپر پتھر جمع کر دیئے جاتے تھے اور حملہ آوروں پر گرائے جاتے تھے۔ ہنزہ کے لوگ اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اور آغا خاں کے پیرو ہیں۔

ہنزہ میں جگہ جگہ ترقی کے نشانات ملتے ہیں۔ حکومت پاکستان نئے سکول تعمیر کرا رہی ہے تاکہ تمام بچوں کو تعلیم کے مساوی مواقع مل سکیں۔ حال ہی میں گلمٹ سے ہنزہ تک بیس میل لمبی شاہراہ مکمل ہوئی ہے جس کے ذریعے جیپ پر ہنزہ سے گلگت براہ راست جا سکتے ہیں۔ اس کا افتتاح صدرِ پاکستان نے کیا تھا۔

سالوں پہلے یہ راستہ اور بھی کٹھن تھا کیونکہ ہمسایہ ریاست نگر ہنزہ کی جانی دشمن تھی۔ تقریباً بیس سال گزرے ہنزہ کے میر نے نگر کے شاہی خاندان میں شادی کی اور اس طرح اس تنازعہ کو ختم کر کے جو صدیوں سے چلا آ رہا تھا دو خاندانوں کو شیر وشکر کر دیا اس کے بعد سے نگر میں سے گزرنے کا چھوٹا راستہ مل گیا۔ پہلے سو میل لمبے پہاڑی راستے کا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ سیاحوں کو ہنزہ کی قدیم زندگی کے بارے میں اس وقت علم ہوا جب وہ سلسلہ قراقرم کے دشوار اور کٹھن راستوں سے گزر کر یہاں پہنچے۔ برف کے تودوں سے ڈھکے ہوئے یہاں کے بے شمار تنگ راستے ہیں۔ شکاری اور گائیڈ اپنے پانی کے تھیلے پگھلنے والی برف سے بھرتے ہیں۔

بلند اور سیدھی پہاڑیوں پر چڑھنا ناممکن معلوم ہوتا ہے لیکن ہنزہ کے قبائلیوں کو دیکھ کر جو اپنی کمر پر بھاری بوجھ لادے فاتح کی طرح سیدھے چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ سیاح کو اپنے اندر پوشیدہ ہمت کا احساس ہوتا ہے اور وہ جوانمردی کا پیکر بن جاتا ہے۔

سطح سمندر سے پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر نظارہ ناقابلِ بیان ہے۔ برف پوش پہاڑوں اور بٹورا گلیشیئر سے گھری ہوئی پہاڑیاں، بلند درخت اور چاروں طرف پھیلے ہوئے پھول دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے گویا ہم کسی نئی دنیا میں آ گئے ہوں۔ یہاں قدرت کی ہر خوبصورتی موجود ہے۔ سرسبز کھیتیاں، رنگارنگ پھول اور وسیع میدان، جو آسمان کو چھوتے معلوم ہوتے ہیں، ایسا منظر پیش کرتے ہیں جو دل ودماغ میں سرائیت کر جاتا ہے۔

دور فاصلے پر ایک چھوٹے سے سفید اور خوبصورت ٹیلے پر چھوٹے چھوٹے مکانوں کے درمیان گھرا ہوا بلتی کا محل نظر آتا ہے جیپوں میں آنے والے سیاح اور قافلے علی آباد اور سرات کو جاتے ہوئے اکثر رات گزارنے کے لیے یہاں ٹھہر جاتے ہیں کیونکہ ہنزہ کے گاؤں دور دور پھیلے ہوئے ہیں۔ پہلی بار آنے والے لوگ بالکل بچوں کی طرح گہری نیند سوتے ہیں خنک اور صحت بخش ہوا تمام تکان دور کر دیتی ہے۔ جب آپ سو کر اٹھتے ہیں تو برف پوش پٹم داس کے نزدیک برف کا ایک اور قالین بچھا نظر آتا ہے۔

شکاری جانوروں کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔ جنگلوں میں ابکس (Ibex) جنگلی بھیڑیں اور چیتے عام ملتے ہیں نیچے اتریں تو برف پگھل کر چھوٹی چھوٹی ندیوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے جن کا پانی پی کر بے حد لطف آتا ہے۔

میر صاحب کے محل پر آمد ایک قابلِ یادگار موقعہ ہوتا ہے ان کی اہلیہ رانی اور لڑکے لڑکیاں سیاحوں کے استقبال کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔ آٹھ بچوں کی پیدائش کے بعد بھی رانی اتنی خوبصورت اور جوان ہے کہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے لیکن اتنی زیادہ بھی نہیں کیونکہ ازلی جوانی تو ہنزہ کی فضا میں رچی بسی ہوئی ہے۔ رانی اپنے عوام کی قابلِ رشک صحت کی علامت ہے۔ بیشتر لوگ صرف سبزیاں کھاتے ہیں۔ ہنزہ کی زرخیز زمین میں پیدا ہونے والا گیہوں وٹامن اور معدنیات سے پُر ہوتا ہے۔ ہنزہ کے لوگوں کی طویل زندگی کا راز ان کی قدرتی خوراک میں مضمر ہے۔ میر صاحب کی سب سے چھوٹی لڑکی شہزادی عذرا سرخ گالوں والی گڑیا سے ملتی جلتی ہے۔ وہ اتنی پھرتیلی ہے کہ پہاڑیاں یوں پھلانگتی ہے گویا رسی کود رہی ہو...... اس کے باوجود وہ مہمانوں کے ساتھ نہایت شاہانہ وقار اور تعظیم سے پیش آتی ہے۔

اس دور دراز علاقے میں میزبان کی مہمان نوازی فقید المثال ہے۔ مغربی لوگوں کی مغربی کھانوں سے تواضع کی جاتی ہے لیکن اگر مقامی کھانوں کی فرمائش کی جائے تو لوگ مسکرا اٹھتے ہیں اور چینی ذائقہ دار کھانے لائے جاتے ہیں جن کا اثر ابھی تک میر صاحب کے گھرانے میں باقی ہے۔ 1935ء تک ہر سال چینی فوجی وفود سنکیانگ سے تحفے تحائف لے کر یہاں آتے تھے۔ محل کی کارنسوں پر خوبصورت گلدان، ٹرے اور بت سجے ہوئے ہیں۔ چینی شوربہ اور دوسرے لذیذ کھانے گرم گرم مہمانوں کو پیش کیے جاتے ہیں۔ خوش ذائقہ کھانے دیکھ کر آپ حیران رہ جاتے ہیں لیکن پاکستان کے اس دور افتادہ مقام پر یہ تمام آسائش پا کر استعجاب اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ محل کی دیواریں پرانے حکمرانوں کی تصویروں سے سجی ہوئی ہوتی ہیں۔ برطانوی حکمرانوں کی تصویریں بھی ہیں۔ خواب گاہوں میں لحاف اور پردے سرخ بیش قیمت کمخواب کے ہیں لیکن میر صاحب کی دلفریب شخصیت ان کی دولت اور ساز و سامان کی حشمت سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔

بلتستان پُرعجائب سکردو

بلتستان کی اونچی پہاڑیوں میں واقع، سکردو سخت گرمیوں میں بھی بیحد ٹھنڈا اور پُر فضا مقام ہے۔ راولپنڈی سے سو میل دور شمال مشرق میں سلسلۂ قراقرم کے وسط میں اپنے مخصوص جغرافیائی وقوع کی وجہ سکردو کا موسم خنک ہے۔ پُر شکوہ برف پوش چوٹیوں کے سائے ساری وادی پر پھیلے رہتے ہیں اور دریا کے کنارے ریتلے جزیرے چڑیوں کے نغماتِ مسرت سے گونجتے رہتے ہیں۔ سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا دریائے سندھ پتھروں پر سفید جھاگ پھینکتا ہے اور ٹھنڈے پانی میں مچھلیاں ادھر ادھر بھاگتی نظر آتی ہیں۔

سکردو کرمس کے درختوں کی سرزمین ہے۔ کسانوں کے سُرخ سفید گول مٹول بچے سڑک کے کنارے کتوں اور میمنوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ سکردو میں بے شمار جھیلیں ہیں۔ بعض تو سارا سال جمی رہتی ہیں اور باقی سنہری دھوپ میں جھلمل جھلمل کرتی رہتی ہیں۔ سکردو ماہرین معدنیات کے لیے بہترین مقام ہے۔ یہاں بے شمار معدنیات، پتھر اور مرمر ملتا ہے۔ سکردو اس قدر سحر انگیز اور خوبصورت ہے کہ اس خاموش اور پرسکون علاقہ میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کی خوبیوں کا چرچا نہیں ہوتا کیونکہ سیاحوں کی کتابوں میں سکردو کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ بلند پہاڑوں سے محیط اس کے گاؤں کی سیر انوکھا لطف دیتی ہے۔ سارے بلتستان میں جدید سہولتوں سے آراستہ خوبصورت ریسٹ ہاؤس بنائے گئے ہیں۔

وزارت امورِ کشمیر سے اجازت نامہ حال کرنے کے بعد راولپنڈی سے سکردو کا ہوائی سفر شروع ہوتا ہے۔ پی آئی اے کے جہاز میں اندازہ ہوتا ہے کہ اس پُر کٹھن سفر پر مسافروں اور جہاز

کے عملہ کو کس قدر باہمت ہونا پڑتا ہے۔ گلگت کے برعکس سکردو کا سفر زیادہ پُرخطر ہے۔ بلند، سنگلاخ پہاڑی سلسلہ پر اڑتے ہوئے یہ سوچ کر حیرانی ہوتی ہے کہ پی آئی اے کے پائلٹ آخر کس خمیر سے اٹھے ہیں۔ وہ مطمئن اور پرسکون، چہرے پر آکسیجن کے نقاب چڑھائے مسکراتے ہوئے نہایت ہی مہارت سے خطرناک گزرگاہوں میں جہاز اڑاتے رہتے ہیں۔ چوکنے اور عقاب نظر پائلٹ برف کے تودوں کی بلندی کا اندازہ کرتے ہوئے جہاز کو بلند کرتے چلے جاتے ہیں...... یہ ایک ہوائی قالین ہے جو اس خاموش دنیا میں صاف شفاف برف کی چوٹیوں پر تیر رہا ہے۔ نیچے دھند سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں بڑی بھلی لگتی ہیں لیکن بہت سے مسافروں کے لیے یہ نظارہ کافی ہیبت ناک ہے۔ باہمت لوگوں کے لیے یہ ''جنت'' کا منظر ہے...... چاروں طرف پھیلے ہوئے برف کے گالے...... خوبصورت اور پُرشکوہ نظارہ، نیلگوں بادلوں میں قدرت کی خوبصورتی بکھری ہوئی ہے۔ یہ ایسا منظر ہے جو اپنی عظمت کے ساتھ ساتھ ہیبتناک بھی ہے۔

سکردو کا چھوٹا سا شہر ہوائی اڈہ سے نو میل دور ہے۔ سڑک بیشتر جگہ پہاڑوں کو کاٹ کر بنائی گئی ہے۔ علاقہ کا کچھ حصہ بنجر ہے لیکن باقی حصہ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ زراعت نے اس قدیم پہاڑی علاقہ کو کتنا فائدہ پہنچایا ہے۔ یہاں ایک ایک ایکڑ کے کھیت ہیں۔ جن میں ایک نوجوان زراعتی افسر کی زیرنگرانی اجناس کی کاشت ہوتی ہے وہ سیاحوں کو کھیت دکھا کر خوشی محسوس کرتا ہے اور جن لوگوں کو زراعت سے دلچسپی بھی نہیں وہ بھی بڑی بڑی گوبھیاں، شکرقندیاں اور آلو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ یہ اس زمین کی پیداوار ہے جو پہلے بالکل بنجر تھی۔ افسر کی کامیابی عالمی امدادی ادارہ آئی سی اے (I.C.A) کی مرہون منت ہے جو امریکہ سے پھلوں کے بیج اور پودوں کی قلمیں بھیجتا ہے جو تمام سکردو اور اس کے اردگرد کے علاقوں میں لگائی جاتی ہیں۔

دو سال قبل ایک سابق پولیٹیکل ایجنٹ بنات گل نے جنہیں زراعت سے دلچسپی تھی۔ زراعتی افسر سے تعاون کیا اور اجناس اور پھلوں کے باغات کے گرد پھولوں کی باڑ لگوادی۔ ان کی کوششیں بارآور ہوئی ہیں اور آج بلتستان کے طول وعرض میں تمام کھیتوں کے گرد پھولوں کا جال بچھا ہوا ہے جو آنکھوں کو بے حد بھلا معلوم ہوتا ہے۔ موجودہ پولیٹیکل ایجنٹ نے ترقیاتی کام کو جاری رکھا ہے اور وہ تمام لوگوں کو سبزیوں کے بیج تقسیم کرتے ہیں تاکہ زمین سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کی جاسکے۔ حکومتِ پاکستان کا منتہا سکردو میں خوراک کی پیداوار بڑھانا ہے۔ جہاں اس کی اشد

ضرورت ہے۔ ہوائی جہاز اور قافلوں کے ذریعے بھی اجناس یہاں کم ہی آتی ہیں۔

یہاں آنے والے تمام سیاحوں کو خواہ وہ سرکاری مہمان ہوں یا عام مسافر، پولیٹیکل ایجنٹ تمام چیزیں دکھاتے ہیں اور منصوبوں کی وضاحت کرتے ہیں۔ سیاحوں کا دُور دراز علاقوں میں رہنے والے ترقیاتی افسروں اور مقامی راجاؤں سے بھی تعارف کرایا جاتا ہے تاکہ سکردو آنے والے ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ بلتستان میں کس طرح عظیم وسائل سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ وہ تمام آنے والوں کو اپنے علاقہ کی کامیابیوں سے آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

سکردو کا سکول بے حد خوبصورت ہے۔ یہ طالب علموں کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے کھیل کود اور پڑھائی کے لیے یہاں بے حد جگہ ہے۔ کمرے کشادہ اور ہوادار ہیں۔ لڑکوں کا اپنا بینڈ ہے۔ ذریعہ تعلیم اردو اور انگریزی ہے۔ مقامی بلتی زبان بے حد مشکل ہے۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے ذاتی دلچسپی لے کر رہائشی کمرے بنوائے ہیں تاکہ دور سے آنے والے طالب علموں کو رہنے کی تکلیف نہ ہو۔

تھوڑے فاصلہ پر سکردو کا بڑا ہسپتال ہے جہاں نہایت شفقت اور رحم دلی سے علاج کیا جاتا ہے۔ جب کسی بلتی عورت کے ہاں ہسپتال میں بچہ ہونے والا ہو تو دائی کو معلوم ہوتا ہے کہ ماں کے بغیر ایک سالہ عبدل اداس ہو جائے گا لہٰذا وہ ایک اور چارپائی ماں کے بستر کے ساتھ لگا دیتی ہے۔ ننھا عبدل میدان میں کھیل کر دل بہلاتا ہے اور رات پڑنے پر ماں کے بستر کے ساتھ لگ کر آرام سے سو جاتا ہے۔ یہ ہمدردی ان آسائشوں کا محض ایک پہلو ہے، جو مریضوں کو مہیا کی جاتی ہیں۔

لوگوں کی دلچسپیاں پولو، گھڑسواری اور بہار میں فصل بونے کے گرد گھومتی ہیں۔ مرد تو دک (بانسری) عوتر (بینجو سے مشابہ ساز) اور ڈھولوں کی گت پر روایتی رقص کرتے ہیں۔ موسیقی کی دھن پہاڑی ماحول سے پوری مطابقت رکھتی ہے۔ ہر رقص ان کی طرز زندگی کی علامت ہے۔ جذبات، محبت، غم اور خوشی سب یکے بعد دیگرے پیش کیے جاتے ہیں اور ہر طرف سے واہ واہ بلند ہوتی ہے۔ ایک رقاص جہاز کا روپ دھار کر جدید زندگی کا اظہار کرتا ہے۔ اس کا کردار اتنا عمدہ ہوتا ہے کہ تماشائی آسمان کی طرف دیکھنے لگتے ہیں کہ شاید کوئی جہاز آرہا ہو۔ جب وہ پہاڑی سڑکوں پر جیپ کے چلنے کی آواز پیدا کرتا ہے تو چاروں طرف سے قہقہے پھوٹنے لگتے ہیں۔ وہ گاؤں کے لوگوں کا محبوب اداکار ہے گو وہ بھی عام لوگوں کی طرح کسان ہے۔

بلتی لوگ لمبے تڑنگے توانا اور کھلتی رنگت کے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر مزے مزے

میں چلتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں تیز رفتاری کا نام ونشان نہیں۔ بلتستان کے باہر سے آنے والے مسافروں کا جوش وخروش سے خیر مقدم کیا جاتا ہے اور بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ ہر گاؤں میں ان کی آمد پر درختوں سے پھل توڑ کر چائے کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔ یہاں چائے خانے بے شمار ہیں۔ بچے بڑے مہذب ہیں اور جلدی گھل مل جاتے ہیں۔ اجنبیوں کو دیکھ کر وہ مسکراتے رہتے ہیں اور بعض اوقات بغیر ایک حرف کہے بھاگ جاتے ہیں اور ان کے لیے پھول توڑ کر لے آتے ہیں۔

سکردو کے ہوائی اڈے سے اٹھارہ میل دور کچورا جھیل ہے جس کو بنجر میدانوں اور پہاڑی سڑک سے راستہ جاتا ہے۔ اس ریگستان میں یہ بڑا دلکش منظر ہے۔ برف سے ڈھکے ہوئے چنار کے درخت دھند میں بلند ہوتے چلے گئے ہیں کچورا جھیل دھوپ میں چاندی کی چادر کی طرح چمکتی ہے۔ سیاح اس کو اپنے دورے کی خاص چیزوں میں شمار کرتے ہیں۔

تازہ خنک ہوا میں ایک میل پہاڑی راستہ طے کر کے جھیل پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس کے کنارے پر سُرخ گلاب پھیلے ہوئے ہیں اور مخملیں گھاس چھوٹے چھوٹے زرد پھولوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ پہاڑوں پر چھوٹی چھوٹی ندیاں بہتی ہیں۔ تمام لوگ ہاتھوں کے پیالے بنا کر تازہ پانی پیتے ہیں جو ٹھنڈی شمپین کا مزا دیتا ہے۔

بلتستان میں قدرت کی صناع کاری، پرندوں کے نغمے اور خوبصورت تتلیوں کو اڑتے دیکھ کر انسان دم بخود رہ جاتا ہے۔ یہاں کی فضا خواب آلود ہے اور خاموشی میں دنیا کے تمام مسائل معدوم ہو جاتے ہیں۔ جھیل کی اپنی زندگی ہے۔ اس کی تہہ میں مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں۔ چمکتی دھوپ میں یہ مچھلیاں تیرتی ہوئی قوس قزح کے ٹکڑے معلوم ہوتی ہیں۔ گویا پانی میں جواہرات جگمگا رہے ہیں۔ کناروں پر چھوٹے چھوٹے مینڈک پھدکتے رہتے ہیں۔ عظیم ہمالیہ کے دامن میں کچورا جھیل کے کنارے نخلستان کی خوبصورتی دیکھ کر روحانی مسرت ہوتی ہے۔

سکردو لوٹتے ہوئے راستہ میں انسانی ہاتھ کی بنائی ہوئی ایک عجیب وغریب چیز ہے۔

پولیٹیکل ایجنٹ اپنے دوستوں اور سیاحوں کو یہ عجوبہ دکھانے کے لیے مدعو کرتے ہیں۔ ''پہیے دار گھر'' میں چائے اور دوسری چیزیں پیش کی جاتی ہیں۔

دریائے سندھ کے کنارے یہ پہیے دار گھر سیدھا کھڑا ہے۔ سامنے کے دروازے پر

اورینٹ سکائی لائنز'' کا نام چمک رہا ہے۔ نزدیک سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ ہوائی جہاز کا حصہ ہے۔ جسے خوبصورت بنگلے کے انداز میں رہنے کے لیے دوبارہ بنایا گیا ہے۔

یہ یہاں کیسے پہنچ گیا، یہ آیا کہاں سے ہے؟

کئی سال پہلے اورینٹ ایئر لائنز کا طیارہ سکردو میں گر پڑا۔ اس کے ڈھانچے کو لے جانے پر خرچ کرنے کے بجائے کمپنی نے محض ایک سو پچاس روپے میں اسے ایک ہوشیار پاکستانی بریگیڈیئر کو فروخت کر دیا۔ اس نے اپنے ذاتی استعمال کے لیے جہاز کے ڈھانچے کو ایک آرام دہ مکان میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ مکان تمام جدید سہولتوں سے آراستہ ہے۔ یہاں ایک بار آ کر واپس جانے کو جی نہیں چاہتا۔ اس جگہ ٹھہرنا کون پسند نہیں کرے گا؟ بریگیڈیئر نے اپنے ہاتھوں سے درختوں سے گھری ہوئی ایک جگہ بنائی ہے جہاں مچھلی پکڑی جا سکتی ہے۔ تیراکی کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے اور کشتی رانی بھی کی جا سکتی ہے۔ یہ جگہ بڑی دلفریب اور حیرت انگیز ہے۔ یہاں کوئی مسائل ہی نہیں۔

مہمات بلتستان کے سفر کا لازمی جزو ہیں۔ وادی شگار جانے کے لیے دریائے سندھ میں کشتی کا سفر پہاڑی راستوں میں جیپ کے ذریعے شروع ہوتا ہے۔ دریا کے دہانے پر ایک کشتی کھڑی ہے جو مسافروں کو مفت لاتی لے جاتی ہے۔ کشتی کو ملاح چلاتے ہیں۔ بعض مقامات پر دریائے سندھ بے حد اُتھلا ہے اور کشتی کو موٹے موٹے رسوں کی مدد سے کھینچنا پڑتا ہے۔ ملاح دریا کے خشک حصوں پر چلتے ہیں۔ چند میل آگے مسافروں کو کشتی سے اتر کر چھوٹے چھوٹے رتیلے ٹیلے طے کرنے پڑتے ہیں۔ ماہر معدنیات ان بے شمار پتھروں کو دیکھ کر خوشی سے دیوانہ ہو جائے گا جن میں سنگ مرمر اور دھاتوں کے عناصر شامل ہیں۔ سارا راستہ بالکل بنجر ہے۔ نیلگوں آسمان تلے اس قدیم دنیا کی پہاڑیاں دیوہیکل پہرہ داروں کی طرح کھڑی ہیں۔

پھر اچانک زرخیز گاؤں شگار سامنے آ جاتا ہے۔ پھولوں سے گھرے ہوئے شہہ نشین والے دو منزلہ سہ منزلہ خوبصورت مکان ہوا میں پھڑ پھڑاتے گھر والوں کے دھلے ہوئے کپڑے اور سوتے ہوئے چھوٹے چھوٹے بچے بڑے بھلے لگتے ہیں۔ پتھریلے اور دشوار گزار راستے کے بعد یہ خوبصورت مکانات آ جاتے ہیں۔ ان کے گرد وسیع میدان پھیلے ہوئے ہیں جو قومی کھیل پولو اور دوسرے کھیلوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ شگار، جہاں نوجوان راجہ علی شاہ حکومت کرتے ہیں بڑی خوشگوار جگہ ہے۔ آبادی 23000 تئیس ہزار ہے سکردو کے باشندوں کی طرح یہاں کے لوگ بھی اسماعیلی فرقے

سے تعلق رکھتے ہیں اور آغا خاں کے پیرو ہیں۔ یہ لوگ زراعت پیشہ ہیں اور کھیتی باڑی کر کے گزارہ کرتے ہیں۔ یہ چینی اور منگول نسل سے ہیں۔ جنھوں نے بعد میں اسلام قبول کرلیا تھا۔ ان کے چہروں سے کرداراور قوت ٹپکتی ہے۔گوان کی زندگی بڑی کٹھن اور قدیم طرز کی ہے لیکن یہ ہر لحظے سے لطف اٹھاتے ہیں۔ شگار میں ہر شخص آسودہ حال ہے۔کثیر مقدار میں اجناس کی پیداوار کی وجہ بلتستان کی دوسری وادیوں میں جہاں زمین اتنی زرخیز نہیں شگار سے چیزیں بھیجی جاتی ہیں۔

سارے بلتستان میں دیہی ترقیاتی پروگرام پر عمل ہو رہا ہے۔ خشک اور بنجر زمین کو کاشت کے قابل بنایا گیا ہے۔ لاہور، کراچی اور دوسرے بڑے شہروں سے زرعی ماہر یہاں آنے شروع ہو گئے ہیں اور بلتیوں کو جدید طریقے سکھار ہے ہیں۔

محکمہ زراعت اور جنگلات کے لوگ، طبی افسر اور پولیٹیکل ایجنٹ کے ملازمین ایک بڑے خاندان کی طرح مل جل کر کام کرتے ہیں۔ بڑے شہروں کی نسبت ان لوگوں کو اپنی روایات برقرار رکھنے اور صبر واستقلال کا صلہ کہیں زیادہ ملتا ہے۔ اپنی محنت اور عزم سے یہ ملک کی عزت بڑھاتے ہیں۔ یہ لوگ دوسروں میں بڑی جلد گھل مل جاتے ہیں۔ پردے میں ہونیوالی محفلیں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں اور بڑا اچھا وقت گزرتا ہے مرد اور عورتیں الگ الگ کمروں میں بیٹھتے ہیں۔ عورتیں بڑے جوش وخروش سے اپنے خاوندوں کی باتیں کرتی ہیں۔ برقعہ اوڑھنے سے ان کی روشن دماغی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور عورتیں آپس میں ملکر خوش گپیاں کرتی ہیں۔ یہ محفلیں پولیٹیکل ایجنٹ کے کشادہ مکان میں منعقد ہوتی ہیں۔ سب لوگ بے حد لطف اٹھاتے ہیں اور یہاں مستقبل کی شادیاں بھی طے ہوتی ہیں جس میں ہر شخص کو اپنی بات کہنے کا حق حاصل ہے۔

راولپنڈی کو واپسی کبھی وقت پر نہیں ہوتی سکردو کا ہوائی سفر موسم پر منحصر ہے لہٰذا جہاز عموماً وقت پر نہیں پہنچتے۔ اکثر سیاحوں کو اپنے اندازہ سے زیادہ رکنا پڑتا ہے۔ یہ کوئی پریشان کن بات نہیں بلکہ خوش قسمتی ہے اس دُور دراز، یکساں مختلف اور خاموش دنیا میں ایک دو اور زیادہ دن گزار لینا بڑی خوشی کی بات ہے۔ آپ بڑے خوش خوش ریسٹ ہاؤس واپس آئیں گے۔ اس غیر متوقعہ چھٹی کی خوشی کا موقعہ آپ کو موسم اور خدا نے عطا کیا ہے۔